هٰذا بیان للناس وهدى وموعظة للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد ششم

سورۃ التحریم تا سورۃ الناس

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ التحریم تا سورۃ الناس

جلد ششم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

ابتدا میں خیال تھا کہ تفہیم القرآن پانچ جلدوں میں مکمل ہو جائے گی۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ جلد چہارم کے بعد اگر پوری کتاب پانچویں جلد کی صورت میں شائع کی جائے تو اس کی ضخامت ۱۲ سو صفحات سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس لیے مجبوراً کتابت شدہ مواد کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جلد پنجم سورۂ طلاق پر ختم کی گئی اور یہ جلد سورۂ تحریم سے شروع کرنی پڑی۔ اگر پہلے سے کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہوتا تو پانچویں جلد سورۂ تحریم پر ختم کی جاتی اور یہ جلد صرف آخری دو پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہوتی۔ کتاب کی ترتیب میں یہ خلل ناگزیر وجوہ سے واقع ہوا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ہماری اِس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

ناشر

تفہیم القرآن

التحریم

(٦٦)

التحریم

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ لِمَ تُحَرِّمُ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ اس نام سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جس میں تحریم کے واقعے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس میں تحریم کے جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق احادیث کی رِوایات میں دو خواتین کا ذکر آیا ہے جو اُس وقت حضورؐ کے حَرَم میں تھیں۔ ایک، حضرت صَفِیَّہؓ۔ دوسری، حضرت ماریہ قِبْطِیَّہؓ۔ ان میں سے ایک، یعنی حضرت صَفِیَّہؓ، فتحِ خیبر کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں، اور خَیْبَر کی فتح بالاتفاق ۷ ھ میں ہوئی ہے۔ دوسری خاتون حضرت ماریہؓ کو ۷ ھ میں مصر کے فرماں روا مُقَوْقِس نے حضورؐ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اُن کے بطن سے ذی الحجہ ۸ ھ میں حضورؐ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے یہ بات قریب قریب متعیّن ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کا نُزول ۷ ھ یا ۸ ھ کے دوران میں کسی وقت ہوا ہے۔

موضوع اور مَباحِث یہ ایک بڑی اہم سورت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہَّراتؓ کے متعلق بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند مُہمّاتِ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک یہ کہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے حُدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبیؐ کی طرف بھی اُن کا کوئی حصّہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیتِ نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطعِ نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآنِ مجید میں نازل ہوا ہو، یا وحیِ خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطورِ خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی بھی نہیں ہے، کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرے میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی، جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آ جائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اِقدام بھی منشائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔

ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے، تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اُصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حَسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرّہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشائے الٰہی سے مُطابَقت نہ رکھتی ہو۔

تیسری بات جو مذکورۂ بالا نکتہ سے خود بخود نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ذرا سی بات پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اسے ریکارڈ پر بھی لے آیا گیا، تو یہ چیز قطعی طور پر ہمارے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیتی ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ میں جو اعمال و افعال اور جو احکام و ہِدایات بھی ہمیں اب ملتے ہیں، اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت یا اصلاح ریکارڈ پر موجود نہیں ہے، وہ سراسر برحق ہیں، اللہ کی مرضی سے پوری مُطابَقت رکھتے ہیں، اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی بات جو اس کلام میں ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس رسولِ مقدّس کی عزّت و حُرمت کو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کے حق میں لازمۂ ایمان قرار دیتا ہے، اُسی کے متعلق اِس سورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ اللہ کی حلال کی ہوئی ایک چیز اپنے اُوپر حرام کر لی۔ اور جن ازواجِ مطہّراتؓ کو اللہ تعالیٰ خود تمام اہلِ ایمان کی ماں قرار دیتا ہے اور جن کے احترام کا اس نے خود مسلمانوں کو حکم دیا ہے، انھی کو اس نے بعض غَلَطیوں پر اس سورہ میں شدّت سے تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر نبی پر یہ گرفت اور ازواجِ مطہّراتؓ کو یہ تنبیہ بھی خفیہ طور پر نہیں کی گئی، بلکہ اُس کتاب میں درج کر دی گئی جسے تمام اُمّت کو ہمیشہ ہمیشہ تلاوت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں اِس ذکر کا منشا نہ یہ تھا، نہ یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور امہات المومنینؓ کو اہلِ ایمان کی نگاہوں سے گرا دینا چاہتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآنِ پاک کی یہ سورت پڑھ کر کسی مسلمان کے دل سے ان کا احترام اٹھ نہیں گیا ہے۔ اب قرآن میں یہ ذکر لانے کی مَصلَحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنے بزرگوں کے احترام کی صحیح حدوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ نبی، نبی ہے، خدا نہیں ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہ ہو۔ نبی کا احترام اس بنا پر نہیں ہے کہ اس سے لغزش کا صُدور ناممکن ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مرضیِ الٰہی کا مکمل نمایندہ ہے اور اس کی ادنیٰ سی لغزش کو بھی اللہ نے اصلاح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے، جس سے ہمیں یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ نبی کا چھوڑا ہوا اسوۂ حَسنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمایندگی کر رہا ہے۔ اسی طرح

صحابۂ کرامؓ ہوں یا ازواجِ مطہّراتؓ، یہ سب انسان تھے، فرشتے یا فوق البشر نہ تھے۔ اُن سے غَلطیوں کا صُدور ہو سکتا تھا۔ اُن کو جو مرتبہ بھی حاصل ہوا، اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کی رہنمائی اور اللہ کے رسولؐ کی تربیّت نے ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اُن کا جو کچھ بھی احترام ہے اسی بنا پر ہے، نہ کہ اِس مفروضے پر کہ وہ کچھ ایسی ہستیاں تھیں جو غلطیوں سے بالکل مُبَرّا تھیں۔ اِسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحابہؓ یا ازواجِ مطہراتؓ سے بَشَریت کی بنا پر جب بھی کسی غَلَطی کا صدور ہوا، اُس پر ٹوکا گیا۔ اُن کی بعض غلطیوں کی اصلاح حضورؐ نے کی، جس کا ذکر احادیث میں بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اور بعض غلطیوں کا ذکر قرآنِ مجید میں کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کی اصلاح کی، تاکہ مسلمان کبھی بزرگوں کے احترام کا کوئی ایسا مبالغہ آمیز تصور نہ قائم کر لیں جو انھیں انسانیت کے مقام سے اُٹھا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مقام پر پہنچا دے۔ آپ قرآنِ پاک کا مطالعہ آنکھیں کھول کر کریں تو اِس کی پے در پے مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔

سورۂ آلِ عمران میں جنگِ اُحُد کا ذکر کرتے ہوئے صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اللہ نے (تائید و نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا جب کہ اُس کے اِذن سے تم اُن کو قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی مَحبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم حکم کی نافرمانی کر بیٹھے، تم میں سے کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا طلب گار، تب اللہ نے تمھیں اُن کے مقابلے میں پسپا کر دیا، تاکہ تمھاری آزمایش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں معاف کر دیا، اللہ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔" (آیت ۱۵۲)

سورۂ نور میں حضرت عائشہؓ پر تہمت کا ذکر کرتے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا گیا:

"ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم لوگوں نے اِسے سنا تھا، اُسی وقت مومن مرد اور عورتیں، سب اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو صریح بہتان ہے؟...... اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آ لیتا۔ ذرا غور کرو! جب تمھاری ایک زبان سے دوسری زبان اِس قصّے کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلّق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اِسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اِسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔" (آیات ۱۲ تا ۱۷)

سورۂ اَحزاب میں ازواجِ مطہّراتؓ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

”اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی طلب گار ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“ (آیات ۲۸-۲۹)

سورۂ جمعہ میں صحابہؓ کے متعلق فرمایا:

”جب انھوں نے کاروبارِ تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور (اے نبیؐ!) تم کو (خطبے میں) کھڑا چھوڑ دیا۔ اِن سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے، اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔“ (آیت ۱۱)

سورۂ مُمتَحِنہ میں ایک بدری صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بَلتَعَہ کے اِس فعل پر سخت گرفت کی گئی کہ انھوں نے فتحِ مکہ سے پہلے حضورؐ کے حملے کی خفیہ اِطّلاع کفارِ قریش کو بھیج دی تھی۔

یہ ساری مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں، اُسی قرآن میں جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور ازواجِ مطہّراتؓ کے فضل و شرف کو خود بیان فرمایا ہے اور اُنھیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا ہے۔ بزرگوں کے احترام کی یہی مبنی بر اعتدال تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو انسان پرستی کے اُس ہاویہ میں گرنے سے بچایا جس میں یہود و نصاریٰ گر گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کے موضوعات پر جن اکابر اہلِ سنّت نے کتابیں مُرتّب کی ہیں، ان میں جہاں صحابۂ کرامؓ اور ازواجِ مطہّراتؓ اور دوسرے بزرگوں کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کی کمزوریوں اور لغزشوں اور غلطیوں کے واقعات بیان کرنے میں بھی تامُّل نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آج کے مدعیانِ احترام کی بہ نسبت وہ ان بزرگوں کے زیادہ قدر شناس تھے اور ان سے زیادہ حُدودِ احترام کو جانتے تھے۔

پانچویں بات جو اس سورہ میں کھول کر بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین بالکل بے لاگ ہے۔ اس میں ہر شخص کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے ایمان اور اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اس کے لیے قطعاً نافع نہیں ہے، اور کسی بُری سے بُری ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس معاملے میں خاص طور پر ازواجِ مطہّراتؓ کے سامنے تین قسم کی عورتوں کو بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثال حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی ہے، جو اگر ایمان لاتیں اور اپنے جلیل القدر شوہروں کا ساتھ دیتیں تو ان کا مقام اُمّتِ مُسلمہ میں وہی ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہّراتؓ کا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے اِس کے برعکس رَویّہ اختیار کیا، اس لیے انبیاؑ کی بیویاں ہونا ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ جہنّم کی مستحق ہوئیں۔ دوسری مثال فرعون کی بیوی کی ہے، جو اگرچہ ایک بدترین دشمنِ خدا کی بیوی تھیں، لیکن چونکہ وہ ایمان

لے آئیں اور انھوں نے قومِ فرعون کے عمل سے اپنے عمل کا راستہ الگ کر لیا، اس لیے فرعون جیسے اکفر الکافرین کی بیوی ہونا بھی اُن کے لیے کسی نقصان کا موجب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جنت کا مستحق بنا دیا۔ تیسری مثال حضرت مریم علیہا السلام کی ہے، جنھیں یہ مرتبۂ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمائش میں انھیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا، اس کے لیے انھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت مریمؑ کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو کبھی ایسی سخت آزمائش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوار پنے کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو معجزے کے طور پر حاملہ کر دیا گیا ہو اور اُسے بتا دیا گیا ہو کہ اُس کا رب اُس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب حضرت مریمؑ نے اِس پر کوئی واویلا نہ کیا بلکہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا قبول کر لیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت کرنا ناگزیر تھا، تب اللہ نے ان کو سیدۃ النسآء فی الجنۃ (مُسندِ احمد) کے مرتبۂ عالی پر سرفراز فرمایا۔

اِن اُمور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت جو اِس سورہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف وہی علم نہیں آتا تھا جو قرآن میں درج ہوا ہے، بلکہ آپؐ کو وحی کے ذریعے سے دوسری باتوں کا علم بھی دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی صریح دلیل اِس سورہ کی آیت ۳ ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اُنھوں نے وہ کسی اور کو بتا دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُطّلع کر دیا۔ پھر جب حضورؐ نے اِس غلطی پر اپنی اُن بیوی کو تنبیہ فرمائی، اور انھوں نے پوچھا کہ آپؐ کو میری یہ غلطی کس نے بتائی، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ مجھے علیم وخبیر ہستی نے اس کی خبر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پورے قرآن میں کہاں وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ ”اے نبیؐ! تم نے اپنی بیوی سے راز میں جو بات کہی تھی، وہ اُس نے کسی اور پر، یا فلاں شخص پر ظاہر کر دی ہے؟“ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس سے منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔

---

۱۲ ایاتہا — سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ — ۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ

اے نبیؐ! تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہے؟[1] (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟[2] — اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[3] اللہ نے تم لوگوں کے لیے

۱ — یہ دراصل استفہام نہیں ہے بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ یعنی مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرنا نہیں ہے کہ آپؐ نے یہ کام کیوں کیا ہے، بلکہ آپؐ کو اِس بات پر متنبّہ کرنا ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا جو فعل آپؐ سے صادر ہوا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اِس سے خود بخود یہ مضمون مُترشّح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے، اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، حتّٰی کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے۔ اگرچہ حضورؐ نے اُس چیز کو نہ عقیدتاً حرام سمجھا تھا اور نہ اُسے شرعاً حرام قرار دیا تھا، بلکہ صرف اپنی ذات پر اُس کے استعمال کو حرام کر لیا تھا، لیکن چونکہ آپؐ کی حیثیت ایک عام آدمی کی نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی تھی، اور آپؐ کے کسی چیز کو اپنے اُوپر حرام کر لینے سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اُمّت بھی اُس شے کو حرام، یا کم از کم مکروہ سمجھنے لگے، یا اُمّت کے افراد یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اُوپر حرام کر لینے میں کوئی مُضایقہ نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس فعل پر گرفت فرمائی اور آپؐ کو اس تحریم سے باز رہنے کا حکم دیا۔

۲ — اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے تحریم کا یہ فعل خود اپنی کسی خواہش کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ کی بیویوں نے یہ چاہا تھا کہ آپؐ ایسا کریں اور آپؐ نے محض اُن کو خوش کرنے کے لیے ایک حلال چیز اپنے لیے حرام کر لی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کے اِس فعل پر ٹوکنے کے ساتھ اُس کی اِس وجہ کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام صرف تحریمِ حلال سے آپؐ کو باز رکھنا ہوتا تو یہ مقصد پہلے فقرے سے پورا ہو جاتا تھا اور اس کی ضرورت نہ تھی کہ جس وجہ سے آپؐ نے یہ کام کیا تھا، اُس کی بھی تصریح کی جاتی۔ اُس کو بطورِ خاص بیان کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصد صرف حضورؐ ہی کو تحریمِ حلال پر ٹوکنا نہیں تھا بلکہ ساتھ ساتھ ازواجِ مطہّراتؓ کو بھی اس بات پر متنبّہ کرنا تھا کہ انھوں نے ازواجِ نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی نازک ذمہ داریوں کا احساس نہ کیا

اور حضورؐ سے ایک ایسا کام کرا دیا جس سے ایک حلال چیز کے حرام ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اگرچہ قرآن میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ چیز کیا تھی جسے حُضُورؐ نے اپنے اوپر حرام کیا تھا، لیکن محدثین ومفسرین نے اس سلسلے میں دو مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس آیت کے نُزُول کا سبب بنے۔ ایک واقعہ حضرت ماریہ قِبطِیہؓ کا ہے اور دوسرا واقعہ یہ کہ آپؐ نے شہد استعمال نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

حضرت ماریہؓ کا قصہ یہ ہے کہ صلحِ حُدَیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خُطوط اطراف ونواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے، اُن میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بِطرِیق (Patriarch) کے نام بھی تھا جسے عرب مُقَوقِس کہتے تھے۔ حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلْتَعہ یہ نامۂ گرامی لے کر جب اس کے پاس پہنچے تو اُس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ ”مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قِبطیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔“ (ابنِ سعد) اُن لڑکیوں میں سے ایک سِیرِین تھیں اور دوسری ماریہ۔ (عیسائی حضرت مریم کو ماریہ (Mary) کہتے ہیں)۔ مصر سے واپسی پر راستے میں حضرت حاطِبؓ نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے سِیرِین کو حضرت حَسّانؓ بن ثابت کی مِلکِ یمین میں دے دیا اور حضرت ماریہؓ کو اپنے حَرَم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۸ھ میں انھی کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔ (اَلْاِستِیعاب، اَلْاِصابہ) یہ خاتون نہایت خوبصورت تھیں۔ حافظ ابنِ حَجرؒ نے الِاصابہ میں ان کے متعلق حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”مجھے کسی عورت کا آنا اس قدر ناگوار نہ ہوا جتنا ماریہ کا آنا ہوا تھا، کیونکہ وہ حسین وجمیل تھیں اور حُضُورؐ کو بہت پسند آئی تھیں۔“ اِن کے بارے میں متعدد طریقوں سے جو قصہ احادیث میں نقل ہوا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حَفْصَہؓ کے مکان میں تشریف لے گئے اور وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ اُس وقت حضرت ماریہؓ آپؐ کے پاس وہاں آگئیں اور تخلیے میں آپؐ کے ساتھ رہیں۔ حضرت حَفْصَہؓ کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے حضورؐ سے اس کی سخت شکایت کی۔ اس پر آپؐ نے اُن کو راضی کرنے کے لیے اُن سے یہ عہد کر لیا کہ آیندہ ماریہؓ سے کوئی اِزْدِواجی تعلق نہ رکھیں گے۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ آپؐ نے ماریہؓ کو اپنے اُوپر حرام کر لیا، اور بعض میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے اِس پر قَسَم بھی کھائی تھی۔ یہ روایات زیادہ تر تابعین سے مُرسَلاً نقل ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے بعض حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہیں۔ ان کی کثرتِ طُرُق کو دیکھتے ہوئے حافظ ابنِ حَجرؒ نے فتح الباری میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اِس قصے کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔ مگر صِحاحِ سِتّہ میں سے کسی میں بھی یہ قصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔ نَسائی میں حضرت اَنَسؓ سے صرف اتنی بات منقول ہوئی ہے کہ ”حضورؐ کی ایک لونڈی تھی جس سے آپؐ تمتُّع فرماتے تھے۔ پھر حضرت حَفْصَہؓ اور حضرت عائشہؓ آپؐ کے پیچھے پڑ گئیں، یہاں تک کہ آپؐ نے اُسے اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ اِس پر

یہ آیت نازل ہوئی کہ اَے نبیؐ! تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے۔"

دوسرا واقعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور دوسری متعدِّد کُتُبِ حدیث میں خود حضرت عائشہؓ سے جس طرح نقل ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعُموم ہر روز عصر کے بعد تمام ازواجِ مطہّراتؓ کے ہاں چکر لگاتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپؐ حضرت زینبؓ بنتِ جَحش کے ہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے، کیونکہ ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا، اور حضورؐ کو شیرینی بہت پسند تھی، اس لیے آپؐ ان کے ہاں شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو اس پر رشک لاحق ہوا اور میں نے حضرت حَفصہؓ، حضرت سَوْدَہؓ اور حضرت صَفِیہؓ سے مل کر یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپؐ آئیں، وہ آپؐ سے یہ کہے کہ آپؐ کے منہ سے مَغافِیر کی بُو آتی ہے۔ مَغافیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں کچھ بِساند ہوتی ہے، اور اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرے تو اس کے اندر بھی اس بِساند کا اثر آ جاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حضورؐ نہایت نفاست پسند ہیں اور آپؐ کو اِس سے سخت نفرت ہے کہ آپؐ کے اندر کسی قسم کی بدبُو پائی جائے۔ اس لیے آپؐ کو حضرت زینبؓ کے ہاں ٹھیرنے سے روکنے کی خاطر یہ تدبیر کی گئی اور یہ کارگر ہوئی۔ جب متعدِّد بیویوں نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ کے منہ سے مَغافیر کی بُو آتی ہے تو آپؐ نے عہد کر لیا کہ اب یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔ ایک رِوایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ فَلَنْ اَعُوْدَ لَہٗ وَقَدْ حَلَفْتُ۔ "اب میں ہرگز اسے نہ پیوں گا، میں نے قسم کھا لی ہے۔" دوسری رِوایت میں صرف فَلَنْ اَعُوْدَ لَہٗ کے الفاظ ہیں، وَقَدْ حَلَفْتُ کا ذکر نہیں ہے۔ اور ابنِ عباسؓ سے جو رِوایت ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ وَاللّٰہِ لَا اشربُہٗ، "خدا کی قسم! میں اسے نہ پیوں گا۔"

اکابر اہلِ علم نے اِن دونوں قصّوں میں سے اِسی دوسرے قصّے کو صحیح قرار دیا ہے اور پہلے قصّے کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا ہے۔ امام نَسائی کہتے ہیں کہ "شہد کے معاملے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نہایت صحیح ہے، اور حضرت ماریہؓ کو حرام کر لینے کا قصّہ کسی عمدہ طریقے سے نقل نہیں ہوا ہے۔" قاضی عِیاض کہتے ہیں: "صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ماریہؓ کے معاملہ میں نہیں بلکہ شہد کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔" قاضی ابوبکر ابن العَرَبی بھی شہد ہی کے قصّے کو صحیح قرار دیتے ہیں، اور یہی رائے امام نَوَوِیؒ اور حافظ بدرالدینؒ عینی کی ہے۔ ابنِ ہُمام فتح القدیر میں کہتے ہیں کہ "شہد کی تحریم کا قصّہ صحیحین میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا تھا، اس لیے یہی زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔" حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں: "صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

۳- یعنی بیویوں کی خوشی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام کر لینے کا جو فعل آپؐ سے صادر ہوا ہے، یہ اگرچہ آپؐ کے اہم ترین ذمہ دارانہ منصب کے لحاظ سے مناسب نہ تھا، لیکن یہ کوئی گناہ بھی نہ تھا کہ اس پر مواخذہ کیا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف ٹوک کر اس کی اصلاح کر دینے پر اکتفا فرمایا اور آپؐ کی اِس لغزش کو معاف کر دیا۔

تَحِلَّةَ اَیۡمَانِکُمۡ ۚ وَاللّٰہُ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ وَھُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۲﴾

اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے[4]۔ اللہ تمھارا مولیٰ ہے، اور وہی علیم و حکیم ہے[5]۔

۴۔ مطلب یہ ہے کہ کفّارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ، آیت ۸۹ میں مقرر کر دیا ہے، اس کے مطابق عمل کر کے آپؐ اُس عہد کو توڑ دیں جو آپؐ نے ایک حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہاں ایک اہم فقہی سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ حکم اُس صورت کے لیے ہے جب کہ آدمی نے قسم کھا کر حلال کو حرام کر لیا ہو، یا بجائے خود تحریم ہی قسم کی ہم معنیٰ ہے، خواہ قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں؟ اس سلسلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ محض تحریم قسم نہیں ہے۔ اگر آدمی نے کسی چیز کو، خواہ وہ بیوی ہو یا کوئی دوسری حلال چیز، قسم کھائے بغیر اپنے اُوپر حرام کر لیا ہو تو یہ ایک لغو بات ہے جس سے کوئی کفّارہ لازم نہیں آتا، بلکہ آدمی کفّارے کے بغیر ہی وہ چیز استعمال کر سکتا ہے جسے اس نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے مَسۡرُوق، شَعۡبی، ربیعہ اور ابوسَلَمہ کی ہے اور اسی کو ابنِ جَرِیر اور تمام ظاہریوں نے اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحریم صرف اُس صورت میں قسم ہے جب کہ کسی چیز کو اپنے اُوپر حرام کرتے ہوئے قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ان کا اِسۡتِدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ حلال چیز کو اپنے لیے حرام کرنے کے ساتھ قسم بھی کھائی تھی، جیسا کہ متعدّد روایات میں بیان ہوا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ ہم نے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ مقرر کر دیا ہے، اس پر آپؐ عمل کریں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم کے الفاظ استعمال کیے بغیر کسی چیز کو حرام کر لینا بجائے خود قسم تو نہیں ہے، مگر بیوی کا معاملہ اس سے مُستثنیٰ ہے۔ دوسری اشیا، مثلاً کسی کپڑے یا کھانے کو آدمی نے اپنے اُوپر حرام کر لیا ہو تو یہ لغو ہے، کوئی کفّارہ دیے بغیر آدمی اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بیوی یا لونڈی کے لیے اس نے کہا ہو کہ اُس سے مباشرت میرے اُوپر حرام ہے، تو وہ حرام تو نہ ہوگی، مگر اس کے پاس جانے سے پہلے کفّارۂ یمین لازم آئے گا۔ یہ رائے شافعیہ کی ہے۔ (مُغۡنی المحتاج) اور اسی سے ملتی جُلتی رائے مالکیہ کی بھی ہے۔ (احکام القرآن لابن العَرَبی)

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ تحریم بجائے خود قسم ہے، خواہ قسم کے الفاظ استعمال نہ کیے گئے ہوں۔ یہ رائے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عائشہ، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے۔ اگرچہ ابنِ عباسؓ سے ایک دوسری رائے بخاری میں یہ نقل ہوئی ہے کہ اذا حرّم امرأتہٗ فلیس بشیءٍ (اگر آدمی نے اپنی بیوی کو حرام کیا ہو تو یہ کچھ نہیں ہے)، مگر اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ اُن کے نزدیک یہ طلاق نہیں بلکہ قسم ہے اور اس پر کفّارہ ہے، کیونکہ بخاری، مسلم اور ابنِ ماجہ میں

ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ حرام قرار دینے کی صورت میں کفّارہ ہے، اور نسائی میں رِوایت ہے کہ ابنِ عباسؓ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ”وہ تیرے اُوپر حرام تو نہیں ہے مگر تجھ پر کفّارہ لازم ہے“، اور ابنِ جَریر کی رِوایت میں ابنِ عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں: ”اگر لوگوں نے اپنے اُوپر کسی چیز کو حرام کیا ہو جسے اللہ نے حلال کیا ہے، تو ان پر لازم ہے کہ اپنی قسموں کا کفارہ ادا کریں۔“ یہی رائے حسن بصری، عطا، طاؤس، سلیمان بن یَسار، ابنِ جُبیر اور قَتادَہ کی ہے، اور اسی رائے کو حَنفِیَّہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوبکر جَصّاص کہتے ہیں کہ ”آیت لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ کے ظاہر الفاظ اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریم کے ساتھ ساتھ قسم بھی کھائی تھی، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ تحریم ہی قسم ہے، کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اِسی تحریم کے معاملے میں قسم کا کفارہ واجب فرمایا۔“ آگے چل کر پھر کہتے ہیں: ”ہمارے اصحاب (یعنی حنفیہ) نے تحریم کو اُس صورت میں قسم قرار دیا ہے جب کہ اس کے ساتھ طلاق کی نیت نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے بیوی کو حرام کہا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم! میں تیرے قریب نہیں آؤں گا، اس لیے وہ اِیلا کا مرتکب ہوا۔ اور اگر اس نے کسی کھانے پینے کی چیز وغیرہ کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم! میں وہ چیز استعمال نہ کروں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ فرمایا کہ آپؐ اُس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے، اور پھر فرمایا کہ اللہ نے تم لوگوں کے لیے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تحریم کو قسم قرار دیا اور تحریم کا لفظ اپنے مفہوم اور حکمِ شرعی میں قسم کا ہم معنیٰ ہوگیا۔“

اس مقام پر فائدہ عام کے لیے یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرنے، اور بیوی کے سوا دوسری چیزوں کو حرام کر لینے کے معاملے میں فقہا کے نزدیک شرعی حکم کیا ہے۔

حَنفِیَّہ کہتے ہیں کہ اگر طلاق کی نیت کے بغیر کسی شخص نے بیوی کو اپنے لیے حرام کیا ہو، یا قسم کھائی ہو کہ اس سے مُقارَبت نہ کرے گا، تو یہ اِیلا ہے اور اس صورت میں مُقارَبت سے پہلے اسے قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے طلاق کی نیت سے یہ کہا ہو کہ تُو میرے اُوپر حرام ہے، تو معلوم کیا جائے گا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ اگر تین طلاق کی نیت تھی تو تین واقع ہوں گی، اور اگر اس سے کم کی نیت تھی، خواہ ایک کی نیت ہو یا دو کی، تو دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق وارد ہوگی۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جو کچھ میرے لیے حلال تھا وہ حرام ہو گیا، تو اس کا اِطلاق بیوی پر اُس وقت تک نہ ہوگا جب تک اُس نے بیوی کو حرام کرنے کی نیت سے یہ الفاظ نہ کہے ہوں۔ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو حرام کرنے کی صورت میں آدمی اُس وقت تک وہ چیز استعمال نہیں کر سکتا جب تک قسم کا کفّارہ ادا نہ کر دے۔ (بدائع الصّنائع، ہِدایہ، فتح القدیر، احکام القرآن للجصّاص)

شافعیہ کہتے ہیں کہ بیوی کو اگر طلاق یا ظِہار کی نیت سے حرام کیا جائے تو جس چیز کی نیت ہوگی وہ واقع ہو جائے گی۔ رَجعی طلاق کی نیت ہو تو رَجعی، بائن کی نیت ہو تو بائن، اور ظِہار کی نیت ہو تو ظِہار۔ اور اگر کسی نے طلاق و ظِہار دونوں کی نیت سے تحریم کے الفاظ استعمال کیے ہوں تو اُس سے کہا جائے گا کہ دونوں میں سے

کسی ایک چیز کو اختیار کر لے، کیونکہ طلاق و ظہار، دونوں بیک وقت ثابت نہیں ہو سکتے۔ طلاق سے نکاح زائل ہوتا ہے، اور ظہار کی صورت میں وہ باقی رہتا ہے۔ اور اگر کسی نیت کے بغیر مطلقاً بیوی کو حرام قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام نہ ہوگی مگر قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔ اور اگر بیوی کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار دیا ہو تو یہ لغو ہے، اس پر کوئی کفّارہ نہیں ہے۔ (مُغْنی المحتاج)

مالکیہ کہتے ہیں کہ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو آدمی اپنے اُوپر حرام کرے تو نہ وہ حرام ہوتی ہے اور نہ اسے استعمال کرنے سے پہلے کوئی کفارہ لازم آتا ہے۔ لیکن اگر بیوی کو کہہ دے کہ تُو حرام ہے، یا میرے لیے حرام ہے، یا میں تیرے لیے حرام ہوں، تو خواہ مدخولہ سے یہ بات کہے یا غیر مدخولہ سے، ہر صورت میں یہ تین طلاق ہیں، اِلّا یہ کہ اس نے تین سے کم کی نیت ہو۔ اَصْبَغ کا قول ہے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ جو کچھ مجھ پر حلال تھا وہ حرام ہے، تو جب تک وہ بیوی کو مستثنیٰ نہ کرے، اس سے بیوی کی تحریم بھی لازم آ جائے گی۔ اَلْمُدَوَّنہ میں مدخولہ اور غیر مدخولہ کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ مدخولہ کو حرام کہہ دینے سے تین ہی طلاقیں پڑیں گی، خواہ نیت کچھ بھی ہو، لیکن غیر مدخولہ کے معاملے میں اگر نیت کم کی ہو تو جتنی طلاقوں کی نیت کی گئی ہے اُتنی ہی پڑیں گی، اور کسی خاص تعداد کی نیت نہ ہو تو پھر یہ تین طلاقیں ہوں گی۔ (حاشیۃ الدُّسُوقی) قاضی ابن العَرَبی نے احکام القرآن میں اس مسئلے کے متعلق امام مالکؒ کے تین قول نقل کیے ہیں: ایک، یہ کہ بیوی کی تحریم ایک طلاقِ بائن ہے۔ دوسرا، یہ کہ یہ تین طلاق ہیں۔ تیسرا، یہ کہ مدخولہ کے معاملے میں تو یہ بہر حال تین طلاقیں ہیں، البتہ غیر مدخولہ کے معاملے میں ایک کی نیت ہو تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔ پھر کہتے ہیں کہ ''صحیح یہ ہے کہ بیوی کی تحریم ایک ہی طلاق ہے، کیونکہ اگر آدمی حرام کہنے کے بجائے طلاق کا لفظ استعمال کرے اور کسی تعداد کا تعیُّن نہ کرے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔''

امام احمد بن حنبلؒ سے اس مسئلے میں تین مختلف اقوال منقول ہوئے ہیں: ایک یہ کہ بیوی کی تحریم، یا حلال کو مطلقاً اپنے لیے حرام قرار دینا ظِہار ہے، خواہ ظِہار کی نیت ہو یا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ یہ طلاق کا صریح کنایہ ہے اور اس سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، خواہ نیت ایک ہی کی ہو۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ قسم ہے، اِلّا یہ کہ آدمی نے طلاق یا ظِہار میں سے کسی کی نیت کی ہو، اور اِس صورت میں جو نیت بھی کی گئی ہو وہی واقع ہوگی۔ ان میں سے پہلا قول ہی مذہبِ حنبلی میں مشہور ترین ہے۔ (الانصاف)

۵ – یعنی اللہ تمھارا آقا اور تمھارے معاملات کا مُتَوَلّی ہے۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ تمھاری بھلائی کس چیز میں ہے، اور جو احکام بھی اُس نے دیے ہیں، سراسر حکمت کی بنا پر دیے ہیں۔ پہلی بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم خود مختار نہیں ہو، بلکہ اللہ کے بندے ہو اور وہ تمھارا آقا ہے، اس لیے اس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں میں ردّ و بدل کرنے کا اختیار تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تمھارے لیے حق یہی ہے کہ اپنے معاملات اس کے حوالے کر کے بس اُس کی اطاعت کرتے رہو۔ دوسری بات ارشاد فرمانے سے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ نے جو طریقے اور قوانین مقرر کیے ہیں، وہ سب علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ جس چیز کو حلال

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ③

(اور یہ معاملہ بھی قابلِ توجّہ ہے کہ) نبیؐ نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی۔ پھر جب اُس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا، اور اللہ نے نبیؐ کو اِس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی، تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اُس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبیؐ نے اُسے (اِفشائے راز) کی یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپؐ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا: ”مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے[٦]۔“

کیا ہے، علم و حکمت کی بنا پر حلال کیا ہے اور جسے حرام قرار دیا ہے، اسے بھی علم و حکمت کی بنا پر حرام قرار دیا ہے۔ یہ کوئی اَلل ٹَپ کام نہیں ہے کہ جسے چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام ٹھیرا دیا۔ لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ علیم و حکیم ہم نہیں ہیں بلکہ اللہ ہے اور ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کریں۔

٦ - مختلف رِوایات میں مختلف باتوں کے متعلّق یہ بیان کیا گیا ہے کہ فُلاں بات تھی جو حضورؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی اور اُن بیوی نے ایک دوسری بیوی سے اس کا ذکر کر دیا۔ لیکن ہمارے نزدیک اوّل تو اُس کا کھوج لگانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ راز کے اِفشا کرنے پر ہی تو اللہ تعالیٰ یہاں ایک بیوی کو ٹوک رہا ہے، پھر ہمارے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کی ٹٹول کریں اور اسے کھولنے کی فکر میں لگ جائیں۔ دوسرے، جس مقصد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ راز کی بات تھی کیا۔ مقصودِ کلام سے اس کا کوئی تعلق ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے خود بیان فرما دیتا۔ اصل غرض جس کے لیے اِس معاملے کو قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے، ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک کو اِس غَلَطی پر ٹوکنا ہے کہ اُن کے عظیم المرتبہ شوہر نے جو بات راز میں اُن سے فرمائی تھی، اُسے انھوں نے راز نہ رکھا اور اس کا اِفشا کر دیا۔ یہ محض ایک نجی معاملہ ہوتا، جیسا دنیا کے عام میاں اور بیوی کے درمیان ہوا کرتا ہے، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست وحی کے ذریعے سے حُضُورؐ کو اس کی خبر کر دیتا اور پھر محض خبر دینے ہی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ اسے اپنی اُس کتاب میں بھی درج کر دیتا جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کو پڑھنا ہے۔ لیکن اسے یہ اہمیت جس وجہ سے دی گئی، وہ یہ تھی کہ وہ بیوی

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ

اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمھارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں،[ے] اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے باہم جتھا بندی کی[۸] تو جان رکھو کہ اللہ

کسی معمولی شوہر کی نہ تھیں بلکہ اُس عظیم ہستی کی بیوی تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے انتہائی اہم ذمہ داری کے منصب پر مامور فرمایا تھا، جسے ہر وقت کفار و مشرکین اور منافقین کے ساتھ ایک مسلسل جہاد سے سابقہ درپیش تھا، جس کی قیادت میں کفر کی جگہ اسلام کا نظام برپا کرنے کے لیے ایک زبردست جدّوجُہد ہو رہی تھی۔ ایسی ہستی کے گھر میں بے شمار ایسی باتیں ہو سکتی تھیں جو اگر راز نہ رہتیں اور قبل از وقت ظاہر ہو جاتیں تو اُس کارِ عظیم کو نقصان پہنچ سکتا تھا جو وہ ہستی انجام دے رہی تھی۔ اس لیے جب اُس گھر کی ایک خاتون سے پہلی مرتبہ یہ کمزوری صادر ہوئی کہ اس نے ایک ایسی بات کو جو راز میں اُس سے کہی گئی تھی، کسی اور پر ظاہر کر دیا (اگرچہ وہ کوئی غیر نہ تھا بلکہ اپنے ہی گھر کا ایک فرد تھا) تو اس پر فوراً ٹوک دیا گیا، اور در پردہ نہیں بلکہ قرآنِ مجید میں برملا ٹوکا گیا، تاکہ نہ صرف ازواجِ مطہراتؓ کو، بلکہ مسلم معاشرے کے تمام ذمہ دار لوگوں کی بیویوں کو رازوں کی حفاظت کی تربیت دی جائے۔ آیت میں اس سوال کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جس راز کی بات کو اِفشا کیا گیا تھا، وہ کوئی خاص اہمیت رکھتی تھی یا نہیں، اور اس کے اِفشا سے کسی نقصان کا خطرہ تھا یا نہیں۔ گرفت بجائے خود اس امر پر کی گئی ہے کہ راز کی بات کو دوسرے سے بیان کر دیا گیا۔ اس لیے کہ کسی ذمہ دار ہستی کے گھر والوں میں اگر یہ کمزوری موجود ہو کہ وہ رازوں کی حفاظت میں تساہُل برتیں، تو آج ایک غیر اہم راز اِفشا ہوا ہے، کل کوئی اہم راز اِفشا ہو سکتا ہے۔ جس شخص کا منصب معاشرے میں جتنا زیادہ ذمہ دارانہ ہوگا، اُتنے ہی زیادہ اہم اور نازک معاملات اس کے گھر والوں کے علم میں آئیں گے۔ ان کے ذریعے سے راز کی باتیں دوسروں تک پہنچ جائیں تو کسی وقت بھی یہ کمزوری کسی بڑے خطرے کی موجب بن سکتی ہے۔

ے - اصل الفاظ ہیں: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا۔ صَغْو عربی زبان میں مُڑ جانے اور ٹیڑھا ہو جانے کے معنٰی میں بولا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اِس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: ”ہر آئینہ کج شدہ است دِل شما۔“ اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے: ”کج ہو گئے ہیں دل تمھارے۔“ حضرات عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عباسؓ سُفیان ثَوریؒ اور ضَحّاکؒ نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے: زَاغَتْ قُلُوْبُكُمَا، یعنی ”تمھارے دل راہِ راست سے ہٹ گئے ہیں۔“ امام رازیؒ اس کی تشریح میں کہتے ہیں: عدلت ومالت عن الحق وهو حق الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم، ”حق سے ہٹ گئے ہیں، اور حق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے۔“ اور علامہ آلوسیؒ کی تشریح یہ ہے: مالت عن الواجب من موافقته صلی اللّٰہ علیه وسلم بِحُبِّ ما یحبه وکراهة ما

یکرھہ الی مخالفتہ۔ یعنی "تم پر واجب تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پسند کریں اسے پسند کرنے میں، اور جو کچھ آپؐ ناپسند کریں اسے ناپسند کرنے میں آپؐ کی مُوافقت کرو۔ مگر تمھارے دل اِس معاملے میں آپؐ کی مُوافقت سے ہٹ کر آپؐ کی مخالفت کی طرف مُڑ گئے ہیں۔"

۸- اصل الفاظ ہیں: وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ۔ تظاہُر کے معنیٰ ہیں: کسی کے مقابلے میں باہم تعاوُن کرنا یا کسی کے خلاف ایکا کرنا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: "اگر باہم متفق شوید بر رنجانیدنِ پیغمبر۔" شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: "اگر تم دونوں چڑھائی کروگیاں اُس پر۔" مولانا اشرف علی صاحبؒ کا ترجمہ ہے: "اور اگر اسی طرح پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں۔" اور مولانا شبّیر احمد عثمانی صاحبؒ نے اِس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اگر تم دونوں اِسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں۔"

آیت کا خطاب صاف طور پر دو خواتین کی طرف ہے، اور سیاق و سَباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ہیں، کیونکہ اِس سورہ کی پہلی آیت سے پانچویں آیت تک مسلسل حضورؐ کی ازواج کے معاملات ہی زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس حد تک تو بات خود قرآنِ مجید کے اندازِ بیان سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دونوں بیویاں کون تھیں، اور وہ معاملہ کیا تھا جس پر یہ عتاب ہوا ہے، اِس کی تفصیل ہمیں حدیث میں ملتی ہے۔ مُسْنَدِ احمد، بخاری، مسلم، تِرْمِذی اور نَسائی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک مفصّل روایت نقل ہوئی ہے جس میں کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

> "میں ایک مدت سے اِس فکر میں تھا کہ حضرت عمرؓ سے پوچھوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے وہ کون سی دو بیویاں تھیں جنھوں نے حضورؐ کے مقابلے میں جتھا بندی کر لی تھی اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ارشاد فرمائی ہے کہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا، لیکن اُن کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک مرتبہ وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور میں اُن کے ساتھ گیا۔ واپسی پر راستے میں ایک جگہ اُن کو وضو کراتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے یہ سوال پوچھ لیا۔ انھوں نے جواب دیا: وہ عائشہؓ اور حَفصہؓ تھیں۔ پھر انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھنے کے عادی تھے۔ جب ہم مدینہ آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جن پر اُن کی بیویاں حاوی تھیں، اور یہی سبق ہماری عورتیں بھی اُن سے سیکھنے لگیں۔ ایک روز میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے رہی ہے (اصل الفاظ ہیں: فَاِذَا هِيَ تُرَاجِعُنِيْ)۔ مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے۔ اس نے کہا: آپ اس بات پر کیوں بگڑتے ہیں کہ میں آپ کو پلٹ کر جواب دوں؟ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضورؐ کو دُوبدُو جواب دیتی ہیں (اصل لفظ ہے:

لیُرَاجِعْنَهُ)اور ان میں سے کوئی حضوؐر سے دن دن بھر روٹھی رہتی ہے (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضوؐر اس سے دن بھر ناراض رہتے ہیں)۔ یہ سُن کر میں گھر سے نکلا اور حَفصہؓ کے ہاں گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضوؐر کی بیوی تھیں)۔ میں نے اُس سے پوچھا: کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُو بدُو جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے پوچھا: اور کیا تم میں سے کوئی دن بھر حضوؐر سے رُوٹھی رہتی ہے؟ (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضوؐر دن بھر اس سے ناراض رہتے ہیں)۔ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: نامراد ہوگئی اور گھاٹے میں پڑ گئی وہ عورت جو تم میں سے ایسا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات سے بے خوف ہوگئی ہے کہ اپنے رسولؐ کے غضب کی وجہ سے اللہ اس پر غضب ناک ہو جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر (یہاں بھی وہی الفاظ ہیں: لَا تُرَاجِعِیْ) اور نہ اُن سے کسی چیز کا مطالبہ کر، میرے مال سے تیرا جو جی چاہے مانگ لیا کر۔ تُو اس بات سے کسی دھوکے میں نہ پڑ کہ تیری پڑوسن (مراد ہیں حضرت عائشہؓ) تجھ سے زیادہ خوب صورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے نکل کر اُمِّ سَلَمہؓ کے پاس پہنچا جو میری رشتہ دار تھیں، اور میں نے اِس معاملے میں ان سے بات کی۔ انھوں نے کہا: ابنِ خطّاب! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہر معاملے میں تم نے دخل دیا، یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملے میں بھی دخل دینے چلے ہو۔ اُن کی اس بات نے میری ہمت توڑ دی۔ پھر ایسا ہوا کہ میرا ایک انصاری پڑوسی رات کے وقت میرے گھر آیا اور اس نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں باری باری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور جو بات کسی کی باری کے دن ہوتی تھی، وہ دوسرے کو بتا دیا کرتا تھا۔ زمانہ وہ تھا جب ہمیں غسّان کے حملے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اُس کے پکارنے پر جب میں نکلا تو اس نے کہا: ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے کہا: کیا غسّانی چڑھ آئے ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، اس سے بھی زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا: برباد ہوئی اور نامُراد ہوگئی حَفصہ، (بخاری کے الفاظ ہیں: رَغِمَ انْفُ حَفْصَةَ وعَائِشَةَ)، مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ ہونے والی بات ہے۔“

اس کے آگے کا قصّہ ہم نے چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضوؐر کی خدمت میں جا کر انھوں نے کس طرح حضوؐر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس قصّے کو ہم نے مُسندِ احمد اور بخاری کی روایات جمع کر کے مُرتّب کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ نے مُراجَعَت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اُسے لُغوی معنٰی میں نہیں لیا جاسکتا، بلکہ سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ یہ لفظ دُو بدُو جواب دینے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، اور حضرت عمرؓ کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لا تراجعی رسول اللہ صاف طور پر اِس معنٰی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان درازی نہ کیا کر۔

هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

اُس کا مولیٰ ہے اور اُس کے بعد جبریلؑ اور تمام صالح اہلِ ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور

اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مُراجَعَت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا، یا دُوبدُو جواب دینا تو صحیح ہے، مگر اس کا ترجمہ ''زبان درازی'' صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبے کا آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے، یا دُوبدُو جواب دے، تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے، تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ اور اُمت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔

بعض دوسرے لوگ ہمارے اس ترجمے کو سُوءِ ادب قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ سُوءِ ادب اگر ہو سکتا تھا تو اُس صورت میں جب کہ ہم اپنی طرف سے اِس طرح کے الفاظ حضرت حَفصہؓ کے متعلق استعمال کرنے کی جسارت کرتے۔ ہم نے تو حضرت عمرؓ کے الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کیا ہے، اور یہ الفاظ انھوں نے اپنی بیٹی کو اُس کے قُصور پر سرزنش کرتے ہوئے استعمال کیے ہیں۔ اسے سُوءِ ادب کہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یا تو باپ اپنی بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے بھی ادب سے بات کرے، یا پھر اس کی ڈانٹ کا ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے اس کو باادب کلام بنادے۔

اس مقام پر سوچنے کے قابل بات دراصل یہ ہے کہ اگر معاملہ صرف ایسا ہی ہلکا اور معمولی سا تھا کہ حضورؐ کبھی اپنی بیویوں کو کچھ کہتے تھے اور وہ پلٹ کر کچھ جواب دے دیا کرتی تھیں، تو آخر اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست خود ان ازواجِ مطہراتؓ کو شدت کے ساتھ تنبیہ فرمائی؟ اور حضرت عمرؓ نے اِس معاملے کو کیوں اتنا سخت سمجھا کہ پہلے بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے گھر جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے خیال میں ایسے ہی زُود رنج تھے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر بیویوں سے ناراض ہو جاتے تھے؟ اور کیا معاذ اللہ! آپ کے نزدیک حضورؐ کی تنگ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایسی ہی باتوں پر ناراض ہو کر آپؐ ایک دفعہ سب بیویوں سے مقاطعہ کر کے اپنے حجرے میں عزلت گزیں ہو گئے تھے؟ ان سوالات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو اسے لامحالہ ان آیات کی تفسیر میں دو ہی راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا: یا تو اسے ازواجِ مطہراتؓ کے احترام کی اتنی فکر لاحق ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر حرف آجانے کی پروا نہ کرے۔ یا پھر سیدھی طرح یہ مان لے کہ اُس زمانے میں ان ازواجِ مطہراتؓ کا رَوِیَّہ فی الواقع ایسا ہی قابلِ اعتراض ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہو جانے میں حق بجانب تھے، اور حضورؐ سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ اس بات میں حق بجانب تھا کہ

ظَهِيرٌ ۝۴ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ

مددگار ہیں۔[9] بعید نہیں کہ اگر نبیؐ تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمھارے بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہتر ہوں،[10] سچّی مسلمان، باایمان،[11] اطاعت گزار،[12] توبہ گزار،[13] عبادت گزار،[14]

اِن ازواج کو اس رَوِیّے پر شدت سے تنبیہ فرمائے۔

۹ – مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں جتھا بندی کر کے تم اپنا ہی نقصان کرو گی، کیونکہ جس کا مولیٰ اللہ ہے اور جبریلؑ اور ملائکہ اور تمام صالح اہلِ ایمان جس کے ساتھ ہیں، اس کے مقابلے میں جتھا بندی کر کے کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۰ – اس سے معلوم ہوا کہ قصور صرف حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ ہی کا نہ تھا، بلکہ دوسری ازواجِ مطہراتؓ بھی کچھ نہ کچھ قصوروار تھیں، اِسی لیے اُن دونوں کے بعد اِس آیت میں باقی سب ازواج کو بھی تنبیہ فرمائی گئی۔ قرآنِ مجید میں اس قصور کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، البتہ احادیث میں اس کے متعلق کچھ تفصیلات آئی ہیں۔ اُن کو ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

بخاری میں حضرت اَنَسؓ کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے آپس کے رشک و رقابت میں مل جُل کر حضورؐ کو تنگ کر دیا تھا (اصل الفاظ ہیں: اجتمع نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الغیرۃ علیہ۔) اس پر میں نے اُن سے کہا کہ ’بعید نہیں اگر حضورؐ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپؐ کو عطا فرما دے۔‘“ ابنِ ابی حاتم نے حضرت اَنَسؓ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ”مجھے خبر پہنچی کہ امہات المومنینؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس پر میں ان میں سے ایک ایک کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تمھارے بدلے تم سے بہتر بیویاں حضورؐ کو عطا فرما دے گا۔ یہاں تک کہ جب میں امہات المومنینؓ میں سے آخری کے پاس گیا (اور یہ بخاری کی ایک روایت کے بموجب حضرت اُمِّ سَلَمہ تھیں) تو انھوں نے مجھے جواب دیا: اَے عمرؓ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی نصیحت کے لیے کافی نہیں ہیں کہ تم انھیں نصیحت کرنے چلے ہو؟ اس پر میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔“

مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے عَلیحدگی اختیار فرمالی تو میں مسجدِ نبویؐ میں پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ متفکر بیٹھے ہوئے کنکریاں

اُٹھااُٹھا کر گرارہے ہیں اور آپس میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ اور حَفصہؓ کے ہاں اپنے جانے اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا: ''بیویوں کے معاملے میں آپؐ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اگر آپؐ ان کو طلاق دے دیں تو اللہ آپؐ کے ساتھ ہے، سارے ملائکہ اور جبریل و میکائیل آپؐ کے ساتھ ہیں اور میں اور ابوبکرؓ اور سب اہلِ ایمان آپؐ کے ساتھ ہیں۔'' میں اللہ کا شکر بجالاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ اُمید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرمادے گا، چنانچہ اس کے بعد سورۂ تحریم کی یہ آیات نازل ہوگئیں۔ پھر میں نے حضورؐ سے پوچھا: کیا آپؐ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس پر میں نے مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند اعلان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔

بخاری میں حضرت اَنَسؓ سے اور مُسنَدِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایات منقول ہوئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے تک کے لیے اپنی بیویوں سے عَلَیحدہ رہنے کا عہد فرمالیا تھا اور اپنے بالاخانے میں بیٹھ گئے تھے۔ ۲۹ دن گزر جانے پر جبریل علیہ السلام نے آکر کہا: آپؐ کی قسم پوری ہوگئی ہے، مہینا مکمل ہوگیا۔

حافظ بدرالدین عَینی نے عُمدۃ القاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ، حضرت سَودہؓ اور حضرت صَفِیہؓ تھیں، اور دوسری میں حضرت زینبؓ، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اور باقی ازواج شامل تھیں۔

ان تمام روایات سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی میں کیا حالات پیدا ہوگئے تھے، جن کی بنا پر یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ مداخلت کرکے ازواجِ مطہراتؓ کے طرزِ عمل کی اصلاح فرمائے۔ یہ ازواج اگرچہ معاشرے کی بہترین خواتین تھیں، مگر بہرحال تھیں انسان ہی، اور بَشَرِیت کے تقاضوں سے مُبَرّا نہ تھیں۔ کبھی ان کے لیے مسلسل عُسرت کی زندگی بسر کرنا دشوار ہوجاتا تھا اور وہ بے صبر ہو کر حضورؐ سے نَفَقہ کا مطالبہ کرنے لگتیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ اَحزاب کی آیات ۲۸-۲۹ نازل فرما کر ان کو تلقین کی کہ اگر تمھیں دنیا کی خوش حالی مطلوب ہے تو ہمارا رسول تم کو بخیر و خوبی رخصت کردے گا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو تو پھر صبر و شکر کے ساتھ ان تکلیفوں کو برداشت کرو جو رسول کی رفاقت میں پیش آئیں (تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۴۱، اور دیباچہ سورۂ احزاب، صفحہ ۸۴)۔ پھر کبھی نِسائی فطرت کی بنا پر اُن سے ایسی باتوں کا ظُہور ہوجاتا تھا جو عام انسانی زندگی میں معمول کے خلاف نہ تھیں، مگر جس گھر میں ہونے کا شَرَف اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، اس کی شان اور اس کی عظیم ذمہ داریوں سے وہ مُطابَقَت نہ رکھتی تھیں۔ ان باتوں سے جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ رسولؐ اللہ کی خانگی زندگی کہیں تلخ نہ ہوجائے اور اُس کا اثر اُس کارِ عظیم پر مترتّب نہ ہو جو اللہ تعالیٰ حضورؐ سے لے

رہا تھا، تو قرآنِ مجید میں یہ آیت نازل کر کے ان کی اصلاح فرمائی گئی، تاکہ ازواجِ مطہراتؓ کے اندر اپنے اُس مقام اور مرتبے کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو جو اللہ کے آخری رسولؐ کی رفیقِ زندگی ہونے کی حیثیت سے ان کو نصیب ہوا تھا، اور وہ اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح اور اپنے گھر کو عام گھروں کی طرح نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس آیت کا پہلا ہی فقرہ ایسا تھا کہ اس کو سُن کر ازواجِ مطہراتؓ کے دل لرز اٹھے ہوں گے۔ اِس ارشاد سے بڑھ کر ان کے لیے تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ ''اگر نبی تم کو طلاق دے دے تو بعید نہیں کہ اللہ اس کو تمھاری جگہ تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے۔'' اوّل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق مل جانے کا تصور ہی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، اس پر یہ بات مزید کہ تم سے امہات المومنین ہونے کا شرف چِھن جائے گا اور دوسری عورتیں جو اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں لائے گا، وہ تم سے بہتر ہوں گی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ازواجِ مطہراتؓ سے پھر کبھی کسی ایسی بات کا صُدور ہوتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت کی نوبت آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں بس دو ہی مقامات ہم کو ایسے ملتے ہیں جہاں اِن برگزیدہ خواتین کو تنبیہ فرمائی گئی ہے: ایک سورۂ احزاب اور دوسرے یہ سورۂ تحریم۔

۱۱- مسلم اور مومن کے الفاظ جب ایک ساتھ لائے جاتے ہیں تو مسلم کے معنی عَملاً احکامِ الٰہی پر عمل کرنے والے کے ہوتے ہیں، اور مومن سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو صدقِ دل سے ایمان لائے۔ پس بہترین مسلمان بیویوں کی اوّلین خُصوصیت یہ ہے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین پر ایمان رکھتی ہوں، اور عملاً اپنے اَخلاق، عادات، خصائل اور برتاؤ میں اللہ کے دین کی پیروی کرنے والی ہوں۔

۱۲- اِس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں: ایک، اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعِ فرمان۔ دوسرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرنے والی۔

۱۳- تائب کا لفظ جب آدمی کی صفت کے طور پر آئے تو اس کے معنی بس ایک ہی دفعہ توبہ کر لینے والے کے نہیں ہوتے، بلکہ ایسے شخص کے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اللہ سے اپنے قُصوروں کی معافی مانگتا رہے، جس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو، جسے ہر وقت اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا احساس ہوتا رہے اور وہ اُن پر نادم وشرمسار ہو۔ ایسے شخص میں کبھی غرور وتکبُّر اور نَخوَت وخود پسندی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے، بلکہ وہ طبعاً نرم مزاج اور حلیم ہوتا ہے۔

۱۴- عبادت گزار آدمی بہرحال کبھی اُس شخص کی طرح خدا سے غافل نہیں ہو سکتا جس طرح عبادت نہ کرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایک عورت کو بہترین بیوی بنانے میں اِس چیز کا بھی بڑا دخل ہے۔ عبادت گزار ہونے کی وجہ سے وہ حُدود اللہ کی پابندی کرتی ہے، حق والوں کے حق پہچانتی اور ادا کرتی ہے، اس کا ایمان ہر وقت تازہ اور زندہ رہتا ہے، اُس سے اِس امر کی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی پیروی سے منہ نہیں موڑے گی۔

سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

اور روزہ دار،[15] خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے،[16] جس پر نہایت تند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔[17] (اُس وقت کہا

۱۵- اصل میں لفظ سائحات استعمال ہوا ہے۔ متعدد صحابہؓ اور بکثرت تابعینؒ نے اس کے معنیٰ صائمات بیان کیے ہیں۔ روزے کے لیے سیاحت کا لفظ جس مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں سیاحت زیادہ تر راہب اور درویش لوگ کرتے تھے، اور ان کے ساتھ کوئی زادِ راہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر ان کو اُس وقت تک بھوکا رہنا پڑتا تھا جب تک کہیں سے کچھ کھانے کو نہ مل جائے۔ اِس بنا پر روزہ بھی ایک طرح کی درویشی ہی ہے کہ جب تک افطار کا وقت نہ آئے، روزہ دار بھی بھوکا رہتا ہے۔ ابنِ جَرِیر نے سورۂ توبہ، آیت ۱۲ کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ سياحة هذه الامة الصيام، "اس اُمت کی سِیاحت (یعنی درویشی) روزہ ہے۔" اِس مقام پر نیک بیویوں کی تعریف میں اُن کی روزہ داری کا ذکر اس معنیٰ میں نہیں کیا گیا ہے کہ وہ محض رمضان کے فرض روزے رکھتی ہیں، بلکہ اس معنیٰ میں ہے کہ وہ فرض کے علاوہ نفل روزے بھی رکھا کرتی ہیں۔

ازواجِ مطہّراتؓ کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ تمھارے بدلے میں اُن کو ایسی بیویاں عطا فرمائے گا جن میں یہ اور یہ صفات ہوں گی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ازواجِ مطہّراتؓ یہ صفات نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری جس غلط رَوِش کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہو رہی ہے اُس کو چھوڑ دو اور اُس کے بجائے اپنی ساری توجّہات اِس کوشش میں صَرف کرو کہ تمھارے اندر یہ پاکیزہ صفات بدرجۂ اتم پیدا ہوں۔

۱٦- یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظامِ فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اُس پر ڈالا ہے، اس کو بھی وہ اپنی حدِ استطاعت تک ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں، اور اگر وہ جہنّم کی راہ پر جا رہے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لَا تَعْتَذِرُوا۟ ٱلْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٧﴾ ع
يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن

جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمھیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔[18] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ[19]، بعید نہیں کہ اللہ تمھاری

ہوں تو جہاں تک بھی اس کے بس میں ہو، ان کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اُس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں، بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنّم کا ایندھن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ حکمراں راعی ہے اور وہ اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دِہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔''

جہنّم کا ایندھن پتھر ہوں گے، اس سے مراد غالباً پتھر کا کوئلہ ہے۔ ابنِ مسعودؓ، ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، امام محمد الباقرؒ اور سُدِّیؒ کہتے ہیں کہ یہ گندھک کے پتھر ہوں گے۔

۱۷- یعنی اُن کو جو سزا بھی کسی مجرم پر نافذ کرنے کا حکم دیا جائے گا، اُسے جُوں کا تُوں نافذ کریں گے اور ذرا رحم نہ کھائیں گے۔

۱۸- اِن دونوں آیتوں کا اندازِ بیان اپنے اندر مسلمانوں کے لیے سخت تنبیہ لیے ہوئے ہے۔ پہلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اِس خوفناک عذاب سے بچاؤ۔ اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ جہنّم میں عذاب دیتے وقت کافروں سے یہ کہا جائے گا۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مُترشّح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں وہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچنا چاہیے جس کی بدولت آخرت میں ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو۔

۱۹- اصل میں تَوْبَةً نَّصُوحًا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نُصح کے معنی عَرَبی زبان میں خُلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عَسَلِ ناصح کہتے ہیں، جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور اُدھڑے ہوئے کپڑے کی مرمّت کر دینے کے لیے نَصَاحۃ الثّوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہوگا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں

ریا اور نِفاق کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچالے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے، توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دے۔ یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اُسی کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں توبۂ نصوح کے وہ مفہومات جو اُس کے لغوی معنوں سے مُترشّح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم، تو اس کی تشریح ہمیں اُس حدیث میں ملتی ہے جو ابنِ ابی حاتم نے زِرّ بن حُبَیش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے توبۂ نصوح کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ”اِس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے اِستِغفار کرو اور آیندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔“ یہی مطلب حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، اور ایک رِوایت میں حضرت عمرؓ نے توبۂ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اِعادہ تو درکنار، اُس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔ (ابنِ جَرِیر) حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدّو کو جلدی جلدی توبہ واِستِغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا: یہ توبۃُ الکذّابین ہے۔ اس نے پوچھا: پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا: اُس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہییں: (۱) جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔ (۲) اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو اُن کو ادا کر۔ (۳) جس کا حق مارا ہو اُس کو واپس کر۔ (۴) جس کو تکلیف پہنچائی ہو اُس سے معافی مانگ۔ (۵) آیندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اِعادہ نہ کرے گا۔ اور (٦) اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گُھلا دے جس طرح تو نے اب تک اسے معصیت کا خُوگر بنائے رکھا ہے اور اُس کو طاعت کی تلخی کا مزا چکھا جس طرح اب تک تُو اُسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا ہے۔ (کَشّاف)

توبہ کے سلسلے میں چند اُمور اور بھی ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے: اوّل، یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے، یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے، توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ دوسرے، یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے، اسی وقت اسے توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو، بِلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اُسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ تیسرے، یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنا لینا اور اُسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے، اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے۔ چوتھے، یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا، اس سے اگر بشری کمزوری کی بنا پر اُسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہو گا،

يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨

بُرائیاں تم سے دُور کر دے اور تمھیں ایسی جنّتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔[20] یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔[21] اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دَوڑ رہا ہوگا، اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تُو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[22]

البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آیندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہوگا۔ پانچویں، یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے، توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا نفس اپنی سابق گناہ گارانہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے، یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے۔ اس لیے کہ جس شخص نے فی الواقع خدا کے خوف کی بنا پر معصیت سے توبہ کی ہو، وہ اِس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اُس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔

۲۰ – آیت کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ توبہ کرلو تو تمھیں ضرور معاف کر دیا جائے گا اور لازماً تم جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے، بلکہ یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو گے تو بعید نہیں کہ اللہ تمھارے ساتھ یہ معاملہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گار کی توبہ قبول کر لینا اور اسے سزا دینے کے بجائے جنت عطا فرما دینا اللہ پر واجب نہیں ہے، بلکہ یہ سراسر اُس کی عنایت و مہربانی ہوگی کہ وہ معاف بھی کرے اور انعام بھی دے۔ بندے کو اُس سے معافی کی امید تو ضرور رکھنی چاہیے مگر اس بھروسے پر گناہ نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ سے معافی مل جائے گی۔

۲۱ – یعنی اُن کے اعمالِ حَسنہ کا اجر ضائع نہ کرے گا۔ کفار و منافقین کو یہ کہنے کا موقع ہرگز نہ دے گا کہ ان لوگوں نے خدا پرستی بھی کی تو اس کا کیا صلہ پایا۔ رسوائی باغیوں اور نافرمانوں کے حصّے میں آئے گی، نہ کہ وفاداروں اور فرماں برداروں کے حصّے میں۔

۲۲ – اِس آیت کو سورۂ حدید کی آیات ۱۲-۱۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۗ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ

اَے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔[۲۳] ان کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

اللہ کافروں کے معاملے میں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو بطورِ مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیّت میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت[۲۴] کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی نہ

اہلِ ایمان کے آگے آگے نور کے دوڑنے کی یہ کیفیت اُس وقت پیش آئے گی جب وہ میدانِ حشر سے جنت کی طرف جا رہے ہوں گے۔ وہاں ہر طرف گُھپ اندھیرا ہوگا جس میں وہ سب لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے جن کے حق میں دوزخ کا فیصلہ ہوگا، اور روشنی صرف اہلِ ایمان کے ساتھ ہوگی جس کے سہارے وہ اپنا راستہ طے کر رہے ہوں گے۔ اس نازک موقع پر تاریکیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کی آہ و فغاں سُن سُن کر اہلِ ایمان پر خشیّت کی کیفیت طاری ہو رہی ہوگی، اپنے قصوروں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے انھیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہمارا نور بھی نہ چِھن جائے اور ہم اِن بدبختوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے نہ رہ جائیں، اس لیے وہ دعا کریں گے کہ اَے ہمارے رب! ہمارے قصور معاف فرما دے اور ہمارے نور کو جنت میں پہنچنے تک ہمارے لیے باقی رکھ۔ ابنِ جَریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا کے معنٰی یہ ہیں کہ ''وہ اللہ تعالٰی سے دعا کریں گے کہ ان کا نور اُس وقت تک باقی رکھا جائے اور اسے بُجھنے نہ دیا جائے جب تک وہ پُلِ صراط سے بخیریت نہ گزر جائیں۔'' حضرت حسن بصریؒ اور مجاہدؒ اور ضحّاکؒ کی تفسیر بھی قریب قریب یہی ہے۔ ابنِ کثیرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اہلِ ایمان جب دیکھیں گے کہ منافقین نور سے محروم رہ گئے ہیں تو وہ اپنے حق میں اللہ سے تکمیلِ نور کی دعا کریں گے۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۷)

۲۳- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۸۲۔

۲۴- یہ خیانت اس معنٰی میں نہیں ہے کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی تھیں، بلکہ اس معنٰی میں ہے کہ انھوں نے

شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝

کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ، آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ۔ اور اہلِ ایمان کے معاملے میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے، جب کہ اس نے دعا کی: ”اے میرے رب! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا[25] لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے۔“ اور عمران کی بیٹی مریم[26] کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی[27]، پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے رُوح پھُونک دی[28]، اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی[29]۔ ؏

ایمان کی راہ میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کا ساتھ نہ دیا، بلکہ ان کے مقابلے میں دشمنانِ دین کا ساتھ دیتی رہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ”کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی ہے۔ ان دونوں عورتوں کی خیانت دراصل دین کے معاملے میں تھی۔ انھوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کا دین قبول نہیں کیا۔ حضرت نوحؑ کی بیوی اپنی قوم کے جباروں کو ایمان لانے والوں کی خبریں پہنچایا کرتی تھی، اور حضرت لوطؑ کی بیوی اپنے شوہر کے ہاں آنے والے لوگوں کی اطلاع اپنی قوم کے بد اعمال لوگوں کو دے دیا کرتی تھی۔“ (ابن جریر)

۲۵- یعنی فرعون جو بُرے اعمال کر رہا ہے، ان کے انجامِ بد میں مجھے شریک نہ کر۔

۲۶- ہو سکتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد ہی کا نام عمران ہو، یا ان کو عمران کی بیٹی اس لیے کہا گیا ہو کہ وہ آلِ عمران سے تھیں۔

۲۷- یہ یہودیوں کے اِس الزام کی تردید ہے کہ ان کے بطن سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش، معاذاللہ! کسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ سورۂ نساء، آیت ۱۵۶ میں اِن ظالموں کے اِسی الزام کو بہتانِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۃ النساء، حاشیہ ۱۹۰)

۲۸- یعنی بغیر اس کے کہ ان کا کسی مرد سے تعلق ہوتا، اُن کے رحم میں اپنی طرف سے ایک جان ڈال دی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۹)

۲۹- جس مقصد کے لیے اِن تین قسم کی عورتوں کو مثال میں پیش کیا گیا ہے، اس کی تشریح ہم اِس سورہ کے دیباچے میں کر چکے ہیں، اس لیے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

تفہیم القرآن

الملک

(٦٧)

الملک

نام پہلے فقرے تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ کے لفظ الْمُلْكُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین اور اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس میں ایک طرف مختصر طریقے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسری طرف بڑے مؤثر انداز میں اُن لوگوں کو چونکایا گیا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مکۂ معظمہ کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بِعْثَت کو پیش کرتی ہیں، مگر تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ، تاکہ وہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ ان میں زیادہ تر زور اِس بات پر صَرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی غفلت دور کی جائے، ان کو سوچنے پر مجبور کیا جائے، اور ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

پہلی پانچ آیتوں میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ جس کائنات میں رہتا ہے، وہ ایک انتہائی منظّم اور محکم سلطنت ہے، جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نَقص یا خلل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلطنت کو عدم سے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے اور اس کی تدبیر و انتظام اور فرماں روائی کے تمام اختیارات بھی بالکلیّہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اُس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس انتہائی حکیمانہ نظام میں وہ بے مقصد پیدا نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ یہاں اسے امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اور اس امتحان میں وہ اپنے حُسنِ عمل ہی سے کامیاب ہوسکتا ہے۔

آیت ۶ سے ۱۱ تک کفر کے وہ ہولناک نتائج بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں نکلنے والے ہیں، اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ کو بھیج کر تمھیں اِسی دنیا میں اِن نتائج سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر یہاں تم انبیاؑ کی بات مان کر اپنا رَوِیّہ دُرست نہ کرو گے تو آخرت میں تمھیں خود

اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سزا تم کو دی جا رہی ہے، فی الواقع تم اُس کے مستحق ہو۔

آیت ۱۲ سے ۱۴ تک یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔ وہ تمھاری ہر کھُلی اور چھُپی بات، حتّٰی کہ تمھارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہٰذا اَخلاق کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ انسان اُس اَن دیکھے خدا کی باز پُرس سے ڈر کر بُرائی سے بچے، خواہ دنیا میں کوئی طاقت اُس پر گرفت کرنے والی ہو یا نہ ہو اور دنیا میں اُس سے کسی نقصان کا امکان ہو یا نہ ہو۔ یہ طرزِ عمل جو لوگ اختیار کریں گے، وہی آخرت میں بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

آیت ۱۵ سے ۲۳ تک اُن پیش پا اُفتادہ حقیقتوں کی طرف، جنھیں انسان دنیا کے معمولات سمجھ کر قابلِ توجہ شمار نہیں کرتا، پے در پے اشارے کر کے اُن پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اِس زمین کو دیکھو جس پر تم اطمینان سے چل پھر رہے ہو اور جس سے اپنا رزق حاصل کر رہے ہو۔ خدا ہی نے اِسے تمھارے لیے تابع کر رکھا ہے، ورنہ کسی وقت بھی اِس زمین میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے کہ تم پیوندِ خاک ہو جاؤ، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمھیں تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اپنے اُوپر اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو۔ خدا ہی تو ہے جو انھیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ اپنے تمام ذرائع و وسائل پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ خدا اگر تمھیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو کون تمھیں اُس سے بچا سکتا ہے، اور خدا اگر تمھارے لیے رزق کے دروازے بند کر دے تو کون انھیں کھول سکتا ہے؟ یہ ساری چیزیں تمھیں حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے موجود ہیں، مگر اِنھیں تم حیوانات کی طرح دیکھتے ہو جو مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور اُس سماعت و بینائی اور اُن سوچنے سمجھنے والے دماغوں سے کام نہیں لیتے جو انسان ہونے کی حیثیت سے خدا نے تمھیں دیے ہیں۔ اِسی وجہ سے راہِ راست تمھیں نظر نہیں آتی۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک بتایا گیا ہے کہ آخرِ کار تمھیں لازماً اپنے خدا کے حُضور حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ تمھیں اُس کے آنے کا وقت اور تاریخ بتائے۔ اُس کا کام بس یہ ہے کہ تمھیں اُس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کر دے۔ تم آج اُس کی بات نہیں مانتے اور مطالبہ کرتے ہو کہ وہ وقت لا کر تمھیں دکھا دیا جائے۔ مگر جب وہ آ جائے گا اور تم آنکھوں سے اسے دیکھ لو گے تو تمھارے ہوش اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تم سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جسے جلدی لے آنے کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔

آیت ۲۸ اور ۲۹ میں کفارِ مکّہ کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف کرتے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوستے تھے اور آپؐ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے ہلاکت کی دعائیں مانگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ تمھیں راہِ راست کی طرف بلانے

والے خواہ ہلاک ہوں یا اللہ اُن پر رحم کرے، اِس سے آخر تمھاری قسمت کیسے بدل جائے گی؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کا عذاب اگر تم پر آجائے تو کون تمھیں بچائے گا؟ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اُس پر توکُّل کیا ہے، انھیں تم گمراہ سمجھ رہے ہو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بات کھل جائے گی کہ حقیقت میں گمراہ کون تھا۔

آخر میں لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے اور اسی پر سوچنے کے لیے انھیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں، جہاں تمھاری زندگی کا سارا انحصار اُس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آیا ہے، وہاں اگر یہ پانی زمین میں اُتر کر غائب ہو جائے تو خدا کے سوا کون تمھیں یہ آبِ حیات لا کر دے سکتا ہے؟

آیاتہا ۳۰ رکوعاتہا ۲

سُورَۃُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ ﴿۱﴾

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

نہایت بزرگ و برتر ہے[1] وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے[2]، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[3]۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے[4]،

۱- تَبٰرَكَ برکت سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ برکت میں رفعت و عظمت، افزائش اور فراوانی، دوام وثبات اور کثرت خیرات وحسنات کے مفہومات شامل ہیں۔ اِس سے جب مبالغے کا صیغہ تَبٰرَكَ بنایا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بے انتہا بزرگ وعظیم ہے، اپنی ذات وصفات وافعال میں اپنے سوا ہر ایک سے بالاتر ہے، بے حد وحساب بھلائیوں کا فیضان اُس کی ذات سے ہو رہا ہے، اور اُس کے کمالات لازوال ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۳۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حواشی ۱ و ۱۹)

۲- اَلْمُلْكُ کا لفظ چونکہ مطلقاً استعمال ہوا ہے اس لیے اسے کسی محدود معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ لامحالہ اس سے مراد تمام موجوداتِ عالَم پر شاہانہ اقتدار ہی ہو سکتا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں اقتدار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہاتھ رکھتا ہے، بلکہ یہ لفظ محاورے کے طور پر قبضے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی کی طرح ہماری زبان میں بھی جب یہ کہتے ہیں کہ اختیارات فلاں کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہی سارے اختیارات کا مالک ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

۳- یعنی وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اُسے عاجز کرنے والی نہیں ہے کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

۴- یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اُس نے اِس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اِس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل، یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے، یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝٢ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝٣ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝٤

اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔[5] جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے۔[6] تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔[7] پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمھیں کوئی خلل[8] نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمھاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے، اور موت کے معنٰی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے، یہ کہ اِسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے، تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھادے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے، یہ کہ خالق ہی دراصل اِس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا برا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے، اُسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ممتحن کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے، اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنٰی ہی نہیں رہتے۔

۵ - اس کے دو معنٰی ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں: ایک، یہ کہ وہ بے انتہا زبردست اور سب پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود اپنی مخلوق کے حق میں رحیم و غفور ہے، ظالم اور سخت گیر نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ بُرے عمل کرنے والوں کو سزا دینے کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کی سزا سے بچ سکے۔ مگر جو نادم ہو کر برائی سے باز آ جائے اور معافی مانگ لے، اس کے ساتھ وہ درگزر کا معاملہ کرنے والا ہے۔

٦ - تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حاشیہ ۸۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۱۳۔ المومنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، الصّافات، حاشیہ ۵۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔

۷ - اصل میں تفاوُت کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: عدمِ تناسُب۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے میل نہ کھانا۔ اَنمِل بے جوڑ ہونا۔ پس اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں تم کہیں بدنظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نہ پاؤ گے۔ اللہ کی پیدا کردہ اِس دنیا میں کوئی چیز اَنمِل بے جوڑ نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزا باہم مربوط ہیں اور ان میں کمال درجے کا تناسُب پایا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاۤءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝۵ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا

ہم نے تمھارے قریب کے آسمان[9] کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے[10] اور انھیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔[11] اِن شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیّا کر رکھی ہے۔

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے[12]، ان کے لیے جہنّم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اُس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سُنیں[13] گے

۸ – اصل میں لفظ فُطُور استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: دراڑ، شگاف، رخنہ، پھٹا ہوا ہونا، ٹوٹا پھوٹا ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کی بندش ایسی چُست ہے، اور زمین کے ایک ذرّے سے لے کر عظیم الشان کہکشانوں تک ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ کہیں نظمِ کائنات کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ تم خواہ کتنی ہی جستجو کر لو، تمھیں اس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں مل سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ق، حاشیہ ۸)

۹ – قریب کے آسمان سے مراد وہ آسمان ہے جس کے تاروں اور سیاروں کو ہم برَہنہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے جن چیزوں کے مشاہدے کے لیے آلات کی ضرورت پیش آتی ہو، وہ دور کے آسمان ہیں۔ اور ان سے بھی زیادہ دُور کے آسمان وہ ہیں جن تک آلات کی رسائی بھی نہیں ہے۔

۱۰ – اصل میں لفظ ''مَصَابِیح'' نکرہ استعمال ہوا ہے، اور اس کے نکرہ ہونے سے خود بخود اِن چراغوں کے عظیم الشان ہونے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات ہم نے اندھیری اور سُنسان نہیں بنائی ہے، بلکہ اسے ستاروں سے خوب مزیّن اور آراستہ کیا ہے، جس کی شان اور جگمگاہٹ رات کے اندھیروں میں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

۱۱ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں، اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہابِ ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گرتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد وحساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں، اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اِس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالَمِ بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اُوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہاب انھیں مار بھگاتے ہیں۔ اس چیز کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عرب کے لوگ

وَّهِيَ تَفُوۡرُ ۝٧ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ كُلَّمَاۤ اُلۡقِىَ فِيۡهَا فَوۡجٌ سَاَلَهُمۡ خَزَنَـتُهَاۤ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَذِيۡرٌ ۝٨ قَالُوۡا بَلٰى قَدۡ جَآءَنَا نَذِيۡرٌ ۙ فَكَذَّبۡنَا

اور وہ جوش کھا رہی ہوگی، شدتِ غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے: "کیا تمھارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟"[14] وہ جواب دیں گے: "ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا

کاہنوں کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے، اور یہی خود کاہنوں کا دعویٰ بھی تھا، کہ شیاطین اُن کے تابع ہیں، یا شیاطین سے اُن کا رابطہ ہے، اور اُن کے ذریعے سے انھیں غیب کی خبریں حاصل ہوتی ہیں اور وہ صحیح طور پر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں۔ اِس لیے قرآن میں متعدّد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کے عالَمِ بالا میں جانے اور وہاں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۹ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافّات، حواشی ٦-٧)

رہا یہ سوال کہ ان شہابوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دَور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معاینے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیّارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رُخ کر لیتے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹٦۷ء، جلد ۱۵۔ لفظ (Meteorites)

۱۲ – یعنی انسان ہوں یا شیطان، جن لوگوں نے بھی اپنے رب سے کفر کیا ہے، ان کا یہ انجام ہے۔ (رب سے کفر کرنے کے مفہوم کی تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱٦۱۔ النساء، حاشیہ ۱۷۸۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۹۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳)

۱۳ – اصل میں لفظ شھیق استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس فقرے کے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنّم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنّم سے آ رہی ہوگی، جہاں اُن لوگوں سے پہلے گرے ہوئے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔ اِس دوسرے مفہوم کی تائید سورۂ ہودؑ کی آیت ۱۰٦ سے ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ "ہانپیں گے اور پھُنکارے ماریں گے۔" اور پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان، آیت ۱۲ سے ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ

وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ⑨ وَ قَالُوْا

اور کہا: اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو[15]" اور وہ کہیں گے:

دُور ہی سے اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔ اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ یہ شور خود جہنم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔

۱۴- اس سوال کی اصل نوعیت سوال کی نہیں ہوگی کہ جہنم کے کارندے ان لوگوں سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خبردار کرنے والا آیا تھا یا نہیں، بلکہ اس سے مقصود اُن کو اِس بات کا قائل کرنا ہوگا کہ انھیں جہنم میں ڈال کر ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی جارہی ہے۔ اس لیے وہ خود اُن کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے خبر نہیں رکھا تھا، اُن کے پاس انبیا بھیجے تھے، اُن کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور راہِ راست کون سی ہے، اور اُن کو مُتنبِّہ کر دیا تھا کہ اس راہِ راست کے خلاف چلنے کا نتیجہ اِسی جہنّم کا ایندھن بننا ہوگا جس میں اب وہ جھونکے گئے ہیں، مگر انھوں نے انبیا کی بات نہ مانی، لہٰذا اب جو سزا انھیں دی جارہی ہے وہ فی الواقع اس کے مستحق ہیں۔

یہ بات قرآنِ مجید میں بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان کے لیے دنیا میں انسان کو بھیجا ہے وہ اِس طرح نہیں لیا جارہا ہے کہ اُسے بالکل بے خبر رکھ کر یہ دیکھا جارہا ہو کہ وہ خود راہِ راست پاتا ہے یا نہیں، بلکہ اُسے راہِ راست بتانے کا جو معقول ترین انتظام ممکن تھا وہ اللہ نے پوری طرح کر دیا ہے، اور وہ یہی انتظام ہے کہ انبیا بھیجے گئے ہیں اور کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اب انسان کا سارا امتحان اِس امر میں ہے کہ وہ انبیا علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مان کر سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے یا ان سے منہ موڑ کر خود اپنی خواہشات اور تخیُّلات کے پیچھے چلتا ہے۔ اِس طرح نبوت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ حجت ہے جو اس نے انسان پر قائم کر دی ہے، اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انبیا کے آنے کے بعد کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کرسکتا کہ ہم حقیقت سے آگاہ نہ تھے، ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم کو اتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا گیا، اور اب ہمیں بے قصور سزا دی جارہی ہے۔ اِس مضمون کو اتنی بار اتنے مختلف طریقوں سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، آیت ۲۱۳، حاشیہ ۲۳۰۔ النساء، آیات ۴۱-۴۲، حاشیہ ٦۴، آیت ۱٦۵، حاشیہ ۲۰۸۔ الانعام، آیات ۱۳۰-۱۳۱، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، آیت ۱۵، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، آیت ۱۳۴۔ القصص، آیت ۴۷، حاشیہ ٦٦، آیت ۵۹، حاشیہ ۸۳، آیت ٦۵۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۳۷۔ المومن، آیت ۵۰، حاشیہ ٦٦۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ

"کاش! ہم سُنتے یا سمجھتے[16] تو آج اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔"
اس طرح وہ اپنے قصور[17] کا خود اعتراف کر لیں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔
جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں[18]، یقیناً اُن کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر۔[19]
تم خواہ چُپکے سے بات کرو یا اُونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک

۱۵- یعنی تم بھی بہکے ہوئے ہو اور تم پر ایمان لانے والے لوگ بھی سخت گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

۱۶- یعنی ہم نے طالبِ حق بن کر انبیاؑ کی بات کو توجہ سے سنا ہوتا، یا عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ فی الواقع وہ بات کیا ہے جو وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں سننے کو سمجھنے پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے نبی کی تعلیم کو توجہ سے سننا (یا اگر وہ لکھی ہوئی شکل میں ہو تو طالبِ حق بن کر اُسے پڑھنا) ہدایت پانے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ اُس پر غور کر کے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا مرتبہ اس کے بعد آتا ہے۔ نبی کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل سے بطورِ خود کام لے کر انسان براہِ راست حق تک نہیں پہنچ سکتا۔

۱۷- قصور کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اصل قصور جس کی بنا پر وہ جہنّم کے مستحق ہوئے، رسولوں کا جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہے۔ باقی سارے گناہ اُسی کی فرع ہیں۔

۱۸- یہ دین میں اَخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا بُرائی سے اس لیے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ بُرائی ہے، یا دنیا اسے بُرا سمجھتی ہے، یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، یا اس پر کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے، یہ اَخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو بُرا اور ایک بُری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیارِ خیر و شر اوّل تو یکساں نہیں ہیں، پھر وہ وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں، کوئی عالَم گیر اور اَزلی و اَبدی معیار دنیا کے اَخلاقی فلسفوں میں نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ جو شخص بُرائی سے اس لیے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اُس کی ذات پر مترتّب ہونے والے کسی نقصان سے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ ع

جانتا ہے[20]۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے[21]؟ حالانکہ وہ باریک بیں[22] اور باخبر ہے۔ ع

ڈرتا ہے، وہ ایسی حالت میں اُس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جب کہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اِسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشہادہ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اُس کی نگاہ سے بچ کر کیے جا سکتے ہیں، اور ہر دنیوی طاقت کی گرفت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں۔ پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام برائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔ بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں، حالانکہ وہ اُن برائیوں سے قبیح تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اس لیے دینِ حق نے اَخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اُس اَن دیکھے خدا سے ڈر کر برائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے، جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں نہیں جا سکتا، جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالَم گیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔ اُسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا، یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں اُن کو اختیار کرتا ہے، تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔

۱۹ – یعنی خدا سے بالغیب ڈرنے کے دو لازمی نتائج ہیں: ایک، یہ کہ جو قُصور بھی بَشری کمزوریوں کی بنا پر آدمی سے سرزد ہو گئے ہیں، وہ معاف کر دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان کی تہ میں خدا سے بے خوفی کار فرما نہ ہو۔ دوسرے، یہ کہ جو نیک اعمال بھی انسان اِس عقیدے کے ساتھ انجام دے گا، اُن پر وہ بڑا اجر پائے گا۔

۲۰ – یہ بات تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی ہے، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر۔ مومن کے لیے اس میں یہ تلقین ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہر وقت یہ احساس اپنے ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے کہ اس کے کھلے اور چھپے اقوال و اعمال ہی نہیں، اس کی نیتیں اور اس کے خیالات تک اللہ سے مخفی نہیں ہیں۔ اور کافر کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ اپنی جگہ خدا سے بے خوف ہو کر جو کچھ چاہے کرتا رہے، اس کی کوئی بات اللہ کی گرفت سے چھوٹی نہیں رہ سکتی۔

۲۱ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا وہ اپنی مخلوق ہی کو نہ جانے گا؟" اصل میں مَنْ خَلَقَ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی "جس نے پیدا کیا ہے" بھی ہو سکتے ہیں، اور "جس کو اُس نے پیدا کیا ہے" بھی۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ یہ دلیل ہے اُس بات کی جو اُوپر کے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی آخر یہ کیسے

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِهٖ ؕ وَ اِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق،[۲۳] اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔[۲۴] کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے[۲۵] تمہیں زمین میں

ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر ہو؟ مخلوق خود اپنے آپ سے بے خبر ہو سکتی ہے، مگر خالق اُس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ تمھاری رگ رگ اس نے بنائی ہے۔ تمھارے دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اس کا بنایا ہوا ہے۔ تمھارا ہر سانس اس کے جاری رکھنے سے جاری ہے۔ تمھارا ہر عضو اس کی تدبیر سے کام کر رہا ہے۔ اُس سے تمھاری کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟

۲۲ – اصل میں لفظ ''لطیف'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ غیر محسوس طریقے سے کام کرنے والے کے بھی ہیں اور پوشیدہ حقائق کو جاننے والے کے بھی۔

۲۳ – یعنی یہ زمین تمھارے لیے آپ سے آپ تابع نہیں بن گئی ہے اور وہ رزق بھی جو تم کھا رہے ہو خود بخود یہاں پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اللہ نے اپنی حکمت اور قدرت سے اس کو ایسا بنایا ہے کہ یہاں تمھاری زندگی ممکن ہوئی اور یہ عظیم الشان کُرہ ایسا پُرسکون بن گیا کہ تم اطمینان سے اِس پر چل پھر رہے ہو اور ایسا خوانِ نعمت بن گیا کہ اِس میں تمھارے لیے زندگی بسر کرنے کا بے حد و حساب سر و سامان موجود ہے۔ اگر تم غفلت میں مبتلا نہ ہو اور کچھ ہوش سے کام لے کر دیکھو تو تمھیں معلوم ہو کہ اِس زمین کو تمھاری زندگی کے قابل بنانے اور اس کے اندر رزق کے اتھاہ خزانے جمع کر دینے میں کتنی حکمتیں کار فرما ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۲۹-۳۲۔ المومن، حواشی ۹۰-۹۱۔ الزُخرُف، حاشیہ ۷۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸)

۲۴ – یعنی اس زمین پر چلتے پھرتے اور خدا کا بخشا ہوا رزق کھاتے ہوئے اِس بات کو نہ بھولو کہ آخرِ کار تمھیں ایک دن خدا کے حُضور حاضر ہونا ہے۔

۲۵ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے، بلکہ یہ بات اِس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا کی طرف رُجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کسی آفت کے موقع پر سب سہاروں سے مایوس ہوتا ہے تو آسمان کا رُخ کر کے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی بلا آ پڑتی ہے تو کہتا ہے: یہ اُوپر سے نازل ہوئی ہے۔ غیر معمولی طور پر حاصل ہونے والی چیز کے متعلق کہتا ہے: یہ عالَمِ بالا سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کُتبِ سماوی یا کُتبِ آسمانی

بِكُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡكُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ كَیۡفَ نَذِیۡرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِیۡنَ

دھنسادے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟[۲۶] پھر تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔[۲۷] اِن سے پہلے

کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص ایک کالی لونڈی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک مومن غلام آزاد کرنا واجب ہو گیا ہے، کیا میں اِس لونڈی کو آزاد کر سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس لونڈی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اُس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔ حضورؐ نے پوچھا: اور میں کون ہوں؟ اُس نے پہلے آپؐ کی طرف اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کیا، جس سے اس کا یہ مطلب واضح ہو رہا تھا کہ آپؐ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: اِسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے (اسی سے ملتا جلتا قصہ مُؤطّا، مسلم اور نَسائی میں بھی روایت ہوا ہے)۔ حضرت خَوْلَہؓ بنتِ ثَعْلَبہ کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا: یہ وہ خاتون ہیں جن کی شکایت سات آسمانوں پر سُنی گئی (تفسیر سورۂ مُجادلہ، حاشیہ ۲ میں ہم اِس کی تفصیل نقل کر چکے ہیں)۔ اِن ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اُس کا ذہن نیچے زمین کی طرف نہیں، بلکہ اُوپر آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اِسی بات کو ملحوظ رکھ کر یہاں اللہ تعالیٰ کے متعلق مَنۡ فِی السَّمَآءِ (وہ جو آسمان میں ہے) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ اِس میں اِس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اِسی سورۂ مُلک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (جس نے تہ بر تہ سات آسمان پیدا کیے) اور سورۂ بَقَرہ میں ارشاد ہوا ہے: فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رُخ کرو، اُس طرف اللہ کا رُخ ہے)۔

۲۶۔ مراد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اِس زمین پر تمھارا ابقا اور تمھاری سلامتی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ اپنے بل بُوتے پر تم یہاں مزے سے نہیں دندنا رہے ہو۔ تمھاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جو یہاں گزر رہا ہے، اللہ کی حفاظت اور نگہبانی کا رہینِ منت ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی اُس کے ایک اشارے سے ایک زلزلہ ایسا آ سکتا ہے کہ یہی زمین تمھارے لیے آغوشِ مادر کے بجائے قبر کا گڑھا بن جائے، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمھاری بستیوں کو غارت کر کے رکھ دے۔

۲۷۔ تنبیہ سے مراد وہ تنبیہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ پاک کے ذریعے سے کفارِ مکہ

مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿١٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ؕۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴿١٩﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۚ﴿٢٠﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ

وقف لازم اختلافی
وقف غفران
وقف منزل

گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی[۲۸]۔ کیا یہ لوگ اپنے اُوپر اُڑنے والے پرندوں کو پَر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انھیں تھامے ہوئے ہو[۲۹]۔ وہی ہر چیز کا نگہبان[۳۰] ہے۔ بتاؤ، آخر وہ کون سا لشکر تمھارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمھاری مدد کر سکتا ہے[۳۱]؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمھیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمٰن

کو کی جا رہی تھی کہ اگر کفر و شرک سے باز نہ آؤ گے اور اُس دعوتِ توحید کو نہ مانو گے جو تمھیں دی جا رہی ہے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

۲۸ – اشارہ ہے اُن قوموں کی طرف جو اپنے ہاں آنے والے انبیاؑ کو جھٹلا کر اِس سے پہلے مبتلائے عذاب ہو چکی تھیں۔

۲۹ – یعنی ایک ایک پرندہ جو ہوا میں اُڑ رہا ہے، خدائے رحمٰن کی حفاظت میں اُڑ رہا ہے۔ اُسی نے ہر پرندے کو وہ ساخت عطا فرمائی جس سے وہ اڑنے کے قابل ہوا۔ اسی نے ہر پرندے کو اڑنے کا طریقہ سکھایا۔ اُسی نے ہوا کو اُن قوانین کا پابند کیا جن کی بدولت ہوا سے زیادہ بھاری جسم رکھنے والی چیزوں کا اُس میں اڑنا ممکن ہوا۔ اور وہی ہر اُڑنے والے کو فضا میں تھامے ہوئے ہے، ورنہ جس وقت بھی اللہ اپنی حفاظت اُس سے ہٹا لے، وہ زمین پر آ رہے۔

۳۰ – یعنی کچھ پرندوں ہی پر موقوف نہیں، جو چیز بھی دنیا میں موجود ہے، اللہ کی نگہبانی کی بدولت موجود ہے۔ وہی ہر شے کے لیے وہ اسباب فراہم کر رہا ہے جو اس کے وجود کے لیے درکار ہیں، اور وہی اِس بات کی نگرانی کر رہا ہے کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق کو اس کی ضروریات بہم پہنچیں۔

۳۱ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "رحمٰن کے سوا وہ کون ہے جو تمھارا لشکر بنا ہوا تمھاری دست گیری

اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِىۡ عُتُوٍّ وَّنُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنۡ يَّمۡشِىۡ مُكِبًّا عَلٰى وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰٓى اَمَّنۡ يَّمۡشِىۡ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۲﴾ قُلۡ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۳﴾ قُلۡ هُوَ الَّذِىۡ ذَرَاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَاِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اَڑے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچو، جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو[۳۲] وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اُٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟ اِن سے کہو: اللہ ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔[۳۳]

اِن سے کہو: اللہ ہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔[۳۴]

کرتا ہو۔'' ہم نے متن میں جو ترجمہ کیا ہے، وہ آگے کے فقرے سے مناسبت رکھتا ہے، اور اس دوسرے ترجمے کی مناسبت پچھلے سلسلۂ کلام سے ہے۔

۳۲- یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کیے ہوئے اُسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اُسے ڈال دیا ہو۔

۳۳- یعنی اللہ نے تو تمھیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا۔ تمھارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو، اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ کان تمھیں اس لیے تو نہیں دیے گئے تھے کہ جو شخص تمھیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات سُن کر نہ دو اور جو غلط سلط باتیں پہلے سے تمھارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں اُنھی پر اَڑے رہو۔ یہ آنکھیں تمھیں اس لیے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بینائی سے کام لے کر یہ نہ دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ آیا اُس توحید کی شہادت دے رہی ہیں جسے خدا کا رسول پیش کر رہا ہے، یا یہ شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظامِ کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اِس کو چلا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دل و دماغ بھی تمھیں اس لیے نہیں دیے گئے تھے کہ تم سوچنے سمجھنے کا کام دوسروں کے حوالے کر کے ہر اُس طریقے کی پیروی کرنے لگو جو دنیا میں کسی نے جاری کر دیا ہے اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کرو کہ وہ غلط ہے یا صحیح۔ اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں تمھیں حق شناسی کے

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ

یہ کہتے ہیں: ''اگر تم سچّے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟''[۳۵] کہو: ''اِس کا علم تو اللہ کے پاس ہے، میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔''[۳۶] پھر جب یہ اُس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے

لیے دی تھیں۔ تم ناشکری کر رہے ہو کہ اِن سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لیے یہ دی گئی تھیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۷۲-۷۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۷۵-۷۶۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۷-۱۸۔ الاحقاف، حاشیہ ۳۱)

۳۴- یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ہر گوشۂ زمین سے گھیر لائے جاؤ گے اور اس کے سامنے حاضر کر دیے جاؤ گے۔

۳۵- یہ سوال اِس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کا وقت اور اُس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر انھیں اُس کی آمد کا سال، مہینا، دن اور وقت بتا دیا جائے تو وہ اسے مان لیں گے۔ بلکہ دراصل وہ اُس کے آنے کو غیر ممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے اور یہ سوال اس غرض کے لیے کرتے تھے کہ اُسے جھٹلانے کا ایک بہانہ اُن کے ہاتھ آئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ حشر و نشر کا یہ عجیب و غریب افسانہ جو تم ہمیں سنا رہے ہو، آخر یہ کب ظُہور میں آئے گا؟ اِسے کس وقت کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر اُسے دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمیں اس کا یقین آ جائے؟ اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص اگر قیامت کا قائل ہو سکتا ہے تو عقلی دلائل سے ہو سکتا ہے، اور قرآن میں جگہ جگہ وہ دلائل تفصیل کے ساتھ دے دیے گئے ہیں۔ رہی اُس کی تاریخ، تو قیامت کی بحث میں اُس کا سوال اٹھانا ایک جاہل آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض وہ بتا بھی دی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ماننے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جب وہ تمھاری بتائی ہوئی تاریخ پر آ جائے گی تو مان لوں گا، آج آخر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ اُس روز ضرور آ جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۶۳۔ الاحزاب، حاشیہ ۱۱۶۔ سبا، حواشی ۵-۴۸۔ یٰسین، حاشیہ ۴۵)

۳۶- یعنی یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آئے گی، اور لوگوں کو اس کی آمد سے پہلے خبردار کر دینے کے لیے یہی جاننا کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ کب آئے گی، تو اس کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے، اور خبردار کرنے کے لیے اِس علم کی کوئی حاجت نہیں۔ اس معاملے کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ کون شخص کب مرے گا، اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ ہمارا یہ علم اِس بات کے لیے

وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُونَ ﴿٢٧﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾ ع

چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے انکار کیا ہے[۳۷]، اور اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے۔

اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچا لے گا[۳۸]؟ اِن سے کہو: وہ بڑا رحیم ہے، اُسی پر ہم ایمان لائے ہیں، اور اُسی پر ہمارا بھروسا ہے[۳۹]، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے۔ اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمھارے کنوؤں کا پانی زمین میں اُتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمھیں نکال کر لا دے گا[۴۰]؟ ع

کافی ہے کہ ہم اپنے کسی غیر محتاط دوست کو یہ تنبیہ کریں کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مفاد کی حفاظت کا انتظام کر لے۔ اِس تنبیہ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ وہ کس روز مرے گا۔

۳۷- یعنی ان کا وہی حال ہو گا جو پھانسی کے تختے کی طرف لے جائے جانے والے کسی مجرم کا ہوتا ہے۔

۳۸- مکۂ معظمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آغاز ہوا اور قریش کے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو گھر گھر حضوؐر اور آپؐ کے ساتھیوں کو بد دعائیں دی جانے لگیں۔ جادُو ٹونے کیے جانے لگے تا کہ آپؐ ہلاک ہو جائیں۔ حتّٰی کہ قتل کے منصوبے بھی سوچے جانے لگے۔ اِس پر یہ فرمایا گیا کہ اِن سے کہو: خواہ ہم ہلاک ہوں یا خدا کے فضل سے زندہ رہیں، اِس سے تمھیں کیا حاصل ہو گا؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کے عذاب سے تم کیسے بچو گے۔

۳۹- یعنی ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور تم اس سے انکار کر رہے ہو، ہمارا بھروسا خدا پر ہے اور تمھارا اپنے

جتھوں اور اپنے وسائل اور اپنے معبودانِ غیر اللہ پر۔ اس لیے خدا کی رحمت کے مستحق ہم ہو سکتے ہیں نہ کہ تم۔

۴۰ – یعنی کیا خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہے کہ ان سوتوں کو پھر سے جاری کر دے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر عبادت کا مستحق خدا ہے یا تمہارے وہ معبود جو انھیں جاری کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے؟ اس کے بعد تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ گمراہ، خدائے واحد کو ماننے والے ہیں یا وہ جو شرک کر رہے ہیں؟

تفہیم القرآن

القلم

(۶۸)

القلم

نام اِس کا نام سورۂ نٓ بھی ہے اور القلم بھی۔ دونوں الفاظ سورت کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔

زمانۂ نزُول یہ بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالَفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس میں تین مضامین بیان ہوئے ہیں: مخالفین کے اعتراضات کا جواب، اُن کو تنبیہ اور نصیحت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔

آغازِ کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں، حالانکہ جو کتاب تم پیش کر رہے ہو اور اَخلاق کے جس اعلیٰ مرتبے پر تم فائز ہو، وہ خود اِن کے اِس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرزانہ کون۔ لہٰذا مخالفت کا جو طوفان تمھارے خلاف اٹھایا جا رہا ہے، اس کا دباؤ ہرگز قبول نہ کرو۔ دراصل یہ ساری باتیں اس لیے کی جا رہی ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح دَب کر ان سے مُصالَحت (compromise) کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

پھر عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے نام لیے بغیر مخالفین میں سے ایک نمایاں شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے اہلِ مکہ خوب جانتے تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق بھی سب کے سامنے تھے، اور ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ آپؐ کی مخالفت میں مکے کے جو سردار پیش پیش ہیں، اُن میں کس سیرت و کردار کے لوگ شامل ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۷ سے ۳۳ تک ایک باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے جنھوں نے اللہ سے نعمت پا کر اُس کی ناشکری کی اور اُن کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اس کی نصیحت بروقت نہ مانی، آخرِکار وہ اُس نعمت سے محروم ہو گئے اور اُن کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اُن کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ یہ مثال دے کر اہلِ مکہ کو مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت سے تم بھی اسی آزمائش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے۔ اگر ان کی بات نہ مانو گے تو دنیا میں بھی عذاب بھگتو گے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

پھر آیت ۳۴ سے ۴۷ تک مسلسل کفار کو فہمایش کی گئی ہے، جس میں کہیں تو خطاب براہِ راست اُن سے ہے اور کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطَب کرتے ہوئے دراصل تنبیہ اُن کو کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کی بھلائی لازماً اُنھی لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرماں برداروں کا انجام وہ ہو جو مجرموں کا ہونا چاہیے۔ کفار کی یہ غلط فہمی قطعی بے بنیاد ہے کہ خدا اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو وہ خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں، حالانکہ اِس کے لیے اُنھیں کوئی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں، قیامت کے روز وہ سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کر سکیں گے اور ذلّت کا انجام انھیں دیکھنا پڑے گا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اُنھیں جو ڈھیل دی جا رہی ہے، اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِس تکذیب کے باوجود جب اُن پر عذاب نہیں آ رہا ہے تو وہ صحیح راستے پر ہیں، حالانکہ وہ بے خبری میں ہلاکت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس رسولؐ کی مُخالَفت کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بے غرض مبلّغ ہے، اپنی ذات کے لیے اُن سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے، اور وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ اُنھیں اُس کے رسول نہ ہونے اور اُس کی باتوں کے غلط ہونے کا علم حاصل ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغِ دین کی راہ میں پیش آئیں، اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جائیں اور اُس بے صبری سے بچیں جو یُونُس علیہ السلام کے لیے ابتلا کی موجب بنی تھی۔

ایاتہا ۵۲ رکوعاتہا ۲

سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④

ن۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں[1]، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو[2]۔ اور یقیناً تمھارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں[3]۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے[4] پر ہو۔

۱- امامِ تفسیر مُجاہد کہتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر، یعنی قرآن لکھا جا رہا تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ چیز جو لکھی جا رہی تھی اس سے مراد قرآنِ مجید ہے۔

۲- یہ ہے وہ بات جس پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبینِ وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہو رہا ہے، بجائے خود کفار کے اِس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں۔ حضورؐ کے دعوائے نبوت سے پہلے تو اہلِ مکہ آپؐ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپؐ کی دیانت و امانت اور عقل و فراست پر اعتماد رکھتے تھے۔ مگر جب آپؐ نے اُن کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپؐ کو دیوانہ قرار دینے لگے۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ قرآن ہی ان کے نزدیک وہ سبب تھا جس کی بنا پر اُنھوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اِس تُہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کا فصیح و بلیغ کلام، جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، اِس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے، کُجا کہ اسے اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپؐ معاذ اللہ! دیوانے ہو گئے ہیں۔ اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب تو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مقصود کفار کو اُن کی تہمت کا جواب دینا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوتی ہے کہ آپؐ مجنون نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہ نہ تھا کہ اسے دُور کرنے کے لیے آپؐ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔ مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمھارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۲۲)

۳- یعنی آپؐ کے لیے اِس بات پر بے حساب اور لازوال اجر ہے کہ آپؐ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے جو

کوششیں کر رہے ہیں، اُن کے جواب میں آپؐ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپؐ اپنے اِس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔

۴۔ اِس مقام پر یہ فقرہ دو معنٰی دے رہا ہے: ایک، یہ کہ آپؐ اَخلاق کے بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں، اسی وجہ سے آپؐ ہدایتِ خلق کے کام میں یہ اذیتیں برداشت کر رہے ہیں، ورنہ ایک کمزور اَخلاق کا انسان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ قرآن کے علاوہ آپؐ کے بلند اَخلاق بھی اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپؐ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں، وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازُن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اِس کے برعکس آدمی کے بلند اَخلاق اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ مُتوازِن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ اُن سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اِس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبُور ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اُن کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن کے لیے نقصان دِہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپؐ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم وتحقیق کا بھی ہے جو اِس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جُنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآنِ پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضورؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اِس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں، وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغو بات کہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ کان خلقه القراٰن ''قرآن آپؐ کا اخلاق تھا۔'' امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، دارمی اور ابنِ جَرِیر نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اُن کا یہ قول متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اِس کے معنٰی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اُس کا مجسّم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا، آپؐ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپؐ نے خود سب سے زیادہ اُس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا، سب سے بڑھ کر آپؐ کی ذات اُن سے مُتَّصِف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھیرایا گیا سب سے زیادہ آپؐ اُن سے پاک تھے۔ ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو

فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ ﴿٥﴾ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿٦﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿٧﴾ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿٩﴾ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿١٠﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴿١١﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ

عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جُنون میں مبتلا ہے۔ تمھارا رب اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔ لہٰذا تم اِن جُھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں[5]۔ ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے[6]، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے[7]، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بد اعمال ہے، جفا کار ہے[8]، اور اِن سب عُیوب کے ساتھ

نہیں مارا، اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپؐ کو پہنچائی گئی ہو، اِلّا یہ کہ اللہ کی حُرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپؐ نے اللہ کی خاطر اُس کا بدلہ لیا ہو، اور آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کا آپؐ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپؐ آسان تر کام کو پسند فرماتے تھے، اِلّا یہ کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا تو آپؐ سب سے زیادہ اس سے دُور رہتے تھے۔" (مُسندِ احمد) حضرت اَنَسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔ آپؐ نے کبھی میری کسی بات پر اُف تک نہ کی، کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تُو نے یہ کیوں کیا، اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تُو نے یہ کیوں نہ کیا۔" (بخاری و مسلم)

۵ — یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمھاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر لیں، یا تم اِن کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمھارے ساتھ مُصالحت کر لیں۔

٦ — اصل میں لفظ مَہِیْنٍ استعمال ہوا ہے جو حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت قسمیں کھانے والے آدمی کی لازمی صفت ہے۔ وہ بات بات پر اس لیے قسم کھاتا ہے کہ اُسے خود یہ احساس

زَنِيمٍ ﴿١٣﴾ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِينَ ﴿١٤﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٥﴾ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ ﴿١٦﴾ إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ

بد اصل ہے،[9] اِس بنا پر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے[10]۔ جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے: یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سُونڈ پر داغ لگائیں گے[11]۔

ہم نے اِن (اہلِ مکّہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش

ہوتا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے۔ اِس بنا پر وہ اپنی نگاہ میں خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

۷ – اصل میں مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خیر عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھُوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں۔ اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنیٰ میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہر نیک کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔

۸ – اصل میں لفظ عُتُلّ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو، اور اس کے ساتھ نہایت بدخُلق، جھگڑالو اور سفّاک ہو۔

۹ – اصل میں لفظ زَنِیْم استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ اُس وَلَدُ الزِّنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہوگیا ہو۔ سعید بن جُبَیر اور شَعْبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اُس شخص کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔

اِن آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں، اُس کے بارے میں مفسّرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص ولید بن مُغِیرہ تھا۔ کسی نے اَسْوَد بن عَبدِ یَغُوث کا نام لیا ہے۔ کسی نے اَخْنَس بن شُرَیق کو اس کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں نام لیے بغیر صرف اُس کے اوصاف بیان کر دیے گئے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے اِن اوصاف کے لیے اتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

۱۰ – اس فقرے کا تعلّق اُوپر کے سلسلۂ کلام سے بھی ہوسکتا ہے اور بعد کے فقرے سے بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ایسے آدمی کی دھونس اِس بنا پر قبول نہ کرو کہ وہ بہت مال اولاد رکھتا ہے۔ دوسری صورت

الْجَنَّةِ ۚ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿١٧﴾ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ﴿١٨﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿١٩﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ﴿٢١﴾ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ﴿٢٢﴾ فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ﴿٢٣﴾ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ﴿٢٤﴾ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ﴿٢٦﴾

میں ڈالا تھا[12]، جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے، اور وہ کوئی اِستثنا نہیں کر رہے تھے[13]۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمھارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی[14] کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چُپکے چُپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمھارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی[15] اِس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے: ''ہم راستہ بھول گئے ہیں، ـــــ نہیں،

میں معنی یہ ہوں گے کہ بہت مال اولاد والا ہونے کی بنا پر وہ مغرور ہو گیا ہے، جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔

۱۱ — چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا، اس لیے اس کی ناک کو سُونڈ کہا گیا ہے۔ اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔ یعنی ہم دنیا اور آخرت میں اس کو ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

۱۲ — اِس مقام پر سورۂ کہف، رُکوع ۵ بھی پیشِ نظر رہے جس میں اِسی طرح عبرت دلانے کے لیے دو باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

۱۳ — یعنی اُنھیں اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر ایسا بھروسا تھا کہ قسم کھا کر بے تکلّف کہہ دیا کہ ہم ضرور کل اپنے باغ کے پھل توڑیں گے، اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم یہ کام کریں گے۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ

وقف لازم

بلکہ ہم محروم رہ گئے[16]۔" اُن میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے[17]؟" وہ پکار اُٹھے: "پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے۔" پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا[18]۔ آخر کو انھوں نے کہا: "افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اِس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔" ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی بڑا ہے،

۱۴ـ کھیتی کا لفظ غالباً اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ باغ میں درختوں کے درمیان کھیت بھی تھے۔

۱۵ـ اصل الفاظ ہیں: عَلٰى حَرْدٍ۔ حَرْد عربی زبان میں روکنے اور نہ دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، قصد اور طے شدہ فیصلے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور سُرعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں تینوں معنوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۱۶ـ یعنی پہلے تو انھیں باغ کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ انھی کا باغ ہے اور کہنے لگے: شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور جگہ نکل آئے ہیں، پھر جب غور کیا اور معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہی ہے تو چیخ اُٹھے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

۱۷ـ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور توڑیں گے، اُس وقت اِس شخص نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ تم خدا کو بھول گئے، اِن شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟ مگر انھوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر جب وہ مسکینوں کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر رہے تھے، اُس وقت بھی اس نے انھیں نصیحت کی کہ اللہ کو یاد کرو اور اس بُری نیت سے باز آجاؤ، مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

۱۸ـ یعنی ہر ایک نے دوسرے کو الزام دینا شروع کیا کہ اُس کے بہکانے سے ہم اِس خدا فراموشی اور بد نیتی میں مبتلا ہوئے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾ ع إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٣٤﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ وقفة كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ

کاش یہ لوگ اِس کو جانتے ع

یقیناً[19] خدا ترس لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں نعمت بھری جنّتیں ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟[20] کیا تمھارے پاس کوئی کتاب[21] ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمھارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمھارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمھیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ اِن سے پوچھو: تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟[22] یا پھر ان کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنھوں نے اِس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے شریکوں کو

۱۹- مکہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو یہ نعمتیں جو دنیا میں مل رہی ہیں، یہ خدا کے ہاں ہمارے مقبول ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو، یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی، جیسا کہ تم کہتے ہو، تو ہم وہاں بھی مزے کریں گے، اور عذاب تم پر ہو گا نہ کہ ہم پر۔ اس کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۲۰- یعنی یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرماں بردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمھاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجا ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اُس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوش حالی تو دیکھ لی، مگر اپنے اور اُن کے اَخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلّف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں اِن فرماں برداروں کے ساتھ تو مجرموں

اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۱﴾ یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّ یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَۃً اَبۡصَارُہُمۡ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ وَ قَدۡ کَانُوۡا یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ وَ ہُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

اگر یہ سچّے ہیں۔[۲۳]

جس روز سخت وقت آ پڑے[۲۴] گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے، اِن کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلّت اِن پر چھا رہی ہو گی۔ یہ جب صحیح و سالم تھے اُس وقت اِنھیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے[۲۵])۔

کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔

۲۱ – یعنی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب۔

۲۲ – اصل میں لفظ زَعِیۡمٌ استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں زعیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل، یا ضامن، یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمھارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے۔

۲۳ – یعنی تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو، اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اُس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے، اُن میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمھیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمھیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟

۲۴ – اصل الفاظ ہیں: یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ ''جس روز پنڈلی کھولی جائے گی۔'' صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اس کے یہی معنیٰ بیان کیے ہیں اور ثبوت میں کلامِ عرب سے اِستِشہاد کیا ہے۔ ایک اور قول جو ابنِ عباسؓ اور رَبیع بن اَنَسؒ سے منقول ہے، اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رُو سے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

۲۵ – اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے روز علی الاعلان اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون

فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿ؕ۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ

پس اے نبیؐ! تم اِس کلام کے جُھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔[۲۶] ہم ایسے طریقے سے اِن کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ اِن کو خبر بھی نہ ہوگی۔[۲۷] میں اِن کی رسّی دراز کر رہا ہوں، میری چال[۲۸] بڑی زبردست ہے۔

کیا تم اِن سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹّی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟[۲۹] کیا اِن کے پاس

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اُس سے منحرف تھا۔ اِس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجالائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ مگر جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سرِ نیاز جھکانے سے انکار کر دیا تھا اُن کی کمر تختہ ہو جائے گی۔ اُن کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے وہ ذلت اور پشیمانی کے ساتھ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

۲۶- یعنی اِن سے نمٹنے کی فکر میں نہ پڑو۔ اِن سے نمٹنا میرا کام ہے۔

۲۷- بے خبری میں کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک دشمنِ حق اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اولاد اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں، جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، خوب کر رہا ہوں، میرے عمل میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اِس طرح وہ حق دشمنی اور ظلم و طغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت یہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔

۲۸- اصل میں لفظ کَیْد استعمال ہوا ہے، جس کے معنی کسی کے خلاف خفیہ تدبیر کرنے کے ہیں۔ یہ چیز صرف اُس صورت میں ایک بُرائی ہوتی ہے جب یہ ناحق کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے ہو، ورنہ بجائے خود اِس میں کوئی برائی نہیں ہے، خصوصاً جب کسی ایسے شخص کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا جائے جس نے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیا ہو۔

۲۹- سوال بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے، مگر اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپؐ کی

وقف لازم

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤٧﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿٤٨﴾ لَوْلَآ أَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٥٠﴾

غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں؟[30] پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو[31] اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ،[32] جب اُس نے پکارا تھا، اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔[33] اگر اُس کے رب کی مہربانی اس کے شاملِ حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا[34] جاتا۔ آخرکار اُس کے رب نے اُسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا۔

مخالفت میں حد سے گزرے جا رہے تھے۔ اُن سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہمارا رسولؐ تم سے کچھ مانگ رہا ہے کہ تم اس پر اتنا بگڑ رہے ہو؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ایک بے غرض آدمی ہے اور جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے، صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک اِسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ تم نہیں ماننا چاہتے تو نہ مانو، مگر اِس تبلیغ پر آخر اتنے چراغ پا کیوں ہوئے جا رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۳۱)

۳۰- یہ دوسرا سوال بھی بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل آپؐ کے مخالفین اس کے مخاطَب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رسول فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا رسول نہیں ہے اور جو حقیقتیں یہ تم سے بیان کر رہا ہے وہ بھی غلط ہیں، اس لیے تم اس کو جھٹلانے میں اتنی شدّت برت رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۳۲)

۳۱- یعنی وہ وقت ابھی دُور ہے جب اللہ تعالیٰ تمھاری فتح و نصرت اور تمھارے اِن مخالفین کی شکست کا فیصلہ فرما دے گا۔ اُس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس دین کی تبلیغ میں پیش آئیں، انھیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۳۲- یعنی یونُس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کی تلقین کرنے کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ یونُس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جاؤ، خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اللہ کا فیصلہ آنے سے پہلے بے صبری سے کوئی کام کیا تھا جس کی بنا پر وہ عتاب کے مستحق ہو گئے تھے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن،

وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾

ع

وقف لازم

جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سُنتے ہیں تو تمھیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمھارے قدم اُکھاڑ دیں گے[۳۵]، اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے، حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ ع

جلد دوم، یونس، آیت ۹۸ ، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، الانبیاء، آیات ۸۷-۸۸، حواشی ۸۲ تا ۸۵۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸، حواشی ۷۸ تا ۸۵)

۳۳- سورۂ انبیاء میں اِس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ مچھلی کے پیٹ اور سمندر کی تاریکیوں میں حضرت یونس علیہ السلام نے پکارا تھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، ”کوئی خدا نہیں تیری پاک ذات کے سوا، میں واقعی خطاوار ہوں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد سن لی اور ان کو غم سے نجات دی۔ (آیات ۸۷-۸۸)

۳۴- اِس آیت کو سورۂ صافّات کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۶ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں ڈالے گئے تھے اُس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے، لیکن جب انھوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کرلیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سَقیم حالت میں ایک چٹیَل زمین پر پھینکے گئے، مگر وہ اُس وقت مَذمّت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُس جگہ ایک بیل دار درخت اگا دیا، تاکہ اُس کے پتّے ان پر سایہ بھی کریں اور وہ اس کے پھل سے بھوک اور تشنگی بھی دُور کرسکیں۔

۳۵- یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اُردو میں کہتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُس کو کھا جائے گا۔ کفارِ مکہ کے اِس جذبۂ غیظ وغضب کی کیفیت سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۷۳ تا ۷۷ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

تفہیم القرآن

الحآقّۃ

(٦٩)

الحآقّۃ

نام سورت کے پہلے ہی لفظ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے اور اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُخالفت تو شروع ہو چکی تھی، مگر اس نے ابھی زیادہ شدت نہ اختیار کی تھی۔ مُسندِ احمد میں حضرت عمرؓ کی رِوایت ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا، مگر آپؐ مجھ سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپؐ نماز میں سورۂ اَلحاقّۃ پڑھ رہے تھے۔ میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضوؐر کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ’’یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔‘‘ میں نے اپنے دل میں کہا: ’’شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔‘‘ اُسی وقت زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ’’اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ تو ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔‘‘ یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اُتر گیا۔ حضرت عمرؓ کی اِس رِوایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اُن کے قُبولِ اسلام سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اِس واقعے کے بعد بھی ایک مدت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے اور وقتاً فوقتاً متعدِد واقعات اُن کو اسلام سے متاثّر کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اپنی بہن کے گھر میں اُن کے دل پر وہ آخری ضرب لگی جس نے ان کو ایمان کی منزل پر پہنچا دیا۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۂ مریم۔ جلد پنجم، دیباچہ سورۂ واقعہ)

موضوع اور مضمون اِس کا پہلا رُکوع آخرت کے بیان میں ہے، اور دوسرا رکوع قرآن کے مُنزّل مِنَ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کے بارے میں۔

پہلے رُکوع کا آغاز اِس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آ کر رہنی ہے۔ پھر آیت ۴ سے ۱۲ تک یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا ہے، وہ آخرِ کار خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہی ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۷ تک قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی۔ پھر آیت ۱۸ سے ۳۷ تک وہ اصل مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد نوعِ انسانی کے لیے ایک دوسری زندگی مقدّر فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اُس روز تمام انسان اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں اُن کا کوئی راز چھُپا نہ رہ جائے گا۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی تھی کہ ایک دن انھیں اپنے رب کو اپنا حساب دینا ہے، اور جنھوں نے دنیا کی زندگی میں نیک عمل کر کے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے پیشگی سامان کر لیا تھا، وہ اپنا حساب پاک دیکھ کر خوش ہو جائیں گے اور انھیں جنت کا ابدی عیش نصیب ہوگا۔ اِس کے برعکس جن لوگوں نے نہ خدا کا حق مانا نہ بندوں کا حق ادا کیا، انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ جہنّم کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

دوسرے رُکوع میں کفارِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اِس قرآن کو ایک شاعر اور کاہن کا کلام کہتے ہو، حالانکہ یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے جو ایک رسولِ کریم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ رسول اِس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس میں اپنی من گھڑت کوئی چیز شامل کر دے تو ہم اُس کی رگِ گردن (یا رگِ دل) کاٹ دیں۔ یہ ایک یقینی برحق کلام ہے، اور جو لوگ اسے جھٹلائیں گے، انھیں آخرِ کار پچھتانا پڑے گا۔

آیاتہا ۵۲ رکوعاتہا ۲

سُوْرَةُ الْحَاۗقَّةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاۗقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۳ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵

ہونی شُدنی[1]! کیا ہے وہ ہونی شُدنی؟ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شُدنی؟[2]
ثمود[3] اور عاد نے اُس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت[4] کو جُھٹلایا۔ تو ثمود ایک سخت حادثے[5] سے ہلاک کیے گئے،

---

۱ – اصل میں لفظ اَلْحَاۗقَّةُ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: وہ واقعہ جس کو لازماً پیش آ کر رہنا ہے، جس کا آنا برحق ہے، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجایش نہیں۔ قیامت کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا اور پھر کلام کا آغاز ہی اس سے کرنا خود بخود یہ ظاہر کرتا ہے کہ مُخاطَب وہ لوگ ہیں جو اُس کے آنے کو جُھٹلا رہے تھے۔ اُن کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جس چیز کی تم تکذیب کر رہے ہو، وہ ہونی شُدنی ہے، تمھارے انکار سے اُس کا آنا رُک نہیں جائے گا۔

۲ – یکے بعد دیگرے یہ دو سوالات سامعین کو چونکانے کے لیے کیے گئے ہیں، تاکہ وہ بات کی اہمیت کو سمجھیں اور پوری توجہ کے ساتھ آگے کی بات سُنیں۔

۳ – کفارِ مکہ چونکہ قیامت کو جُھٹلا رہے تھے اور اُس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے، اس لیے پہلے اُن کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شُدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آ کر رہے گی۔ اِس کے بعد اب اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ معاملہ صرف اِتنا سادہ سا معاملہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعے کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اَخلاق اور پھر اُن کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اِسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جُھٹلا دیا کہ انسان کو آخرِ کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اَخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آ کر دُنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔

۴ – اصل لفظ اَلْقَارِعَةُ ہے۔ قَرع عَرَبی زبان میں ٹھوکنے، کُوٹنے، کھڑکھڑا دینے، اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لیے یہ دوسرا لفظ اُس کی ہولناکی کا تصوُّر دلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۵ – سورۂ اَعراف، آیت ۷۸ میں اس کو اَلرَّجْفَةُ (زبردست زلزلہ) کہا گیا ہے۔ سورۂ ہُود، آیت ۶۷ میں

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ
وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا ۙ فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ
نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾ فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾ وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ
قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾ فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَهُمۡ
اَخۡذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِى الۡجَارِيَةِ ۙ﴿۱۱﴾ لِنَجۡعَلَهَا لَكُمۡ

اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن اُن پر مُسلّط رکھا۔ (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمھیں باقی بچا نظر آتا ہے؟

اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے اور تل پٹ ہو جانے والی بستیوں[٦] نے کیا۔ ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اُس نے اُن کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔

جب پانی کا طوفان حد سے[٧] گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا،[٨] تاکہ اِس واقعے کو تمھارے

اس کے لیے اَلصَّیْحَۃُ (زور کے دھماکے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ، آیت ١٧ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کو صٰعِقَۃُ الْعَذَابِ (عذاب کے کڑکے) نے آلیا۔ اور یہاں اُسی عذاب کو اَلطَّاغِیَۃ (حد سے زیادہ سخت حادثہ) سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ ایک ہی واقعے کی مختلف کیفیّات کا بیان ہے۔

٦ – مراد ہیں قوم لُوط کی بستیاں، جن کے متعلق سورۂ ہود (آیت ٨٢) اور سورۂ حِجر (آیت ٧٤) میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

٧ – اشارہ ہے طوفانِ نوح کی طرف جس میں ایک پوری قوم اِسی خطائے عظیم کی بنا پر غرق کر دی گئی اور صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جنھوں نے اللہ کے رسول کی بات مان لی تھی۔

٨ – اگرچہ کشتی میں سوار وہ لوگ کیے گئے تھے جو ہزاروں برس پہلے گزر چکے تھے، لیکن چونکہ بعد کی پوری انسانی نسل انھی لوگوں کی اولاد ہے جو اُس وقت طوفان سے بچائے گئے تھے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے تم کو کشتی

تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱۵ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝۱۶ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى

لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں۔[9]

پھر[10] جب ایک دفعہ صُور میں پھونک ماردی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، اُس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اُس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ فرشتے اس کے اطراف و جوانب

میں سوار کرا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم آج دنیا میں اِسی لیے موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس طوفان میں صرف منکرین کو غرق کیا تھا اور ایمان لانے والوں کو بچا لیا تھا۔

۹- یعنی وہ کان نہیں جو سُنی اَن سُنی کر دیں اور جن کے پردے پر سے آواز اُچٹ کر گزر جائے، بلکہ وہ کان جو سُنیں اور بات کو دل تک اُتار دیں۔ یہاں بظاہر کان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر مراد ہیں سننے والے لوگ جو اس واقعے کو سُن کر اُسے یاد رکھیں، اُس سے عبرت حاصل کریں اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ آخرت کے انکار اور خدا کے رسول کی تکذیب کا انجام کیسا ہولناک ہوتا ہے۔

۱۰- آگے آنے والی آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے، اور کہیں سب کو سمیٹ کر پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نمل آیت ۸۷ میں پہلے نفخِ صُور کا ذکر کیا گیا ہے جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اُس وقت نظامِ عالَم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۂ حج آیات ۱-۲، سورۂ یٰسین آیات ۴۹ - ۵۰، اور سورۂ تکویر آیات ۱-۶ میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ زُمَر آیات ۶۷ تا ۷۰ میں دوسرے اور تیسرے نفخِ صُور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب پھر صُور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۂ طٰہٰ آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲، سورۂ انبیاء آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳، سورۂ یٰسین آیات ۵۱ تا ۵۳، اور سورۂ قٓ آیات ۲۰ تا ۲۲ میں صرف تیسرے نفخِ صور کا ذکر ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷)

اَرْجَآئِهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ ﴿۱۹﴾ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ ﴿۲۱﴾ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ ﴿۲۲﴾

میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اُس روز تیرے رب کا عرش اپنے اُوپر اُٹھائے ہوئے ہوں گے[11]۔ وہ دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمھارا کوئی راز بھی چُھپا نہ رہ جائے گا۔

اُس وقت جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا[12]: "لو دیکھو، پڑھو میرا نامۂ اعمال[13]، میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے[14]۔" پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا، عالی مقام جنت

لیکن یہاں اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نَفخِ صُور سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک قیامت کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلے میں بیان کر دیا گیا ہے۔

۱۱ – یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعیّن کرنا مشکل ہے۔ ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر یہ بات بہر حال قابلِ تصوُّر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوگا اور آٹھ فرشتے اس کو عرش سمیت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا، اور ذاتِ باری کا جو تصور ہم کو قرآنِ مجید میں دیا گیا ہے، وہ بھی یہ خیال کرنے میں مانع ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مقام سے مُنزّہ ہستی کسی جگہ متمکّن ہو اور کوئی مخلوق اُسے اٹھائے۔ اِس لیے کھوج کرید کر کے اِس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو گمراہی کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرماں روائی اور اس کے معاملات کا تصوّر دلانے کے لیے لوگوں کے سامنے وہی نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دنیا میں بادشاہی کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو انسانی زبانوں میں سلطنت اور اس کے مظاہر و لوازم کے لیے مستعمل ہیں، کیونکہ انسانی ذہن اسی نقشے اور انھی اصطلاحات کی مدد سے کسی حد تک کائنات کی سُلطانی کے معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اصل حقیقت کو انسانی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے ہے۔ اس کو بالکل لفظی معنوں میں لے لینا دُرست نہیں ہے۔

۱۲ – سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اُس کا حساب بے باق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ

قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا هَنِيۡٓــئًا ۢ بِمَاۤ اَسۡلَفۡتُمۡ فِى الۡاَيَّامِ الۡخَـالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُوۡتَ كِتٰبِيَهۡ ۚ ﴿۲۵﴾ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِيَهۡ ۚ ﴿۲۶﴾ يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ ۚ ﴿۲۷﴾

میں، جس کے پھلوں کے گُچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ایسے لوگوں سے کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے اُن اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا[15] وہ کہے گا: "کاش! میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا[16] اور مَیں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے[17]۔ کاش! میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کُن ہوتی[18]۔

کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدانِ حشر میں حاضری تک اُس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا، اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہو چکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآنِ مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالَم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اسی وقت سے صالحین کی حالت و کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور کفار و منافقین اور مجرمین کی حالت و کیفیت کچھ اور۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الانفال، آیت ۵۰۔ النحل، آیات ۲۸ و ۳۲، مع حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، آیت ۹۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، آیات ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۴ تا ۱۲۶، مع حواشی ۷۹، ۸۰، ۱۰۷۔ الانبیاء، آیت ۱۰۳، مع حاشیہ ۹۸۔ الفرقان، آیت ۲۴، مع حاشیہ ۳۸۔ النمل، آیت ۸۹، مع حاشیہ ۱۰۹۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۵۱، مع حاشیہ ۷۲۔ یٰسٓ، آیات ۲۶، ۲۷، مع حواشی ۲۲، ۲۳۔ المومن، آیات ۴۵، ۴۶، مع حاشیہ ۶۳۔ جلد پنجم، محمدؐ، آیت ۲۷، مع حاشیہ ۳۷۔ ق، آیات ۱۹ تا ۲۳، مع حواشی ۲۲، ۲۳، ۲۵)

۱۳ — یعنی نامۂ اعمال ملتے ہی وہ خوش ہو جائے گا اور اپنے ساتھیوں کو دکھائے گا۔ سورۂ اِنشقاق، آیت ۹ میں بیان ہوا ہے کہ "وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹے گا۔"

مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ؕ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ﴿۳۴﴾

آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا۔[19]'' (حکم ہوگا:) پکڑو اِسے اور اِس کی گردن میں طَوق ڈال دو، پھر اِسے جہنّم میں جھونک دو، پھر اِس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔[20]

۱۴- یعنی وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ وہ دنیا میں آخرت سے غافل نہ تھا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ ایک روز اُسے خدا کے حُضور حاضر ہونا اور اپنا حساب دینا ہے۔

۱۵- سورۂ انشقاق میں فرمایا گیا ہے: ''اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔'' غالباً اِس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس نامۂ اعمال میں اس کا کیا کچّا چِٹّھا درج ہے، اس لیے وہ نہایت بددلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اُسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔

۱٦- یعنی مجھے یہ نامۂ اعمال دے کر میدانِ حشر میں علانیہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کیا جاتا اور جو سزا بھی دینی تھی دے ڈالی جاتی۔

۱۷- یعنی مجھے نہ بتایا جاتا کہ میں دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہوں۔ دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے کبھی یہ نہ جانا تھا کہ حساب کیا بلا ہوتی ہے، مجھے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ ایک دن مجھے اپنا حساب بھی دینا ہوگا اور میرا سب کیا کرایا میرے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

۱۸- یعنی دنیا میں مرنے کے بعد میں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا ہوتا اور کوئی دوسری زندگی نہ ہوتی۔

۱۹- اصل الفاظ ہیں: هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ۔ سلطان کا لفظ دلیل و حُجّت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اقتدار کے لیے بھی۔ اگر اُسے دلیل و حُجّت کے معنٰی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو دلیل بازیاں مَیں کیا کرتا تھا، وہ یہاں نہیں چل سکتیں، میرے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے اب کوئی حجت نہیں رہی۔ اور اقتدار کے معنٰی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ دنیا میں جس طاقت کے بَل بُوتے پر میں اکڑتا تھا، وہ یہاں ختم ہو چکی ہے۔ اب یہاں کوئی میرا لشکر نہیں، کوئی میرا حکم ماننے والا نہیں، میں ایک بے بس اور لاچار بندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں جو اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یارِ غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھووَن کے سوا اِس کے لیے کوئی کھانا، جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔[۲۰]

پس نہیں،[۲۱] میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور اُن کی بھی جنھیں تم نہیں دیکھتے، یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے،[۲۲] کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔[۲۳]

۲۰ – یعنی خود کسی غریب کو کھانا کھلانا تو درکنار، کسی سے یہ کہنا بھی پسند نہ کرتا تھا کہ خدا کے بھوکے بندوں کو روٹی دے دو۔

۲۱ – یعنی تم لوگوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے، بات وہ نہیں ہے۔

۲۲ – یہاں رسولِ کریم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سورۂ تکویر (آیت ۱۹) میں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ کفارِ مکہ جبریلؑ کو نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔ بخلاف اس کے سورۂ تکویر میں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحبِ عرش کے ہاں بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو روشن اُفق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ نجم آیات ۵ تا ۱۰ میں جبریل علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریلؑ کا قول کس معنیٰ میں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضوؐر کی زبان سے اور حضوؐر اسے جبریلؑ کی زبان سے سُن رہے تھے، اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضوؐر کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریلؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریلؑ کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے، بلکہ پیغام بر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔[۲۴]

۲۳ - "کم ہی ایمان لاتے ہو" کا ایک مطلب عربی محاورے کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے، اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کو سُن کر کسی وقت تمھارا دل خود پکار اُٹھتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا، مگر پھر تم اپنی ضد پر اَڑ جاتے ہو اور اس پر ایمان لانے سے انکار کردیتے ہو۔

۲۴ - حاصلِ کلام یہ ہے کہ جو کچھ تمھیں نظر آتا ہے اور جو کچھ تم کو نظر نہیں آتا، اُس سب کی قسم میں اِس بات پر کھاتا ہوں کہ یہ قرآن کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے، جو ایک ایسے رسول کی زبان سے ادا ہو رہا ہے جو کریم (نہایت معزز اور شریف) ہے۔ اب دیکھیے کہ یہ قسم کس معنیٰ میں کھائی گئی ہے۔ جو کچھ لوگوں کو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ:

(۱) اِس کلام کو ایک ایسا شخص پیش کر رہا تھا جس کا شریف النفس ہونا مکہ کے معاشرے میں کسی سے چھپا ہوا نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ اَخلاقی حیثیت سے یہ اُن کی قوم کا بہترین آدمی ہے۔ ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ لے کر اُٹھ کھڑا ہوگا کہ خدا پر بہتان باندھے اور اپنے دل سے ایک بات گھڑ کر اُسے خداوندِ عالَم کی طرف منسوب کردے۔

(۲) وہ یہ بھی عَلانیہ دیکھ رہے تھے کہ اِس کلام کو پیش کرنے میں اپنا کوئی ذاتی مفاد اُس شخص کے پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ یہ کام کر کے تو اُس نے اپنے مفاد کو قربان کردیا ہے۔ اپنی تجارت کو برباد کیا۔ اپنے عیش و آرام کو تج دیا۔ جس معاشرے میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، اُسی میں گالیاں کھانے لگا۔ اور نہ صرف خود بلکہ اپنے بال بچوں تک کو ہر قسم کے مصائب میں مبتلا کرلیا۔ ذاتی مفاد کا خواہش مند ان کانٹوں میں اپنے آپ کو کیوں گھسیٹتا؟

(۳) اُن کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اُنھی کے معاشرے میں سے جو لوگ اُس شخص پر ایمان لا رہے تھے، ان کی زندگی میں یک لخت ایک انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ کسی شاعر یا کاہن کے کلام میں یہ تاثیر آخر کب دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں ایسی زبردست اَخلاقی تبدیلی پیدا کردے اور اس کے ماننے والے اُس کی خاطر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟

(۴) اُن سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے۔ ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کون یہ کہہ سکتا تھا کہ قرآن کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے۔ (اس پر مفصّل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۔ جلد چہارم، الشُّعراء، حواشی ۱۴۲ تا ۱۴۵۔ اور جلد پنجم، الطّور،

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر اس (نبی) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اِس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اِس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔[25]

حاشیہ ۲۲ میں کر چکے ہیں)۔

(۵) یہ بات بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ پورے عرب میں کوئی شخص ایسا فصیح و بلیغ نہ تھا جس کا کلام قرآن کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو۔ اُس کے برابر تو درکنار، اس کے قریب تک کسی کی فصاحت وبلاغت نہیں پہنچتی تھی۔

(۶) اُن سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بھی اپنی ادبی شان کے لحاظ سے قرآن کی ادبی شان سے بہت مختلف تھی۔ کوئی اہلِ زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تقریر، اور قرآن کو سُن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہیں۔

(۷) قرآن جن مضامین اور عُلوم پر مشتمل تھا، دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی مکہ کے لوگوں نے کبھی وہ باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہ سنی تھیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اِن معلومات کے حُصول کا کوئی ذریعہ آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ اِسی وجہ سے آپؐ کے مخالفین اگر یہ الزامات لگاتے بھی تھے کہ آپؐ کہیں سے خفیہ طریقے پر یہ معلومات حاصل کرتے ہیں تو مکہ میں کوئی شخص اُن کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷، اور جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲ میں کر چکے ہیں)۔

(۸) زمین سے لے کر آسمان تک اس عظیم الشان کارخانہ ہستی کو بھی وہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس میں ایک زبردست حکیمانہ قانون اور ہمہ گیر نظم وضبط کارفرما نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں اُس شرک اور انکارِ آخرت کے لیے کوئی شہادت نہیں پائی جاتی تھی جس کے اہلِ عرب معتقد تھے، بلکہ ہر طرف توحید اور آخرت ہی کی صداقت کے شواہد ملتے تھے جسے قرآن پیش کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ تو وہ دیکھ رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ نہیں دیکھ رہے تھے، وہ یہ تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور فرماں روا ہے، کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنا رسول مقرر کیا ہے، اور اُن پر اللہ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ اِن دونوں قسم کے حقائق کی قسم کھا کر وہ بات کہی گئی ہے

وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿٤٩﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٠﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٥٢﴾ ع

ع ۱۵ ۲

درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے[26]۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جُھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجبِ حسرت ہے[27]۔ اور یہ بالکل یقینی حق ہے۔ پس اے نبیؐ! اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ ع

جو اوپر کی آیات میں ارشاد ہوئی ہے۔

۲۵- اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ نبی کو اپنی طرف سے وحی میں کوئی کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو سخت سزا دیں۔ مگر اِس بات کو ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے جس سے آنکھوں کے سامنے یہ تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کا مقرر کردہ افسر اُس کے نام سے کوئی جَعَل سازی کرے تو بادشاہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کا سر قلم کر دے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ غلط اِستدلال کیا ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے، اُس کی رگِ دل یا رگِ گردن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے تو یہ اُس کے نبی ہونے کا ثبوت ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے، وہ سچے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدّعی تو نبوت ہی نہیں، خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور زمین پر مدّتوں دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (اس مسئلے پر مفصّل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ یُونُس، حاشیہ ۲۳ میں کر چکے ہیں)۔

۲۶- یعنی قرآن اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو غلط روی اور اُس کے بُرے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳)

۲۷- یعنی آخرِکار انھیں اس بات پر پچھتانا پڑے گا کہ انھوں نے کیوں اس قرآن کی تکذیب کی۔

تفہیم القرآن

اَلمَعَارِج

(۷۰)

المَعَارِج

نام تیسری آیت کے لفظ ذِی الْمَعَارِج سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نزُول بھی قریب قریب اُنھی حالات میں ہوا ہے جن میں سورۂ الحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں اُن کُفّار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمھیں جھٹلا کر ہم عذابِ جہنّم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اِس سورت کی ساری تقریر اِسی چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتدا میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اور جب وہ واقع ہو گا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر واقع ہو گا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لٰہذا اِن کے مذاق اڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت، جس کے جلدی لے آنے کا مطالبہ یہ لوگ ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں، کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو اِن مجرمین کا کیسا برا حشر ہو گا۔ اُس وقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو فدیے میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ نکلیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔

اِس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر اُن کے عقیدے اور اَخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ موڑا ہے اور مال سمیٹ کر اور سَینت سَینت کر رکھا ہے، وہ جہنّم کے مستحق ہوں گے۔ اور جنھوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے، اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، امانت میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی پر قائم رہے ہیں، وہ جنت میں عزّت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکہ کے اُن کُفّار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپؐ کا مذاق اڑانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ ان کے تمسخر کی پروا نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلت دیکھنے پر مُصِر ہیں تو انھیں اپنے بیہودہ مشغلوں میں پڑا رہنے دیں، اپنا بُرا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

---

۴۴ آیاتہا — سُوۡرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ — ۲ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوۡحُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِیۡنَ

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے[1]، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عُروج کے زینوں کا مالک ہے[2]۔ ملائکہ اور رُوح[3] اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں[4] ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس

۱- اصل الفاظ ہیں: سَاَلَ سَآئِلٌ۔ بعض مفسرین نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب، جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کس پر واقع ہوگا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہوگا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے اور مطالبہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ نَسائی اور دوسرے محدثین نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نضر بن حارث بن کَلَدہ نے کہا تھا: اَللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَیۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (الانفال، آیت ۳۲) "خدایا! اگر یہ واقعی تیری ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔" اس کے علاوہ متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں کفارِ مکہ کے اِس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو، وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: یُونُس، آیات ۴۶ تا ۴۸۔ الانبیاء، ۳۶ تا ۴۱۔ النمل، ۶۷ تا ۷۲۔ سبا، ۲۶ تا ۳۰۔ یٰسین، ۴۵ تا ۵۲۔ الملک، ۲۴ تا ۲۷۔

۲- اصل میں لفظ ذِی الۡمَعَارِجِ استعمال ہوا ہے۔ مَعارِج مَعرَج کی جمع ہے جس کے معنی زینے، یا سیڑھی، یا ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اُوپر چڑھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و برتر ہے اور اس کے حضور باریاب ہونے کے لیے فرشتوں کو پے در پے بلندیوں سے گزرنا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۳- روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ملائکہ سے الگ اُن کا ذکر اُن کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ سورۂ شُعَراء میں فرمایا گیا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ عَلٰی قَلۡبِكَ (اس قرآن کو روحِ امین لے کر تمہارے

اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيۡلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ

ہزار سال ہے۔[۵] پس اے نبیؐ! صبر کرو، شایستہ صبر۔[۶] یہ لوگ اُسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ

دل پر نازل ہوئے ہیں)۔ اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ (کہو کہ جو شخص جبریل کا اس لیے دشمن ہو کہ اس نے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے......)۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہی ہیں۔

۴- یہ سارا مضمون متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ ہم نہ فرشتوں کی حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آ سکتی ہے کہ وہ زینے کیسے ہیں جن پر فرشتے چڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی خاص مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان و مکان کی قُیود سے مُنزّہ ہے۔

۵- سورۂ حج، آیت ۴۷ میں ارشاد ہوا ہے: ''یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔'' سورۂ السجدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے: ''وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر (اُس کی رُوداد) اُوپر اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔'' اور یہاں عذاب کے مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ جو لوگ مذاق کے طور پر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کی باتوں پر صبر کریں، اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اُس کو دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ اِن سب ارشادات پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگ اپنے ذہن اور اپنے دائرۂ فکر و نظر کی تنگی کے باعث خدا کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور انھیں سو پچاس برس کی مدت بھی بڑی لمبی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اسکیم ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اور یہ مدّت بھی محض بطورِ مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کروڑوں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔ انھی منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوعِ انسانی کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ فُلاں ساعتِ خاص تک یہاں اِس نوع کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع ہوا، کتنی مدت اس کی تکمیل کے لیے طے کی گئی ہے، کون سی ساعت اس کے اختتام کے لیے مقرر کی گئی ہے جس پر قیامت برپا کی جائے گی، اور کون سا وقت اِس غرض کے لیے رکھا گیا ہے کہ آغازِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بیک وقت اُٹھا کر اُن کا

قَرِيبًا ۝٧ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝٨ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝٩ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝١٠ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ

رہے ہیں[7]۔ (وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس[8] روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے[9] گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔[10] اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔[11] مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے

حساب لیا جائے۔ اِس منصوبے کے صرف اُس حصّے کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں جو ہمارے سامنے گزر رہا ہے، یا جس کے گزشتہ ادوار کی کوئی جُزوی سی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے۔ رہا اُس کا آغاز و انجام، تو اسے جاننا تو درکنار، اسے سمجھنا بھی ہمارے بس سے باہر ہے، کجا کہ ہم اُن حکمتوں کو سمجھ سکیں جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہیں۔ اب جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اِس منصوبے کو ختم کر کے اِس کا انجام فوراً اُن کے سامنے لے آیا جائے، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اُسے اِس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ انجام کی بات ہی سرے سے غلط ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، حواشی ۹۲ – ۹۳۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۹)

۶ – یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایانِ شان ہے۔

۷ – اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ یہ لوگ اُسے بعید از امکان سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک وہ قریب الوقوع ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو بڑی دُور کی چیز سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں وہ اِس قدر قریب ہے گویا کل پیش آنے والی ہے۔

۸ – مفسرین میں سے ایک گروہ نے اِس فقرے کا تعلق فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ سے مانا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کی مدّت جس دن کی بتائی گئی ہے اُس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مُسندِ احمد اور تفسیر ابنِ جَریر میں حضرت ابو سعید خُدریؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس آیت کے متعلق عرض کیا گیا کہ وہ تو بڑا ہی طویل دن ہوگا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں جتنا وقت لگتا ہے مومن کے لیے وہ دن اس سے بھی زیادہ ہلکا ہو گا۔" یہ روایت اگر صحیح سند سے منقول ہوتی تو پھر اس کے سوا اِس آیت کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کی سند میں درّاج اور اس کے شیخ ابو الہیثم، دونوں ضعیف ہیں۔

۹ – یعنی بار بار رنگ بدلے گا۔

عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿١٣﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿١٤﴾ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿١٦﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿١٨﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ

بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا، اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں! وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف بُلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔[۱۲]

انسان تھُڑدِلا پیدا کیا گیا ہے،[۱۳] جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی

۱۰ – چونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں، اس لیے جب وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اور بے وزن ہو کر اُڑنے لگیں گے تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے رنگ برنگ کا دُھنکا ہوا اون اُڑ رہا ہو۔

۱۱ – یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے۔ نہیں، ہر ایک آنکھوں سے دیکھ رہا ہو گا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہو گی۔

۱۲ – یہاں بھی سورۂ الحاقّہ، آیات ۳۳-۳۴ کی طرح آخرت میں آدمی کے بُرے انجام کے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک، حق سے انحراف اور ایمان لانے سے انکار۔ دوسرے دنیا پرستی اور بخل، جس کی بنا پر آدمی مال جمع کرتا ہے اور اسے کسی بھلائی کے کام میں خرچ نہیں کرتا۔

۱۳ – جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ ”یہ بات انسان کی سرشت میں ہے“، یا ”یہ انسان کی فطری کمزوری ہے“، اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ”انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے“۔ اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں بکثرت مواقع پر نوعِ انسانی کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست اختیار کر لینے والے لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آرہا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں

الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿۲۱﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۲۲﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۲۳﴾
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِينَ

نصیب ہوتی ہے تو بُخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عَیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں[۱۴]، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں[۱۵]، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے[۱۶]، جو

نا قابلِ تغیُّر و تبدُّل نہیں ہیں، بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے عملاً کوشش کرے تو وہ اِن کو دُور کر سکتا ہے، اور اگر وہ نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ اُس کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۴۱۔ جلد چہارم، الزُمَر، حواشی ۲۳-۲۸، الشُوریٰ، حاشیہ ۷۵)

۱۴- کسی شخص کا نماز پڑھنا لازماً یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب اور آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہے اور اپنے اِس ایمان کے مطابق عمل بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۵- یعنی کسی قسم کی سُستی اور آرام طَلَبی، یا مصروفیت، یا دلچسپی اُن کی نماز کی پابندی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب نماز کا وقت آجائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے خدا کی عبادت بجالانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ کے ایک اور معنٰی حضرت عُقبہؓ بن عامر نے یہ بیان کیے ہیں کہ وہ پورے سکون اور خُشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ کوّے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے، مارا مار پڑھ کر کسی نہ کسی طرح نماز سے فارغ ہو جانے کی کوشش نہیں کرتے، اور نماز کے دوران میں اِدھر اُدھر التفات بھی نہیں کرتے۔ عربی محاورے میں ٹھیرے ہوئے پانی کو ماءِ دائم کہا جاتا ہے۔ اُسی سے یہ تفسیر ماخوذ ہے۔

۱۶- سورۂ ذاریات، آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ ''اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔'' اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ ''ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔'' بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مقرر حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے، کیونکہ اُسی میں نصاب اور شرح، دونوں چیزیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر اس بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے کہ سورۂ معارج بالاتفاق مکّی ہے، اور زکوٰۃ ایک مخصوص نصاب اور شرح کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔ اس لیے مقرر حق کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصّہ طے کر رکھا ہے جسے وہ اُن کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ یہی معنٰی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مجاہد، شَعْبی اور ابراہیم نَخعی نے بیان کیے ہیں۔

سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں، بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے۔ اور

يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ إِلَّا عَلٰٓى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ

روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں[۱۷]، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں[۱۸]، کیونکہ اُن کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں[۱۹] ـــــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے، جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں[۲۰] ـــــ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا

محروم سے مراد ایسا شخص ہے جو بے روزگار ہو، یا روزی کمانے کی کوشش کرتا ہو مگر اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو، یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق جب معلوم ہو جائے کہ وہ واقعی محروم ہیں تو ایک خدا پرست انسان اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ اس سے مدد مانگیں، بلکہ اُن کی محرومی کا علم ہوتے ہی وہ خود آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ ذاریات، حاشیہ ۱۷)

۱۷- یعنی دنیا میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں سمجھتے، بلکہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

۱۸- بالفاظِ دیگر، ان کا حال کفّار کی طرح نہیں ہے جو دنیا میں ہر قسم کے گناہ اور جرائم اور ظلم وستم کر کے بھی خدا سے نہیں ڈرتے، بلکہ وہ اپنی حد تک اَخلاق اور اعمال میں نیک رَوِیّہ اختیار کرنے کے باوجود خدا سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ اندیشہ اُن کو لاحق رہتا ہے کہ کہیں خدا کی عدالت میں ہماری کوتاہیاں ہماری نیکیوں سے بڑھ کر نہ نکلیں اور ہم سزا کے مستحق نہ قرار پا جائیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۵۴۔ جلد پنجم، الذاریات، حاشیہ ۱۹)

۱۹- شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد زنا سے پرہیز بھی ہے اور عُریانی سے پرہیز بھی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۶۔ النور، حواشی ۳۰-۳۲۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۲)

رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾

ع ۲۵

پاس کرتے ہیں،[۲۱] جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں،[۲۲] اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔[۲۳] یہ لوگ عزت کے ساتھ جنّت کے باغوں میں رہیں گے۔ ؏

پس اے نبیؐ! کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمھاری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں؟[۲۴]

۲۰- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۷۔

۲۱- امانتوں سے مراد وہ امانتیں بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سُپرد کی ہیں اور وہ امانتیں بھی جو انسان کسی دوسرے انسان پر اعتماد کر کے اس کے حوالے کرتا ہے۔ اِسی طرح عہد سے مراد وہ عہد بھی ہیں جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور وہ عہد بھی جو بندے ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی امانتوں اور دونوں قسم کے عہد و پیمان کا پاس و لحاظ ایک مومن کی سیرت کے لازمی خصائص میں سے ہے۔ حدیث میں حضرت اَنَس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے جو تقریر بھی فرماتے، اس میں یہ بات ضرور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ الا، لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ ولا دین لمن لا عھد لہٗ۔ ”خبردار رہو، جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔“ (بَیْہَقی فی شُعَبُ الایمان)

۲۲- یعنی نہ شہادت چھپاتے ہیں، نہ اس میں کوئی کمی بیشی کرتے ہیں۔

۲۳- اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس بلند سیرت و کردار کے لوگ خدا کی جنت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں، ان کی صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع اور اسی پر ختم کیا گیا ہے۔ نمازی ہونا اُن کی پہلی صفت ہے، نماز کا ہمیشہ پابند رہنا ان کی دوسری صفت، اور نماز کی حفاظت کرنا اُن کی آخری صفت۔ نماز کی حفاظت سے بہت سی چیزیں مراد ہیں: وقت پر نماز ادا کرنا۔ نماز سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ جسم اور کپڑے پاک ہیں۔ باوضو ہونا اور وضو میں اعضا کو اچھی طرح دھونا۔ ارکان اور واجبات اور مستحباتِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔ نماز کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا۔ خدا کی نافرمانیاں کر کے اپنی نمازوں کو ضائع نہ کرنا۔ یہ سب چیزیں نماز کی حفاظت میں شامل ہیں۔

۲۴- یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اُڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ

کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنّت میں داخل کر دیا جائے گا؟[۲۵] ہرگز نہیں۔ ہم نے جس چیز سے اِن کو پیدا کیا ہے اُسے یہ خود جانتے ہیں[۲۶]۔ پس نہیں[۲۷]، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی[۲۸]،

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو اُن لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سننا تک گوارا نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبا دینے کے لیے یوں دوڑے چلے آ رہے ہیں، جنت کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات ۳۴-۴۱ بھی پیشِ نظر رکھنی چاہییں جن میں کفارِ مکہ کو اُن کی اِس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو وہاں وہ اُسی طرح مزے کریں گے جس طرح دنیا میں کر رہے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اُسی طرح خستہ حال رہیں گے جس طرح آج دنیا میں ہیں۔

۲۶ – اِس مقام پر اِس فقرے کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: مضمونِ سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس مادّے سے یہ لوگ بنے ہیں، اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادّہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادّۂ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اُس کے اوصاف کے لحاظ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر اِس فقرے کو بعد کے مضمون کی تمہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں اور جو شخص انھیں ہماری پکڑ سے ڈراتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ ہم اِن کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نُطفے کی ایک حقیر سی بُوند سے اِن کی تخلیق کی ابتدا کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اِس خلقت پر یہ غور کرتے تو انھیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ اب یہ ہماری گرفت سے باہر ہو گئے ہیں، یا ہم انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۲۷ – یعنی بات وہ نہیں ہے جو انھوں نے سمجھ رکھی ہے۔

۲۸ – یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اِس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے سے طُلوع اور نئے زاویے پر غُروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔

إِنَّا لَقَٰدِرُونَ ﴿٤٠﴾ عَلَىٰٓ أَن نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٤١﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا۟ وَيَلْعَبُوا۟ حَتَّىٰ يُلَٰقُوا۟ يَوْمَهُمُ ٱلَّذِى يُوعَدُونَ ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ ٱلْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿٤٣﴾ خَٰشِعَةً أَبْصَٰرُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ ٱلْيَوْمُ ٱلَّذِى كَانُوا۟ يُوعَدُونَ ﴿٤٤﴾ ع

ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ اِن سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔[29] لہٰذا اِنھیں اپنی بیہودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے، جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دَوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں۔[30] اِن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلّت اِن پر چھا رہی ہوگی۔ وہ دن ہے جس کا اِن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ع

ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ اِس بنا پر سورۂ شُعَراء، آیت ۲۸، اور سورۂ مُزّمّل، آیت ۹ میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں، کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کُرے پر سورج غُروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طُلوع ہوتا ہے۔ اس بنا پر سورۂ رحمٰن، آیت ۱۷ میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الرحمٰن، حاشیہ ۱۷)

۲۹- یہ ہے وہ بات جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رب المشارق والمغارب ہونے کی قسم کھائی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم چونکہ مشرقوں اور مغربوں کے مالک ہیں، اس لیے پوری زمین ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے اور ہماری گرفت سے بچ نکلنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں تمھیں ہلاک کر سکتے ہیں اور تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھا سکتے ہیں جو تم سے بہتر ہو۔

۳۰- اصل الفاظ ہیں: اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ۔ نُصُب کے معنیٰ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض نے اس سے مراد بُت لیے ہیں اور اُن کے نزدیک اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ داورِ محشر کی مقرر کی ہوئی جگہ کی طرف اِس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے آج وہ اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ نشان لیے ہیں جو دَوڑ کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے لگائے جاتے ہیں، تاکہ ہر ایک دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

تفہیم القرآن

نوح

(۷۱)

نوح

نام ''نوح'' اِس سورت کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں از اوّل تا آخر حضرت نوح علیہ السلام ہی کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول یہ بھی مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون کی داخلی شہادت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کے مقابلے میں کفارِ مکہ کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصّہ محض قصّہ گوئی کی خاطر بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس سے مقصود کفارِ مکہ کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی رَویّہ اختیار کر رہے ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم نے اختیار کیا تھا، اور اِس رَویّے سے اگر تم باز نہ آئے تو تمھیں بھی وہی انجام دیکھنا پڑے گا جو اُن لوگوں نے دیکھا۔ یہ بات پوری سورت میں کہیں صاف الفاظ میں نہیں کہی گئی ہے، لیکن جس موقع پر اور جن حالات میں یہ قصّہ اہلِ مکہ کو سنایا گیا ہے اُس پسِ منظر میں خود بخود یہ مضمون اس سے مُترشّح ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر مامور فرمایا تھا، اُس وقت کیا خدمت اُن کے سُپرد کی گئی تھی۔

آیات ۲-۴ میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کیا اور اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا بات پیش کی۔

پھر مدت ہائے دراز تک دعوت و تبلیغ کی زحمتیں اُٹھانے کے بعد جو رُوداد حضرت نوح علیہ السّلام نے اپنے رب کے حضور پیش کی، وہ آیات ۵-۲۰ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں وہ عرض کرتے ہیں کہ کس کس طرح انھوں نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کا مقابلہ کس ہٹ دھرمی سے کیا۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی آخری گزارش آیات ۲۱-۲۴ میں درج کی گئی ہے، جس میں وہ اپنے رب سے عرض کرتے ہیں کہ یہ قوم میری بات قطعی طور پر ردّ کر چکی ہے، اِس نے اپنی نکیل

اپنے رئیسوں کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور انھوں نے بہت بڑا مکر کا جال پھیلا رکھا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ اِن لوگوں سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جائے۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ صدیوں تک انتہائی صبر آزما حالات میں تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب وہ اپنی قوم سے پُوری طرح مایوس ہو گئے تو انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ اب اِس قوم کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ یہ رائے ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے اپنے فیصلے کے مطابق تھی۔ چنانچہ اس کے متصلاً بعد آیت ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُس قوم پر اُس کے کرتُوتوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہو گیا۔

آخری آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا درج کی گئی ہے جو انھوں نے عین نُزولِ عذاب کے وقت اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس میں وہ اپنے لیے اور سب اہلِ ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اور اپنی قوم کے کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو زمین پر بسنے کے لیے جیتا نہ چھوڑا جائے، کیونکہ ان کے اندر اب کوئی خیر باقی نہیں رہی ہے، ان کی نسل سے جو بھی اٹھے گا کافر اور فاجر ہی اٹھے گا۔

اس سورہ کا مطالعہ کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کے قصّے کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو اِس سے پہلے قرآنِ مجید میں بیان ہو چکی ہیں۔ مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونُس، ۷۱، ۷۳۔ ہود، ۲۵ تا ۴۹۔ المومنون، ۲۳ تا ۳۱۔ الشُّعراء ۱۰۵ تا ۱۲۲۔ العنکبوت، ۱۴، ۱۵۔ الصافّات، ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، ۹ تا ۱۶۔

---

۲۸ آیاتہا — سُورَةُ نُوحٍ مَكِّيَّةٌ — ۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝١ قَالَ يَٰقَوْمِ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝٢ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ۝٣ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے[1]۔

اس نے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو[2]، اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا[3] اور تمھیں ایک وقتِ مقرر تک باقی رکھے گا[4]۔

۱- یعنی اُن کو اِس بات سے آگاہ کر دے کہ جن گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں میں وہ مبتلا ہیں وہ اُن کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا دیں گی اگر وہ اُن سے باز نہ آئے، اور ان کو بتا دے کہ اُس عذاب سے بچنے کے لیے انھیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۲- یہ تین باتیں تھیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ ایک، اللہ کی بندگی۔ دوسرے، تقویٰ۔ تیسرے، رسول کی اطاعت۔ اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی بندگی و عبادت چھوڑ کر اور صرف اللہ ہی کو اپنا معبود تسلیم کر کے اُسی کی پرستش کرو اور اُسی کے احکام بجا لاؤ۔ تقویٰ کا مطلب یہ تھا کہ اُن کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کے موجب ہیں، اور اپنی زندگی میں وہ رَوِش اختیار کرو جو خدا ترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ رہی تیسری بات کہ ''میری اطاعت کرو''، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اُن احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمھیں دیتا ہوں۔

۳- اصل الفاظ ہیں: يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ۔ اس فقرے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تمھارے گناہوں میں سے بعض کو معاف کر دے گا، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر تم اُن تین باتوں کو قبول کر لو جو تمھارے سامنے پیش کی جا رہی ہیں، تو اب تک جو گناہ تم کر چکے ہو، اُن سب سے وہ درگزر فرمائے گا۔ یہاں مِنْ تبعیض کے لیے

وقف لازم

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا[5]۔ کاش! تمھیں اس کا علم ہو[6]۔"

اُس[7] نے عرض کیا: "اے میرے رب! مَیں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا، مگر میری پکار نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا[8]۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تُو انھیں معاف کر دے[9]، انھوں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک

نہیں بلکہ عَنْ کے معنیٰ میں ہے۔

۴- یعنی اگر تم نے یہ تین باتیں مان لیں تو تمھیں دنیا میں اُس وقت تک جینے کی مہلت دے دی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طبعی موت کے لیے مقرر کیا ہے۔

۵- اِس دوسرے وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ نے کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ اِس کے متعلق متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی قوم کے حق میں نزولِ عذاب کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے، اُس کے بعد وہ ایمان بھی لے آئے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا۔

۶- یعنی اگر تمھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ میرے ذریعے سے اللہ کا پیغام پہنچ جانے کے بعد اب جو وقت گزر رہا ہے، یہ دراصل ایک مہلت ہے جو تمھیں ایمان لانے کے لیے دی جا رہی ہے، اور اس مہلت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد پھر خدا کے عذاب سے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے، تو تم ایمان لانے میں جلدی کرو گے اور نزولِ عذاب کا وقت آنے تک اس کو ٹالتے نہ چلے جاؤ گے۔

۷- بیچ میں ایک طویل زمانے کی تاریخ چھوڑ کر اب حضرت نوح علیہ السّلام کی وہ عرضداشت نقل کی جا رہی ہے جو انھوں نے اپنی رسالت کے آخری دَور میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی۔

۸- یعنی جتنا جتنا مَیں اُن کو پکارتا گیا، اتنے ہی زیادہ وہ دُور بھاگتے چلے گئے۔

۹- اِس میں خود بخود یہ مضمون شامل ہے کہ وہ نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر معافی کے طلب گار ہوں، کیونکہ

ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۟ ۚ ثُمَّ اِنِّىْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۟ۙ ثُمَّ اِنِّىْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۟ۙ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۟ۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۟ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۟ؕ مَا لَكُمْ

لیے[10] اور اپنی رَوِش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا[11]۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے عَلانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے[12] گا۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ

اِسی صورت میں اُن کو اللہ تعالیٰ سے معافی مل سکتی تھی۔

۱۰ – منہ ڈھانکنے کی غرض یا تو یہ تھی کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات سننا تو درکنار، آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، یا پھر یہ حرکت وہ اس لیے کرتے تھے کہ آپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے منہ چھپا کر نکل جائیں اور اِس کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ آپ اُنھیں پہچان کر اُن سے بات کرنے لگیں۔ یہ ٹھیک وہی طرزِ عمل تھا جو کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رہے تھے۔ سورۂ ہود آیت ۵ میں اُن کے اِس رَوِیّے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ’’دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ رسول سے چھُپ جائیں۔ خبردار! جب یہ اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانکتے ہیں تو اللہ اِن کے کھُلے کو بھی جانتا ہے اور چھُپے کو بھی، وہ تو دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے۔‘‘ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حواشی ۵-۶)

۱۱ – تکبُّر سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے، تو یہ تکبُّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو رَدّ کرنا ہو گا۔

۱۲ – یہ بات قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ خدا سے بغاوت کی رَوِش صرف آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے، اور اس کے برعکس اگر کوئی قوم نافرمانی کے بجائے ایمان و تقویٰ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کر لے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں ہے بلکہ دنیا میں

لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ اَلَمْ تَرَوْا

اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟[13] حالانکہ اُس نے طرح طرح سے تمھیں بنایا ہے۔[14] کیا دیکھتے نہیں ہو

بھی اُس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: ’’اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔‘‘ (آیت ۱۲۴) سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے: ’’اور اگر اِن اہلِ کتاب نے تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں تو اِن کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔‘‘ (آیت ٦٦) سورۂ اَعراف میں فرمایا: ’’اور اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔‘‘ (آیت ۹٦) سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: ’’اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔‘‘ (آیت ۵۲) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بھی اِسی سورۂ ہود میں اہلِ مکہ کو مُخاطَب کر کے یہ بات فرمائی گئی: ’’اور یہ کہ اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مقرر وقت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا۔‘‘ (آیت ۳) حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں سے فرمایا کہ ’’ایک کلمہ ہے جس کے تم قائل ہو جاؤ تو عرب وعجم کے فرماں روا ہو جاؤ گے۔‘‘ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۹٦۔ جلد دوم، ہود، حواشی ۳ و ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، دیباچہ سورۂ ص)

قرآنِ مجید کی اِسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف اِستِغفار پر اکتفا فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔ فرمایا: میں نے آسمان کے اُن دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے، اور پھر سورۂ نوحؑ کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ (ابنِ جَریر و ابنِ کثیر) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حَسَن بصری کی مجلس میں ایک شخص نے خشک سالی کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا: اللہ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی، تیسرے نے کہا: میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا: میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو وہ یہی جواب دیتے چلے گئے کہ استغفار کرو۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ سب کو مختلف شکایتوں کا ایک ہی علاج بتا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب میں سورۂ نوحؑ کی یہ آیات سنا دیں۔ (کشّاف)

۱۳ – مطلب یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور سرداروں کے بارے میں تو تم یہ سمجھتے ہو کہ

كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع

کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور اُن میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اُگایا،[15] پھر وہ تمھیں اِسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اِس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا، تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔"ع

ان کے وقار کے خلاف کوئی حرکت کرنا خطرناک ہے، مگر خداوندِ عالَم کے متعلق تم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بھی کوئی باوقار ہستی ہوگا۔ اُس کے خلاف تم بغاوت کرتے ہو، اُس کی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہو، اُس کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہو، اور اس سے تمھیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اس کی سزا دے گا۔

۱۴- یعنی تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمھیں موجودہ حالت پر لایا ہے۔ پہلے تم ماں اور باپ کی صُلب میں الگ الگ نُطفوں کی شکل میں تھے۔ پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمھارا استقرارِ حمل ہوا۔ پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بتدریج نَشْوونَما دے کر تمھیں پوری انسانی شکل دی گئی اور تمھارے اندر تمام وہ قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمھیں درکار تھیں۔ پھر ایک زندہ بچے کی صورت میں تم بطنِ مادر سے باہر آئے اور ہر آن تمھیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی، یہاں تک کہ تم جوانی اور کُہولت کی عمر کو پہنچے۔ اِن تمام منازل سے گزرتے ہوئے تم ہر وقت پوری طرح خدا کے بس میں تھے۔ وہ چاہتا تو تمھارا استقرارِ حمل ہی نہ ہونے دیتا اور تمھاری جگہ کسی اور شخص کا استقرار ہوتا۔ وہ چاہتا تو ماں کے پیٹ ہی میں تمھیں اندھا، بہرا، گونگا، یا اپاہج بنا دیتا، یا تمھاری عقل میں کوئی فتور رکھ دیتا۔ وہ چاہتا تو تم زندہ بچے کی صورت میں پیدا ہی نہ ہوتے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ تمھیں ہر وقت ہلاک کر سکتا تھا، اور اس کے ایک اشارے پر کسی وقت بھی تم کسی حادثے کے شکار ہو سکتے تھے۔ جس خدا کے بس میں تم اس طرح بے بس ہو، اُس کے متعلق تم نے یہ کیسے سمجھ رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جا سکتی ہے، اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامی اور احسان فراموشی کی جا سکتی ہے، اس کے خلاف ہر قسم کی بغاوت

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًاۚ ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًاۚ ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ نَسْرًاۚ ﴿۲۳﴾ وَ قَدْ

نوحؑ نے کہا: "میرے رب! انھوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔[16] انھوں نے کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو وَدّ اور سُواع کو، اور نہ یَغُوث اور یَعُوق اور نَسر کو۔[17] انھوں نے

کی جا سکتی ہے اور اِن حرکتوں کا کوئی خمیازہ تمھیں بھگتنا نہیں پڑے گا۔

۱۵- یہاں زمین کے مادّوں سے انسان کی پیدایش کو نباتات کے اُگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کسی وقت اِس کُرے پر نباتات موجود نہ تھیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کو اُگایا، اسی طرح ایک وقت تھا جب رُوئے زمین پر انسان کا کوئی وجود نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی پَود لگائی۔

۱۶- مکر سے مراد اُن سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوحؑ کی تعلیمات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوحؑ تمھی جیسا ایک آدمی ہے، کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آئی ہے۔ (الاعراف: ۶۳۔ ہود: ۲۷) نوحؑ کی پیروی تو ہمارے اَراذِل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے۔ (ہود: ۲۷) خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا۔ (المؤمنون: ۲۴) اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو اِس کے پاس خزانے ہوتے، اِس کو علمِ غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا۔ (ہود: ۳۱) نوحؑ اور اس کے پیرووں میں آخر کون سی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے۔ (ہود: ۲۷) یہ شخص دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے۔ (المؤمنون: ۲۴) اِس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اِسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ (المؤمنون: ۲۵) قریب قریب یہی باتیں تھیں جن سے قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو بہکایا کرتے تھے۔

۱۷- قومِ نوحؑ کے معبودوں میں سے یہاں اُن معبودوں کے نام لیے گئے ہیں جنھیں بعد میں اہلِ عرب نے بھی پُوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ اُن کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے، ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قومِ نوحؑ کے قدیم معبودوں کا ذکر سُنا ہو گا

اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اور تُو بھی اِن ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔[18]"

اور جب اَز سرِ نَو اُن کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہوگی تو انھی معبُودوں کے بُت بنا کر انھوں نے پھر انھیں پُوجنا شروع کر دیا ہوگا۔

وَدّ قبیلۂ قُضاعہ کی شاخ بنی کَلْب بن وَبَرہ کا معبُود تھا، جس کا استھان انھوں نے دُومۃ الجَندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَّم اَبَم (وَدّ باپو) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کَلْبی کا بیان ہے کہ اس کا بُت ایک نہایت عظیم الجُثّہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبدِ وُدّ ملتا ہے۔

سُواع قبیلۂ ہُذَیل کی دیوی تھی اور اس کا بُت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ یَنْبُوع کے قریب رُہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

یَغُوث قبیلۂ طَے کی شاخ اَنْعُم اور قبیلۂ مَذحِج کی بعض شاخوں کا معبُود تھا۔ مَذحِج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جُرَش کے مقام پر اس کا بُت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عَبدِ یَغُوث ملتا ہے۔

یَعُوق یمن کے علاقۂ ہَمدان میں قبیلۂ ہَمدان کی شاخ خَیوان کا معبُود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

نَسر حِمْیَر کے علاقے میں قبیلۂ حِمْیَر کی شاخ آلِ ذوالکُلاع کا معبُود تھا اور بَلْخَع کے مقام پر اس کا بُت نصب تھا، جس کی شکل گِدھ کی تھی۔ سَبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نَسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بَیتِ نَسور، اور اس کے پُجاریوں کو اہلِ نَسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متّصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گِدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

۱۸- جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی یہ بددعا کسی بے صبری کی بنا پر نہ تھی، بلکہ یہ اُس وقت اُن کی زبان سے نکلی تھی جب صدیوں تک تبلیغ کا حق ادا کرنے کے بعد وہ اپنی قوم سے پُوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ایسے ہی حالات میں حضرت موسیٰؑ نے بھی فرعون اور قومِ فرعون کے حق میں یہ بددعا کی تھی کہ "پروردگار! اِن کے مال غارت کر دے اور اِن کے دلوں پر ایسی مُہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں، جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں"، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: "تمھاری دعا قبول کی گئی" (یونُس، آیات ۸۸-۸۹)۔ حضرت موسیٰؑ کی طرح حضرت نوحؑ کی یہ بددعا بھی عین منشاۓ الٰہی کے مطابق تھی۔ چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوا ہے: وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ

اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیے گئے،[19] پھر انھوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا۔[20] اور نوحؑ نے کہا: ”میرے رب! اِن کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تُو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اِن کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔ میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور ہر

اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ”اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اُن کے سوا اب اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔“ (ہود ۳۶)

۱۹ - یعنی غرق ہونے پر ان کا قصہ تمام نہیں ہوگیا، بلکہ مرنے کے بعد فوراً ہی ان کی روحیں آگ کے عذاب میں مبتلا کر دی گئیں۔ یہ بعینہٖ وہی معاملہ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ سورۂ مومن، آیات ۴۵-۴۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۶۳) یہ آیت بھی اُن آیات میں سے ہے جن سے برزخ کا عذاب ثابت ہوتا ہے۔

۲۰ - یعنی اپنے جن معبودوں کو وہ اپنا حامی و مددگار سمجھتے تھے، ان میں سے کوئی بھی انھیں بچانے کے لیے نہ آیا۔ یہ گویا تنبیہ تھی اہلِ مکہ کے لیے کہ تم بھی اگر خدا کے عذاب میں مبتلا ہو گئے تو تمھارے یہ معبود، جن پر تم بھروسا کیے بیٹھے ہو، تمھارے کسی کام نہ آئیں گے۔

دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝۲۸ ع

النصف ع ۲ / ۸

اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے، اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرمادے، اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر۔'' ع

تفہیم القرآن

الجن

(۷۲)

الجن

نام "الجن" اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضامین کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں جنّوں کے قرآن سُن کر جانے اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول بخاری اور مُسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازارِ عُکاظ تشریف لے جارہے تھے، راستے میں نَخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی، اُس وقت جنّوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سُن کر وہ ٹھیر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ اِسی واقعے کا ذکر اس سورہ میں کیا گیا ہے۔

اکثر مفسرین نے اِس روایت کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سفرِ طائف کا واقعہ ہے جو ہجرت سے تین سال پہلے ۱۰ نبوی میں پیش آیا تھا۔ لیکن یہ قیاس متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ طائف کے اُس سفر میں جنّوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اُس کا قصہ سورۂ اَحقاف، آیات ۲۹-۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن آیات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر جو جن قرآنِ مجید سُن کر ایمان لائے تھے، وہ پہلے سے حضرت موسیٰؑ اور سابق کُتُبِ آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اِس سورہ کی آیات ۲-۷ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس موقع پر قرآن سننے والے جن مشرکین اور منکرینِ آخرت و رسالت میں سے تھے۔ پھر یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے اُس سفر میں حضرت زیدؓ بن حارِثہ کے سوا اور کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف اِس کے، اس سفر کے متعلق ابنِ عباسؓ فرمارہے ہیں کہ اِس میں چند صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ مزید برآں روایات اِس بات پر بھی متفق ہیں کہ اُس سفر میں جنّوں نے قرآن اُس وقت سنا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ واپس تشریف لاتے ہوئے نَخلہ میں ٹھیرے تھے۔ اور اس سفر میں ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق جنّوں کے قرآن سُننے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپ مکہ سے عُکاظ تشریف لے جارہے تھے۔ اِن وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ

سورۂ اَحقاف اور سورۂ جن میں ایک ہی واقعے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ دو الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

جہاں تک سورۂ اَحقاف کا تعلق ہے، اُس میں جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بارے میں روایات متفق ہیں کہ وہ ۱۰ نبوی کے سفرِ طائف میں پیش آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دوسرا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا، اِس کا کوئی جواب ہمیں ابنِ عباسؓ کی روایت سے نہیں ملتا، نہ کسی اور تاریخی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عُکاظ کے بازار میں کب تشریف لے گئے تھے۔ البتہ اِس سورہ کی آیات ۸-۱۰ پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نبوّت کے ابتدائی دَور کا واقعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اِن آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت سے پہلے جن عالَمِ بالا کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمان میں سُن گُن لینے کا کوئی نہ کوئی موقع پا لیتے تھے، مگر اس کے بعد یکایک انھوں نے دیکھا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پہرے لگ گئے ہیں اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے کہیں اُن کو ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں ٹھیر کر وہ کوئی بِھنک پاسکیں۔ اِس سے اُن کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ زمین میں ایسا کیا واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کے لیے یہ سخت انتظامات کیے گئے ہیں۔ غالباً اُسی وقت سے جنوں کے بہت سے گروہ اِس تلاش میں پھرتے رہے ہوں گے اور اُن میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن سُن کر یہ رائے قائم کی ہوگی کہ یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر جنوں پر عالَمِ بالا کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

جِنّ کی حقیقت

اِس سورہ کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے، تاکہ ذہن کسی الجھن کے شکار نہ ہوں۔ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پُرانے زمانے کے اَوہام وخُرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ یہ رائے انھوں نے کچھ اِس بِنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور انھیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ مگر اُنھوں نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو اُن کو محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اِس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ

محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیے، وہ دراصل خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اختیار کرلیا جائے تو ایک جن ہی کیا، انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اُس کے تجربے اور مُشاہدے میں نہ آتی ہو اور اُس کے لیے خدا تک کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے، کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ اِس طرزِ فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے، انھوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنھیں شیطان کہا گیا ہے، اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سُنا کرتے تھے۔ لیکن قرآنِ مجید کے ارشادات اس معاملے میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ اِن تاویلات کے لیے اُن کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اِس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔ ہود، ۱۱۹۔ حٰمٓ السجدہ، آیات ۲۵ و ۲۹۔ الاَحقاف، ۱۸۔ الذّاریات، ۵۶۔ النّاس، ۶۔ اور سورۂ رحمٰن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جِنّوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجایش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورۂ اَعراف، آیت ۱۲، سورۂ حِجر، آیات ۲۶-۲۷، اور سورۂ رحمٰن، آیات ۱۴-۱۵ میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹّی ہے اور جِنّوں کا مادۂ تخلیق آگ۔

سورۂ حِجر، آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے۔ اِسی بات پر قصۂ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورۂ کہف، آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سورۂ اَعراف، آیت ۲۷ میں بالفاظِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان اُن کو نہیں دیکھتے۔

سورۂ حِجر، آیات ۱۶-۱۸، سورۂ صافّات، آیات ۶-۱۰، اور سورۂ مُلک، آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالَمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اُس سے اُوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انھیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے

سُن گُن لیں تو شہابِ ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اِس سے مشرکینِ عرب کے اِس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں، یا خدائی کے اَسرار تک انھیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اِسی غلط خیال کی تردید سورۂ سَبا، آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ، آیت ۳۰-۳۴ اور سورۂ کہف، آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں، جن کی ایک مثال ہمیں سورۂ نمل آیت ۷ میں ملتی ہے، لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں، اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت وَمعصیت اور کفروایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اِس پر ابلیس کا قصّہ اور سورۂ اَحقاف اور سورۂ جن میں بعض جِنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اُسی وقت سے شیاطینِ جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اُس پر مُسلط ہو کر زبردستی اُس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اُس کے دل میں وَسوَسے ڈالتے ہیں، اُس کو بہکاتے ہیں اور بدی وگمراہی کو اس کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات مُلاحظہ ہوں: النساء، ۱۱۷ تا ۱۲۰۔ الاَعراف، ۱۱ تا ۱۷۔ ابراہیم، ۲۲۔ الحجر ۳۰ تا ۴۲۔ النحل، ۹۸ تا ۱۰۰۔ بنی اسرائیل، ۶۱ تا ۶۵۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکینِ عرب زمانۂ جاہلیت میں جِنوں کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے، اُن کی عبادت کرتے تھے، اور اُن کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ مُلاحظہ ہو: الاَنعام، آیت ۱۰۰۔ سَبا، آیات ۴۰-۴۱۔ الصّافات، ۱۵۸۔

اِن تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ اُن کی پُراَسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصوُّرات قائم کر رکھے ہیں، حتّٰی کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی گئی ہے، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

موضوع اور مباحث

اِس سورہ میں پہلی آیت سے لے کر آیت ۱۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآنِ مجید سُن کر اُس کا کیا اثر لیا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے دوسرے جنوں سے کیا کیا باتیں کہیں۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی ساری گفتگو نقل نہیں کی ہے، بلکہ صرف وہ خاص خاص باتیں نقل فرمائی ہیں جو قابلِ ذکر تھیں۔ اسی لیے طرزِ بیان ایک مسلسل گفتگو کا سا نہیں ہے، بلکہ اُن کے مختلف فقروں کو اِس طرح نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ جنوں کی زبان سے نکلے ہوئے اِن فقروں کو اگر آدمی بغور پڑھے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اُن کے ایمان لانے کے اِس واقعے اور اپنی قوم کے ساتھ اُن کی اِس گفتگو کا ذکر قرآن میں کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے حواشی میں ان کے اقوال کی جو تشریحات کی ہیں، وہ اِس کا مقصد سمجھنے میں مزید مددگار ہوں گی۔

اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ تک لوگوں کو فہمایش کی گئی ہے کہ وہ شرک سے باز آ جائیں اور راہِ راست پر ثابت قدمی کے ساتھ چلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہوگی، ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفارِ مکہ کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول دعوت الی اللہ کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اِس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالانکہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے، وہ اِس بات کا مدّعی نہیں ہے کہ لوگوں کو نفع یا نقصان پہنچا دینا اُس کے اختیار میں ہے۔ پھر آیات ۲۴-۲۵ میں کفار کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسول کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے۔ وہ وقت دُور ہے یا قریب، رسولؐ کو اس کا علم نہیں ہے، مگر بہر حال اسے آنا ضرور ہے۔ آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسولؐ کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ یہ علم اُن اُمور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائضِ رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں، اور یہ علم ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

---

۲۸ آیاتہا — سُوۡرَۃُ الۡجِنِّ مَکِّیَّۃٌ — ۲ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾

اَے نبیؐ! کہو: میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جِنّوں کے ایک گروہ نے غور سے سُنا[1]، پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا:

"ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے[2] جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں[3] گے۔"

۱- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر نہیں آ رہے تھے اور آپؐ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن سُن رہے ہیں، بلکہ بعد میں وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعے کی خبر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی اِس قصّے کو بیان کرتے ہوئے صراحت فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے سامنے قرآن نہیں پڑھا تھا، نہ آپؐ نے ان کو دیکھا تھا۔" (مسلم، ترمذی، مُسندِ احمد، ابنِ جَریر)

۲- اصل الفاظ ہیں: قُرۡاٰنًا عَجَبًا۔ قرآن کے معنٰی ہیں: "پڑھی جانے والی چیز"، اور یہ لفظ غالباً جنوں نے اِسی معنٰی میں استعمال کیا ہوگا، کیونکہ وہ پہلی مرتبہ اس کلام سے متعارف ہوئے تھے اور شاید اُس وقت اُن کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ جو چیز وہ سُن رہے ہیں اس کا نام قرآن ہی ہے۔ عَجَب مبالغے کا صیغہ ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں بہت زیادہ حیرت انگیز چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس جنوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسا کلام سُن کر آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن نہ صرف یہ کہ انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ ان کی زبان بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام جن تمام انسانی زبانیں جانتے ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن میں سے جو گروہ زمین کے جس علاقے میں رہتے ہوں، اُسی علاقے کے لوگوں کی زبان سے وہ واقف ہوں۔ لیکن قرآن کے اِس بیان سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جن جنھوں نے اُس وقت قرآن سنا تھا، وہ عربی زبان اتنی اچھی جانتے تھے کہ انھوں نے اِس کلام کی بے مثل بَلاغت کو بھی محسوس کیا اور اُس کے بلند پایہ مضامین کو بھی خوب سمجھ لیا۔

وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۝۳ وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ

اور یہ کہ "ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے، اُس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے[۴]۔"

اور یہ کہ "ہمارے نادان لوگ[۵] اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتے رہے ہیں۔"

اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے[۶]۔"

اور یہ کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جِنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے،

۳- اس سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک، یہ کہ جن اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے منکر نہیں ہیں۔ دوسرے، یہ کہ ان میں بھی مشرکین پائے جاتے ہیں جو مشرک انسانوں کی طرح اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے ہیں، چنانچہ جنوں کی یہ قوم جس کے افراد قرآن سُن کر گئے تھے، مُشرک ہی تھی۔ تیسرے، یہ کہ نبوت اور کُتبِ آسمانی کے نُزول کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوا ہے، بلکہ ان میں سے جو جن بھی ایمان لاتے ہیں، وہ انسانوں میں آنے والے انبیاؑ اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ہی ایمان لاتے ہیں۔ یہی بات سورۂ احقاف، آیات ۲۹-۳۱ سے بھی معلوم ہوتی ہے، جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ جن جنھوں نے اُس وقت قرآن سُنا تھا، حضرت موسیٰؑ کے پیروؤں میں سے تھے اور انھوں نے قرآن سُننے کے بعد اپنی قوم کو دعوت دی تھی کہ اب جو کلام خدا کی طرف سے پچھلی کُتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے اُس پر ایمان لاؤ۔ سورۂ رحمٰن بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اُس کا پورا مضمون ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مُخاطَب انسان اور جن دونوں ہیں۔

۴- اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک، یہ کہ یہ جن یا تو عیسائی جنوں میں سے تھے، یا ان کا کوئی اور مذہب تھا جس میں اللہ تعالیٰ کو بیوی بچوں والا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآنِ پاک کا کوئی ایسا حصّہ پڑھ رہے تھے جسے سُن کر ان کو اپنے عقیدے کی غَلَطی معلوم ہوگئی اور انھوں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی بلند و برتر ذات کی طرف بیوی بچوں کو منسوب کرنا سخت جہالت اور گستاخی ہے۔

مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿٦﴾ وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ﴿٧﴾ وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا

اِس طرح اُنھوں نے جِنّوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا۔[۶]"

اور یہ کہ "انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمھارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔[۸]" اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی

۵- اصل میں لفظ سَفِيْهُنَا استعمال کیا گیا ہے، جو ایک فرد کے لیے بھی بولا جا سکتا ہے اور ایک گروہ کے لیے بھی۔ اگر اِسے ایک نادان فرد کے معنیٰ میں لیا جائے تو مراد ابلیس ہوگا، اور اگر ایک گروہ کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنوں میں بہت سے احمق اور بے عقل لوگ ایسی باتیں کہتے تھے۔

۶- یعنی اُن کی غلط باتوں سے ہمارے گمراہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ انسان یا جن، اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنے کی جرأت بھی کر سکتے ہیں، لیکن اب یہ قرآن سُن کر ہمیں معلوم ہو گیا کہ فی الواقع وہ جھوٹے تھے۔

۷- ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیّت کے زمانے میں جب عرب کسی سُنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے: "ہم اِس وادی کے مالک جن کی پناہ مانگتے ہیں۔" عہدِ جاہلیّت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً: اگر کسی جگہ پانی اور چارا ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدّو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارا مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اُترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے کہ "ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں۔" ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوئی ٹھیر جائے تو وہ جن یا تو خود ستاتا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ اسی بات کی طرف یہ ایمان لانے والے جن اشارہ کر رہے ہیں۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین کے خلیفہ انسان نے اُلٹا ہم سے ڈرنا شروع کر دیا اور خدا کو چھوڑ کر وہ ہم سے پناہ مانگنے لگا تو ہماری قوم کے لوگوں کا دماغ اَور زیادہ خراب ہو گیا، ان کا کبر و غرور اور کفر و ظلم اور زیادہ بڑھ گیا، اور وہ گمراہی میں زیادہ جری ہو گئے۔

۸- اصل الفاظ ہیں: اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ اِس فقرے کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "اللہ کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے گا۔" چونکہ الفاظ جامع ہیں اس لیے ان کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنّوں میں بھی رسالت اور آخرت دونوں کا

وَّ شُهُبًا ۙ﴿۸﴾ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ

بارش ہو رہی ہے۔" اور یہ کہ "پہلے ہم سُن گُن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے، مگر اب جو چوری چھپے سُننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہابِ ثاقب لگا ہُوا پاتا ہے۔[9]"

اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی بُرا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اُن کا رب انھیں راہِ راست دکھانا چاہتا ہے۔[10]"

اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں، ہم مختلف طریقوں میں

انکار پایا جاتا تھا۔ لیکن آگے کے مضمون کی مناسبت سے پہلا مفہوم ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اس میں یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تمھارا یہ خیال غلط نکلا کہ اللہ کسی رسول کو مبعوث کرنے والا نہیں ہے، آسمانوں کے دروازے ہم پر اسی وجہ سے بند کیے گئے ہیں کہ اللہ نے ایک رسول بھیج دیا ہے۔

۹- یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر یہ جن اِس تلاش میں نکلے تھے کہ آخر زمین پر ایسا کیا معاملہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کی خبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس قدر سخت انتظامات کیے گئے ہیں کہ اب ہم عالَمِ بالا میں سُن گُن لینے کا کوئی موقع نہیں پاتے اور جدھر بھی جاتے ہیں مار بھگائے جاتے ہیں۔

۱۰- اس سے معلوم ہوا کہ عالَمِ بالا میں اِس قسم کے غیر معمولی انتظامات دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اُس کی بِھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا اور تحفظ کے اِن انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں اُن میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے اور شہابوں کی اِس بارش کا مشاہدہ کیا تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی

قِدَدًا ۝١١ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝١٢ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۝١٣ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ

بٹے ہوئے ہیں۔[11]"

اور یہ کہ "ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اُسے ہرا سکتے ہیں۔[12]"

اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سُنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا، اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہو گا۔[13]"

اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔

صورت درپیش ہے۔ آیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی قوم پر یکایک عذاب نازل کر دیا ہے؟ یا کہیں کوئی رسول مبعوث ہوا ہے؟ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے عذاب نازل نہیں کیا ہے بلکہ خَلق کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرما دیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۷۔ جلد ششم، الملک، حاشیہ ۱۱)

۱۱ - یعنی اخلاقی حیثیت سے بھی ہم میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں، اور اعتقادات میں بھی ہمارا کوئی ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ہم مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ یہ بات کہہ کر یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے جنوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم راہِ راست معلوم کرنے کے یقیناً محتاج ہیں، اِس سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۲ - مطلب یہ ہے کہ ہمارے اِسی خیال نے ہمیں نجات کی راہ دکھا دی۔ ہم چونکہ اللہ سے بے خوف نہ تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہ سکیں گے، اس لیے جب وہ کلام ہم نے سُنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ راست بتانے آیا تھا تو ہم یہ جرأت نہ کر سکے کہ حق معلوم ہو جانے کے بعد بھی اُنھی عقائد پر جمے رہتے جو ہمارے نادان لوگوں نے ہم میں پھیلا رکھے تھے۔

۱۳ - حق تلفی سے مراد یہ ہے کہ اپنی نیکی پر وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ اور ظلم یہ ہے کہ اُسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے اور جو قصور اس سے سرزد ہوں، ان کی زیادہ سزا دے ڈالی جائے، یا بلا قصور

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ

تو جنھوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کرلیا انھوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی، اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنّم کا ایندھن بننے والے ہیں۔[۱۴]''

اور[۱۵] (اے نبیؐ! کہو: مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے کہ) لوگ اگر راہِ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انھیں خوب سیراب کرتے[۱۶] تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں۔[۱۷] اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے[۱۸] گا اس کا ربّ اُسے

ہی کسی کو عذاب دے دیا جائے۔ کسی ایمان لانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اِس قسم کی کسی بے انصافی کا خوف نہیں ہے۔

۱۴- سوال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی رُو سے جن تو خود آتشیں مخلوق ہیں، پھر جہنّم کی آگ سے ان کو کیا تکلیف ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے تو آدمی بھی مٹّی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹی کا ڈھیلا کھینچ مارا جائے تو اس کو چوٹ کیوں لگتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پُورا جسم اگرچہ زمین کے مادّوں سے بنا ہے، مگر جب اُن سے گوشت پوست کا زندہ انسان وجود میں آجاتا ہے تو وہ ان مادّوں سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے اور انھی مادّوں سے بنی ہوئی دوسری چیزیں اس کے لیے اذیّت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جن بھی اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آتشیں مخلوق ہیں، لیکن آگ سے جب ایک زندہ اور صاحبِ احساس مخلوق وجود میں آجاتی ہے تو وہی آگ اس کے لیے تکلیف کی موجب بن جاتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الرحمٰن، حاشیہ ۱۵)

۱۵- اُوپر جنوں کی بات ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشادات شروع ہوتے ہیں۔

۱۶- یہ وہی بات ہے جو سورۂ نوح میں فرمائی گئی ہے کہ اللہ سے معافی مانگو تو وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ نوح، حاشیہ ۱۲) پانی کی کثرت کو نعمتوں کی کثرت کے لیے بطورِ کنایہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پانی ہی پر آبادی کا انحصار ہے۔ پانی نہ ہو تو سرے سے کوئی بستی بس ہی نہیں سکتی، نہ انسان کی بنیادی ضروریات فراہم ہوسکتی ہیں، اور نہ انسان کی صنعتیں چل سکتی ہیں۔

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ

سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا اُن میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو[19]۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ[20] اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے[21]۔ اے نبیؐ! کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا[21]۔" کہو: "میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا۔" کہو: "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اُس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ

۱۷- یعنی یہ دیکھیں کہ وہ نعمت پا کر بھی شکر گزار رہتے ہیں یا نہیں، اور ہماری دی ہوئی نعمت کا صحیح استعمال کرتے ہیں یا غلط۔

۱۸- ذِکر سے منہ موڑنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت کو قبول نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کا ذکر سُننا ہی گوارا نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کی عبادت سے رُوگردانی کرے۔

۱۹- مفسرین نے بالعموم "مساجد" کو عبادت گاہوں کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت حَسَن بصری کہتے ہیں کہ زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشا یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ ان کا اِستدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ جعلت لی الارض مسجدا وطھورا۔ "میرے لیے پُوری زمین عبادت کی جگہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔" حضرت سعید بن جُبَیر نے مساجد سے مراد وہ اعضا لیے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے، یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اِس تفسیر کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضا اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، اِن پر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ نہ کیا جائے۔

۲۰- اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِسٰلٰتِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾

پاسکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں[۲۲]۔ اب جو بھی اللہ اور اس کے رسُولؐ کی بات نہ مانے گا، اس کے لیے جہنّم کی آگ ہے، اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں[۲۳] گے۔"

(یہ لوگ اپنی اِس رَوش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا اِن سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم[۲۴] ہے۔

۲۱ - یعنی خدا کو پکارنا تو کوئی قابلِ اعتراض کام نہیں ہے جس پر لوگوں کو اس قدر غصّہ آئے، البتہ بری بات اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کو خدائی میں شریک ٹھیرائے، اور یہ کام میں نہیں کرتا بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا کا نام سُن کر مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔

۲۲ - یعنی میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی خدائی میں میرا کوئی دخل ہے، یا لوگوں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا کوئی اختیار مجھے حاصل ہے۔ میں تو صرف ایک رسول ہوں اور جو خدمت میرے سُپرد کی گئی ہے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات تمھیں پہنچادوں۔ باقی رہے خدائی کے اختیارات، تو وہ سارے کے سارے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانا تو درکنار، مجھے تو خود اپنے نفع و نقصان کا اختیار بھی حاصل نہیں۔ اللہ کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتا، اور اللہ کے دامن کے سوا کوئی ملجا و ماویٰ میرے لیے نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷)

۲۳ - اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور مَعصِیَت کی سزا اَبدی جہنّم ہے، بلکہ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات فرمائی گئی ہے، اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے اس کے لیے اَبدی جہنّم کی سزا ہے۔

۲۴ - اِس آیت کا پَس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کو سنتے ہی آپؐ پر ٹوٹ پڑتے تھے، وہ اِس زُعم میں مبتلا تھے کہ اُن کا جتھا بڑا زبردست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

کہو: "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدّت مقرر فرماتا ہے۔[۲۵] وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مُطّلع نہیں کرتا،[۲۶] سوائے اُس رُسول کے جسے اس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو،[۲۷] تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔[۲۸]

کے ساتھ چند مٹھی بھر آدمی ہیں، اس لیے وہ بآسانی آپؐ کو دبا لیں گے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ رسولؐ کو بے یارومددگار اور اپنے آپ کو کثیر التعداد دیکھ کر حق کی آواز کو دبانے کے لیے بڑے دلیر ہو رہے ہیں، مگر جب وہ بُرا وقت آجائے گا جس سے اِن کو ڈرایا جا رہا ہے، تو ان کو پتا چل جائے گا کہ بے یارومددگار حقیقت میں کون ہے۔

۲۵- اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سوال کا جواب ہے جو سوال نقل کیے بغیر دیا گیا ہے۔ غالباً اوپر کی بات سُن کر مخالفین نے طنز اور مذاق کے طور پر سوال کیا ہوگا کہ وہ وقت جس کا ڈراوا آپؐ دے رہے ہیں، آخر کب آئے گا؟ اِس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے کہو: اُس وقت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کی تاریخ مجھے نہیں بتائی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جلدی آنے والا ہے، یا اس کے لیے ایک طویل مدت مقرر کی گئی ہے۔

۲۶- یعنی غیب کا پورا علم اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور یہ مکمل علمِ غیب وہ کسی کو بھی نہیں دیتا۔

۲۷- یعنی رسول بجائے خود عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ جب اس کو رسالت کا فریضہ انجام دینے کے لیے منتخب فرماتا ہے تو غیب کے حقائق میں سے جن چیزوں کا علم وہ چاہتا ہے اسے عطا فرما دیتا ہے۔

۲۸- محافظوں سے مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی نگہبانی کرنے کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے، تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ یہ وہی بات ہے جو اُوپر آیات ۸-۹ میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے بعد جنوں نے اپنے لیے عالَمِ بالا تک رسائی کے تمام دروازے بند پائے اور انھوں نے دیکھا کہ سخت چوکی پہرے لگ گئے ہیں، جن کے باعث کہیں ذرا سی سُن گُن لینے کا موقع بھی ان کو نہیں ملتا۔

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

ع ۲ / ۱۲

تاکہ وہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے[29]، اور وہ اُن کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے[30]۔'' ع

۲۹ – اس کے تین معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ رسول یہ جان لے کہ فرشتوں نے اُس کو اللہ تعالیٰ کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیغامات اس کے رسول تک صحیح صحیح پہنچا دیے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ رسولوں نے اس کے بندوں تک اپنے رب کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے۔ آیت کے الفاظ اِن تینوں معنوں پر حاوی ہیں اور بعید نہیں کہ تینوں ہی مراد ہوں۔ اِس کے علاوہ یہ آیت دو مزید باتوں پر بھی دلالت کرتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ رسول کو وہ علمِ غیب عطا کیا جاتا ہے جو فریضۂ رسالت کی انجام دِہی کے لیے اس کو دینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو فرشتے نگہبانی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، وہ صرف اِسی بات کی نگہبانی نہیں کرتے کہ رسول تک وحی محفوظ طریقے سے پہنچ جائے، بلکہ اِس بات کی نگہبانی بھی کرتے ہیں کہ رسول اپنے رب کے پیغامات اس کے بندوں تک بے کم و کاست پہنچا دے۔

۳۰ – یعنی رسول پر بھی اور فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس طرح محیط ہے کہ اگر بال برابر بھی وہ اس کی مرضی کے خلاف جنبش کریں تو فوراً گرفت میں آ جائیں۔ اور جو پیغامات اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے ان کا حرف حرف گِنا ہوا ہے رسولوں اور فرشتوں کی یہ مجال نہیں ہے کہ ان میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی کر سکیں۔

تفہیم القرآن

المزمل

(۷۳)

المزّمّل

نام پہلی ہی آیت کے لفظ المُزَّمِّلُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزُول اِس سورت کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔

پہلا رکوع بالاتفاق مکی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکی زندگی کے کس دَور میں نازل ہوا ہے، اس کا جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا، لیکن اِس رُکوع کے مضامین کی داخلی شہادت اِس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے:

اوّلاً، اِس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپؐ راتوں کو اُٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں، تاکہ آپؐ کے اندر نبوّت کے بارِ عظیم کو اٹھانے اور اِس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حضورؐ کی نبوت کے ابتدائی دَور ہی میں نازل ہوا ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس منصب کے لیے آپؐ کی تربیَت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً، اِس میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجُّد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش قرآنِ مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت قرآنِ مجید کا کم از کم اتنا حصّہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قراءت کی جا سکے۔

ثالثاً، اِس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رُکوع اُس زمانے میں نازل ہوا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں آپؐ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ ہی میں نازل ہوا ہے، لیکن بعض دوسرے مفسّرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے، اور اس رکوع کے مضامین سے اِسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں قِتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا، اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

موضوع اور مضامین پہلی سات آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس

کارِ عظیم کا بار آپؐ پر ڈالا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے آپؐ اپنے آپ کو تیار کریں، اور اُس کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ راتوں کو اُٹھ کر آپؐ آدھی آدھی رات، یا اس سے کچھ کم وبیش نماز پڑھا کریں۔

آیت ۸ سے ۱۴ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ سب سے کٹ کر اُس خدا کے ہو رہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ اپنے سارے معاملات اُسی کے سُپرد کر کے مطمئن ہو جائیں۔ مخالفین جو باتیں آپؐ کے خلاف بنا رہے ہیں، ان پر صبر کریں، اُن کے منہ نہ لگیں اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں کہ وہی اُن سے نمٹ لے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۵ سے ۱۹ تک مکہ کے اُن لوگوں کو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے، مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اُسی طرح تمھاری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا، پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ آیا تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلو گے؟

یہ پہلے رکوع کے مضامین ہیں۔ دوسرا رکوع حضرت سعید بن جُبَیر کی روایت کے مطابق اس کے دس سال بعد نازل ہوا اور اس میں نمازِ تہجّد کے متعلق اُس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلق ہے وہ تو جتنی بآسانی پڑھی جا سکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ پنج وقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضۂ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خُلوصِ نیت کے ساتھ صَرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بھلائی کے کام تم دنیا میں انجام دو گے، وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اُن کی حیثیت اُس سامان کی سی ہے جو ایک مسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے سے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤ گے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے، اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اُس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمھیں دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں تمھیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بہت بڑا اجر بھی ملے گا۔

---

۲۰ آیاتہا | سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ | ۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ

اَے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے[1]! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم[2]، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو[3]، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو[4]۔ ہم تم پر ایک

۱- اِن الفاظ کے ساتھ حضورؐ کو مخاطب کرنے اور پھر یہ حکم دینے سے کہ آپؐ اُٹھیں اور راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے رہا کریں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت یا تو آپؐ سو چکے تھے یا سونے کے لیے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ اس موقع پر آپؐ کو اَے نبی، یا اَے رسول کہہ کر خطاب کرنے کے بجائے ''اَے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے'' کہہ کر پکارنا ایک لطیف اندازِ خطاب ہے، جس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اب وہ دَور گزر گیا جب آپؐ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتے تھے۔ اب آپؐ پر ایک کارِ عظیم کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

۲- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصّہ سونے میں صَرف کرو۔ دوسرا، یہ کہ پوری رات نماز میں گزار دینے کا مطالبہ تم سے نہیں ہے، بلکہ آرام بھی کرو اور رات کا ایک قلیل حصّہ عبادت میں بھی صَرف کرو۔ لیکن آگے کے مضمون سے پہلا مطلب ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی کی تائید سورۂ دہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا، ''رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو اور رات کا طویل حصّہ اُس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔''

۳- یہ اُس مقدارِ وقت کی تشریح ہے جسے عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ خواہ آدھی رات نماز میں صَرف کریں، یا اس سے کچھ کم کر دیں، یا اس سے کچھ زیادہ۔ لیکن اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ ترجیح آدھی رات ہے، کیونکہ اُسی کو معیار قرار دے کر کمی و بیشی کا اختیار دیا گیا ہے۔

۴- یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت

عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ

بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔[۵] درحقیقت رات کا اُٹھنا[۶] نفس پر قابو پانے کے لیے بہت[۷] کارگر

پر ٹھیرو، تاکہ ذہن پُوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکّر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قراءت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبُّر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا طریقہ حضرت اَنَسؓ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپؐ اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مَد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری) حضرت اُمِّ سَلَمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے تھے اور ہر آیت پر ٹھیرتے جاتے تھے، مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر رُک جاتے، پھر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر ٹھیرتے اور اس کے بعد رُک کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتے۔ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمِذی) دوسری ایک روایت میں حضرت اُمِّ سَلَمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے تھے۔ (ترمِذی، نَسائی) حضرت حُذَیفہ بن یَمانؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپؐ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دُعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے۔ (مسلم، نَسائی) حضرت ابوذَرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضورؐ اِس مقام پر پہنچے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (اگر تُو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تُو ان کو معاف فرمادے تو تُو غالب اور دانا ہے) تو اسی کو دُہراتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ (مُسندِ احمد، بخاری)

۵- مطلب یہ ہے کہ تم کو رات کی نماز کا یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ایک بھاری کلام ہم تم پر نازل کر رہے ہیں جس کا بار اٹھانے کے لیے تم میں اس کے تحمّل کی طاقت پیدا ہونی ضروری ہے، اور یہ طاقت تمھیں اِسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھو اور آدھی آدھی رات یا کچھ کم و بیش عبادت میں گزارا کرو۔ قرآن کو بھاری کلام اس بنا پر بھی کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدّن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام

کام کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ اور اِس بنا پر بھی اس کو بھاری کلام کہا گیا ہے کہ اس کے نُزول کا تحمّل بڑا دشوار کام تھا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپؐ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مَیں نے سخت سردی کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپؐ کی پیشانی سے اُس وقت پسینا ٹپکنے لگتا تھا۔ (بخاری، مسلم، مالک، ترمِذی، نَسائی) ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپؐ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپؐ اونٹنی پر بیٹھے ہوں تو اُونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کرسکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہوجاتا۔ (مُسندِ احمد، حاکم، ابنِ جَرِیر)

٦ – اصل میں لفظ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ استعمال کیا گیا ہے، جس کے متعلق مفسرین اور اہلِ لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ناشئہ سے مراد نفسِ ناشئہ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں رات کو اٹھنا۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اُٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سو کر اُٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور مجاہدؒ نے اِسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

۷ – اصل میں لفظ اَشَدُّ وَطْاً استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اُس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلُّط حاصل کر کے اپنی اِس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے، وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کرسکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان مُوافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثّر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے اِن اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا، وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں رِیا کاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے، اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے۔

اَقْوَمُ قِيْلًا ۝٦ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝٧ وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝٨ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝٩ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝١٠

اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے[8]۔ دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو[9] اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اُسی کو اپنا وکیل بنا لو[10]۔ اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ[11]۔

۸- اصل میں اَقْوَمُ قِيْلًا ارشاد ہوا ہے، جس کے لغوی معنیٰ ہیں: "قول کو زیادہ راست اور درست بناتا ہے۔" لیکن مدّعا یہ ہے کہ اُس وقت انسان قرآن کو زیادہ سکون و اطمینان اور توجہ کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ ابنِ عباسؓ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اجدر ان یفقه فی القران، یعنی "وہ اِس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی قرآن میں غور و خوض کرے۔" (ابوداؤد)

۹- دن کے اوقات کی مصروفیتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد کہ "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو" خود بخود یہ مفہوم ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام کرتے ہوئے بھی اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہو۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۳)

۱۰- وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اِسی معنی میں ہم اُردو زبان میں وکیل کا لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالے اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اِس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمھارے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات تمھیں پیش آ رہی ہیں، اُن پر کوئی پریشانی تم کو لاحق نہ ہونی چاہیے۔ تمھارا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ تم اپنا معاملہ اُسی کے حوالے کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ اب تمھارا مقدمہ وہ لڑے گا، تمھارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمھارے سارے کام وہ بنائے گا۔

۱۱- الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے

وَ ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝۱۱ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝۱۲ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۳ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝۱۴

اِن جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو[12] اور اِنھیں ذرا کچھ دیر اِسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (اِن کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں[13] اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔ یہ اُس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔[14]

کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو بالکل نظر انداز کر دو، اور ان کی کسی بدتمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ احتراز بھی کسی غم اور غصّے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اُس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سُن کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور دل پر مَیل تک نہیں آنے دیتا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کچھ اِس سے مختلف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی۔ اصل میں تو آپؐ پہلے ہی سے اِسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے، لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ کفار کو بتا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے ایسی باتوں کے جواب میں اپنے رسول کو یہی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

۱۲ – اِن الفاظ میں صاف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مکّہ میں دراصل جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جُھٹلا رہے تھے اور طرح طرح کے فریب دے کر اور تعصبات ابھار کر عوام کو آپؐ کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے، وہ قوم کے کھاتے پیتے، پیٹ بھرے، خوش حال لوگ تھے، کیونکہ انھی کے مفاد پر اسلام کی اِس دعوتِ اصلاح کی زد پڑ رہی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاملہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ ہمیشہ یہی گروہ اصلاح کی راہ روکنے کے لیے سنگِ گراں بن کر کھڑا ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸۔ المومنون، ۳۳۔ سبا، ۳۴-۳۵۔ الزُّخرُف، ۲۳۔

۱۳ – جہنّم میں بھاری بیڑیاں مجرموں کے پاؤں میں اس لیے نہیں ڈالی جائیں گی کہ وہ بھاگ نہ سکیں، بلکہ اس لیے ڈالی جائیں گی کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ یہ فرار سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب کے لیے ہوں گی۔

۱۴ – چونکہ اُس وقت پہاڑوں کے اجزا کو باندھ کر رکھنے والی کشش ختم ہو جائے گی، اس لیے

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿۱۵﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهِۦ ۚ كَانَ وَعْدُهُۥ مَفْعُولًا ﴿۱۸﴾ إِنَّ هَٰذِهِۦ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَآءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِۦ

تم[۱۵] لوگوں کے پاس ہم نے اُسی طرح ایک رسولؐ تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے[۱۶] جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسولؑ بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اُس رسُولؑ کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اُس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے[۱۷] گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ

پہلے تو وہ باریک بُھر بُھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے، پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہو گا، اس کی وجہ سے یہ ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ اسی آخری کیفیت کو سورۂ طٰہٰ، آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا۔ کہو: میرا رب ان کو دُھول بنا کر اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بَل اور سَلوٹ نہ دیکھو گے۔“

۱۵- اب مکہ کے اُن کفار کو خطاب کیا جا رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جُھٹلا رہے تھے اور آپؐ کی مخالفت میں سرگرم تھے۔

۱۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں پر گواہ بنا کر بھیجنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ دنیا میں اُن کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دیں، اور یہ بھی کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہو گی، اُس وقت آپؐ یہ گواہی دیں کہ مَیں نے اِن لوگوں کے سامنے حق پیش کر دیا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴، النساء، حاشیہ ۶۴۔ جلد دوم، النحل، آیت ۸۴ و ۸۹۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۱۴)

۱۷- یعنی اوّل تو تمھیں ڈرنا چاہیے کہ اگر ہمارے بھیجے ہوئے رسول کی بات تم نے نہ مانی تو وہ بُرا انجام تمھیں دنیا ہی میں دیکھنا ہو گا جو فرعون اس سے پہلے اسی جرم کے نتیجے میں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اگر فرض کرو کہ دنیا میں تم

ع ۱۹ ۱۲

سَبِيۡلًا ۝۱۹ اِنَّ رَبَّكَ يَعۡلَمُ اَنَّكَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰى مِنۡ ثُلُثَىِ الَّيۡلِ وَنِصۡفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ مَعَكَ‌ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ‌ؕ عَلِمَ

اختیار کرلے۔

اے نبیؐ![18] تمھارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات، اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو،[19] اور تمھارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔[20] اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اُسے معلوم ہے

پر کوئی عذاب نہ بھی بھیجا گیا تو روزِ قیامت کے عذاب سے کیسے بچ نکلو گے؟

۱۸ - یہ آیت جس کے اندر نمازِ تہجّد کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے، اِس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مُسندِ احمد، مسلم اور ابوداؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ پہلے حکم کے بعد یہ دوسرا حکم ایک سال کے بعد نازل ہوا اور رات کا قیام فرض سے نفل کر دیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عائشہؓ ہی سے، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے یہ نقل کی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کے ۸ مہینے بعد آیا تھا، اور ایک تیسری روایت جو ابنِ ابی حاتم نے انھی سے نقل کی ہے، اس میں سولہ مہینے بیان کیے گئے ہیں۔ ابوداؤد، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک سال کی مدت نقل کی ہے۔ لیکن حضرت سعید بن جُبَیر کا بیان ہے کہ اس کا نُزول دس سال بعد ہوا ہے۔ (ابنِ جَریر و ابنِ ابی حاتم) ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ پہلے رُکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکّہ معظّمہ میں نازل ہوا ہے، اور وہاں بھی اُس کا نزول ابتدائی دَور میں ہوا ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اِس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے، جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔ اس بنا پر لامحالہ ان دونوں رُکوعوں کے زمانۂ نزول میں کم از کم دس سال کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔

۱۹ - اگرچہ ابتدائی حکم آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش کھڑے رہنے کا تھا، لیکن چونکہ نماز کی محویت میں وقت کا اندازہ نہ رہتا تھا، اور گھڑیاں بھی موجود نہ تھیں کہ اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکیں، اس لیے کبھی دو تہائی رات تک عبادت میں گزر جاتی تھی، اور کبھی یہ مدت گھٹ کر ایک تہائی رہ جاتی تھی۔

۲۰ - ابتدائی حکم میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کیا گیا تھا، اور آپؐ ہی کو قیامِ لَیل کی ہدایت فرمائی گئی تھی، لیکن مسلمانوں میں اُس وقت حضورؐ کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا، اس کی

اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰى ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۖ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ

کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھ لیا کرو۔[۲۱] اُسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں[۲۲]، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔[۲۳] پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے

بنا پر اکثر صحابۂ کرامؓ بھی اِس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

۲۱ – چونکہ نماز میں طول زیادہ تر قرآن کی طویل قراءت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجّد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی۔ اس ارشاد کے الفاظ اگرچہ بظاہر حکم کے ہیں، لیکن یہ امر مُتّفَق عَلَیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟" جواب میں ارشاد ہوا: "نہیں، اِلّا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو۔" (بخاری و مسلم)

اِس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع و سجود فرض ہے، اسی طرح قرآنِ مجید کی قراءت بھی فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قراءت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اِس اِستنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نمازِ تہجّد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان و فرائض ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت، جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام و قعود اور رکوع و سجود بھی نفل ہی ہیں۔

۲۲ – جائز اور حلال طریقوں سے رزق کمانے کے لیے سفر کرنے کو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اللہ کا فضل تلاش کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۳ – یہاں اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر جس طرح ایک ساتھ کیا ہے اور بیماری کی مجبوری کے علاوہ اِن دونوں کاموں کو نمازِ تہجد سے معافی یا اس میں تخفیف کا سبب قرار دیا ہے،

مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع

ع ۲/۱۴

پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[24] اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو[25]۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے[26]۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ع

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من جالبٍ یجلبُ طعامًا الی بلدٍ من بلدٍ ان المسلمین فیبیعه لِسِعْرِ یومِهٖ الا کانت منزلتهٗ عنداللّٰه ثم قرأ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ ...... ”جو شخص مسلمانوں کے کسی شہر میں غلّہ لے کر آیا اور اُس روز کے بھاؤ پر اسے بیچ دیا، اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پڑھی۔“ (ابنِ مَرْدُوْیَہ)

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: ما من حال یاتینی علیه الموت بعد الجهاد فی سبیل اللّٰه احبّ الی من ان یاتینی وانا بین شِعبتَی جبل التمس من فضل اللّٰه وقرأ هٰذه الاٰیة۔ ”جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے کسی پہاڑی دَرّے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آجائے، پھر انھوں نے یہی آیت پڑھی۔“ (بیہقی فی شُعَب الایمان)

۲۴ – مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد پنج وقتہ فرض نماز اور فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

۲۵ – ابنِ زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال خدا کی راہ میں صَرف کرنا ہے، خواہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، یا بندگانِ خدا کی مدد ہو، یا رفاہِ عام ہو، یا دوسرے بھلائی کے کام۔ اللہ کو قرض دینے اور اچھا قرض دینے کے مطلب کی تشریح ہم اس سے پہلے متعدِد مقامات پر کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۶۷۔ المائدہ، حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۶۔

۲۶ – مطلب یہ ہے کہ تم نے آگے اپنی آخرت کے لیے جو کچھ بھیج دیا، وہ تمھارے لیے اُس سے زیادہ

نافع ہے جو تم نے دنیا ہی میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ایکم مالہ احب الیہ من مال وارثہ؟ ''تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا: اعلموا ما تقولون۔ ''سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' لوگوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما مال احدکم ما قدم ومال وارثہ ما اخر۔ ''تمھارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا۔ اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔'' (بخاری، نَسائی، مُسندِ ابو یَعلیٰ)

تفہیم القرآن

المدّثّر

(۷۴)

المدثر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْمُدَّثِّرُ کو اِس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے، مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس کی پہلی سات آیات مکۂ معظمہ کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ ہیں۔ بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسنَدِ احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہیں، اُن میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی اوّلین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ لیکن اُمّت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مُسَلَّم ہے کہ پہلی وحی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَالَمْ یَعْلَمْ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس وقفے کے بعد جب اَزسرِنَو نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس کا آغاز سورۂ مدّثّر کی اِنھی آیات سے ہوا تھا۔ امام زُہریؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

> ”ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اُس زمانے میں آپؐ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپؐ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپؐ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپؐ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپؐ سے کہتے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپؐ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور ہو جاتی تھی۔“ (ابنِ جَرِیر)

اس کے بعد امام زُہری خود حضرت جابر بن عبداللہؓ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَترۃُ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا۔ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سُنی، سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا، مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اُس وقت اللہ نے وحی نازل کی: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ...... پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔“ (بخاری، مسلم، مُسنَدِ احمد، ابنِ جَرِیر)

سورت کا باقی ماندہ حصّہ آیت ۸ سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی عَلانیہ تبلیغ شروع

ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اُس کا مفصّل واقعہ سیرت ابنِ ہشام میں بیان کیا گیا ہے، جسے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی، جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

"پڑھو اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجرِبہ تھا جو اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا۔ اِس پیغام میں آپؐ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، تاکہ آپؐ کی طبیعت پر جو شدید بار اِس پہلے تجرِبے سے پڑا ہے اس کا اثر دُور ہو جائے اور آپؐ ذہنی طور پر آیندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقفے کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اِس سورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپؐ اٹھیں اور خَلقِ خدا کو اُس رَوِش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے، اور اِس دنیا میں، جہاں دوسروں کی بڑائی کے ڈنکے بج رہے ہیں، خدا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپؐ کو کرنا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو اور آپؐ تمام دنیوی فائدوں سے قطعِ نظر کر کے کامل اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری فقرے میں آپؐ کو تلقین کی گئی کہ اِس فریضے کی انجام دہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں، اُن پر آپؐ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اِس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآنِ مجید کی پے در پے نازل ہونے والی سورتوں کو آپؐ نے سنانا شروع کیا تو مکّہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اِس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اِس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بےنظیر اور مؤثّر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثّر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی، جس میں طے کیا گیا کہ

حاجیوں کے آتے ہی اُن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اِس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مُغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا: نہیں، خدا کی قسم! وہ کاہن نہیں ہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گُنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے: انھیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا: وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے، وہ کسی سے چھُپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ دیوانگی کی بڑ ہے، یا جُنون کے دَورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا: اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا: وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اِس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اِطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے: تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا: وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمدؐ پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا: اِن باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے، لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم! اس کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا: تمھاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا: اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا: قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو، یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اِس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انھوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اُس سے ہوشیار رہنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔ (سیرۃ ابنِ ہِشام، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹-اِس قصّے کا یہ حصّہ کہ ابوجہل کے اصرار پر ولید نے یہ بات کہی تھی، عِکرِمہ کی رِوایت سے ابنِ جَریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)۔

یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصّے میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُس کے مضامین کی ترتیب

یہ ہے:

آیت ۸ سے ۱۰ تک منکرینِ حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس کا بُرا انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مُغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور اُن کا جواب اس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اِس سلسلے میں اُس کی ذہنی کش مکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخرِ کار یہ بات بنا کر لایا کہ خلقِ خدا کو اِس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اِسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اُس کی اِس صریح بدباطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اِس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اِسے مزید انعامات سے نوازا جائے، حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۴۸ تک دوزخ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

پھر آیات ۴۹-۵۳ میں کفار کے مرض کی اصل جڑ بتا دی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے بے خوف ہیں اور اِسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں، اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے، انکارِ آخرت کے ساتھ وہ ایمان کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں پڑ گئی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پُوری کرتا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کر لے۔ خدا اِس کا مستحق ہے کہ لوگ اُس کی نافرمانی سے ڈریں، اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رَویّہ اختیار کر لے، اسے وہ معاف کر دیتا ہے، خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

---

۵۶ آیاتھا

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ

۲ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴿۳﴾ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ﴿۵﴾ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۙ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ؕ﴿۷﴾

اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے[1]! اُٹھو اور خبردار کرو[2]۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو[3]۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو[4]۔ اور گندگی سے دور رہو[5]۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے[6]۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو[7]۔

۱- اوپر دیباچے میں ہم ان آیات کے نُزول کا جو پَس منظر بیان کر آئے ہیں اس پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ یا یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ کہہ کر مُخاطَب کرنے کے بجائے یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر کیوں مُخاطَب کیا گیا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپؐ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اَے میرے پیارے بندے! تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے، جسے انجام دینے کے لیے تمھیں پورے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۲- یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ’’اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔‘‘ (نوح-۱) آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور تمھارے گردوپیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو چونکا دو۔ انھیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اِسی حالت میں مبتلا رہے۔ انھیں خبردار کر دو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پُرس نہ ہو۔

۳- یہ ایک نبی کا اوّلین کام ہے جسے اِس دنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے

کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کردے اور ہانکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان کردے کہ اِس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیّت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اُٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے، کیونکہ اس اُمّت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ اِن آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکّۂ معظمہ مشرکینِ عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اُس کے مُجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تنِ تنہا اٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا عَلَم بلند کر دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی لیے ''اٹھو اور خبردار کرو'' کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ''اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو'' اپنے اندر یہ مفہُوم بھی رکھتا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اِس کام میں تمھیں مزاحم نظر آتی ہیں، ان کی ذرا پروا نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو، وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

۴- یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہُوم میں بڑی وُسعت ہے۔

اِن کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، وہ صرف عقائد اور اَخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا، بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصوُّرات تک سے خالی تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا، اس لیے آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نَوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصّل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتّٰی کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ''طہارت'' کا ہم معنیٰ ہو۔

بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے، جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم اِن الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف سُتھرا رکھو۔ راہبانہ تصوّرات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کُچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدّس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت مَیل کُچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حِس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو، وہ صاف سُتھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اُس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیّت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفّر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اِس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اَخلاقی عُیوب سے پاک رکھو۔ تمھارا لباس سُتھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا اور نمایش، ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اوّلین چیز ہے جو آدمی کی شخصیّت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے، اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبّر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ مَنِش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرتاً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شایستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اُردو زبان کی طرح عَرَبی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنیٰ الفاظ اَخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابنِ عباس، ابراہیم نَخَعی، شَعْبی، عطاء، مجاہد، قَتَادَہ، سعید بن جُبَیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاهر الثياب وفلان طاهر الذيل، ''فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے''، اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اَخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں: فلانٌ دَنِسُ الثياب، ''اس شخص کے کپڑے گندے ہیں''، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

۵ - گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے، خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اَخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو، ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمھاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

٦ - اصل الفاظ ہیں: وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۔ اِن کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اِن کا ترجمہ کرکے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمھاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو، اس میں کوئی شائبہ اِس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمھیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو، یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمھاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمھارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر، اور اِس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

۷ - یعنی یہ کام جو تمھارے سُپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمھیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری اپنی قوم تمھاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمھارے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمھارے راستے میں حائل ہوگی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے مَوقف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپؐ اُٹھ کر نبوت کے کام کا آغاز فرما دیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اِس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپؐ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اِس کام کے لیے آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے اَخلاق اور معاملات کیسے ہونے چاہییں، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام آپؐ کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دیں، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۙ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ۙ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿۱۲﴾

اچھا، جب صُور میں پھُونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی سخت دن[8] ہو گا، کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا[9]۔ چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص[10] کو جسے مَیں نے اکیلا پیدا کیا[11]، بہت سامال اُس کو دیا،

کہ اس کام میں آپ کو کن حالات سے سابقہ پیش آنا ہے اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہو گا۔ آج جو لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ مَعاذ اللہ! صَرع کے دَوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا، وہ ذرا آنکھیں کھول کر اِن فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صَرع کے کسی دَورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے؟

۸- جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، اِس سُورہ کا یہ حصّہ ابتدائی آیات کے چند مہینے بعد اُس وقت نازل ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عَلانیہ تبلیغِ اسلام شروع ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ حج کا زمانہ آیا اور سردارانِ قریش نے ایک کانفرنس کر کے یہ طے کیا کہ باہر سے آنے والے حاجیوں کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی ایک زبردست مہم چلائی جائے۔ اِن آیات میں کفار کی اِسی کارروائی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اِس تبصرے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا گیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ اچھا، یہ حرکتیں جو تم کرنا چاہتے ہو، کرلو، دنیا میں اِن سے کوئی مقصد براری تم نے کر بھی لی تو اُس روز اپنے بُرے انجام سے کیسے بچ نکلو گے جب صُور میں پھونک ماری جائے گی اور قیامت برپا ہو گی۔ (صُور کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷، الزُّمَر، حاشیہ ۷۹۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۵۲)

۹- اس ارشاد سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دن ایمان لانے والوں کے لیے ہلکا ہو گا اور اس کی سختی صرف حق کا انکار کرنے والوں کے لیے مخصوص ہو گی۔ مزید برآں یہ ارشاد اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ اُس دن کی سختی کافروں کے لیے مستقل سختی ہو گی، وہ ایسی سختی نہ ہو گی جس کے بعد کبھی اُس کے نرمی سے بدل جانے کی اُمید کی جا سکتی ہو۔

۱۰- یہ خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! کفّار کی اس کانفرنس میں جس شخص (وَلید بن مُغیرہ) نے تمھیں بدنام کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ تمام عرب سے آنے والے حاجیوں میں

وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ

اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیے[۱۲]، اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دوں[۱۳]۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عِناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبُّر میں پڑ گیا۔ آخرِ کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو

تمھیں جادوگر مشہور کیا جائے، اُس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اُس سے نمٹنا اب میرا کام ہے، تمھیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱ - اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک، یہ کہ جب مَیں نے اُسے پیدا کیا تھا، اُس وقت یہ کوئی مال اور اولاد اور وَجاہت اور ریاست لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ دوسرا، یہ کہ اُس کا پیدا کرنے والا اکیلا میں ہی تھا، وہ دوسرے معبود، جن کی خدائی قائم رکھنے کے لیے یہ تمھاری دعوتِ توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے، اُس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ شریک نہ تھے۔

۱۲ - وَلید بن مُغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالدؓ بن ولید، تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اِن بیٹوں کے لیے شُہود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی، ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اس کے سب بیٹے نامُور اور بااثر ہیں، مجلسوں اور محفلوں میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ وہ اس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

۱۳ - اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اِس پر بھی اس کی حرص ختم نہیں ہوئی۔ اتنا کچھ پانے کے بعد بھی وہ

يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾

جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے[14]۔ عنقریب مَیں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے[15]۔ کھال جُھلس دینے والی[16]۔

بس اسی فکر میں لگا ہُوا ہے کہ اُسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ دوسرا مطلب حضرت حسن بصریؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر واقعی محمدؐ کا یہ بیان سچا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی جنت بھی ہوگی تو وہ جنت میرے ہی لیے بنائی گئی ہے۔

۱۴- یہ اُس واقعے کا ذکر ہے جو کفارِ مکہ کی مذکورۂ بالا کانفرنس میں پیش آیا تھا۔ اس کی جو تفصیلات ہم دیباچے میں نقل کر چکے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دل میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا، لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت و ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا۔ جب کفار کی اس کانفرنس میں پہلے اس نے خود اُن تمام الزامات کو رد کر دیا جو قریش کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے تھے، تو اِسے مجبُور کیا گیا کہ وہ خود کوئی ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کیا جا سکتا ہو۔ اس موقع پر جس طرح وہ اپنے ضمیر سے لڑا ہے اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر مبتلا رہ کر آخرِ کار اس نے ایک الزام گھڑا ہے، اس کی پوری تصویر یہاں کھینچ دی گئی ہے۔

۱۵- اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا، اسے وہ جلا کر خاک کر دے گی مگر مر کر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹے گا، بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلایا جائے گا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى "وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا۔" (الاعلیٰ-۱۳) دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب کے مستحقین میں سے کسی کو باقی نہ رہنے دے گی جو اُس کی گرفت میں آئے بغیر رہ جائے، اور جو بھی اس کی گرفت میں آئے گا اسے عذاب دیے بغیر نہ چھوڑے گی۔

۱۶- یہ کہنے کے بعد کہ وہ جسم میں سے کچھ جلائے بغیر نہ چھوڑے گی، کھال جُھلس دینے کا الگ ذکر کرنا بظاہر کچھ غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن عذاب کی اس شکل کو خاص طور پر الگ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی چیز دراصل اس کے چہرے اور جسم کی کھال ہی ہوتی ہے، جس کی بدنُمائی اُسے سب سے زیادہ کھَلتی ہے۔ اندرونی اعضا میں خواہ اسے کتنی ہی تکلیف ہو، وہ اس پر اتنا زیادہ رنجیدہ نہیں ہوتا جتنا اس بات پر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ بدنُما ہو جائے، یا اس کے جسم کے کھلے حصوں کی جِلد پر ایسے داغ پڑ جائیں جنھیں دیکھ کر ہر شخص اُس سے گِھن کھانے لگے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ حسین چہرے اور بڑے بڑے شان دار جسم لیے ہوئے

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ

اُنّیس کارکن اس پر مقرر ہیں۔[17] ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں،[18] اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے،[19] تا کہ اہلِ کتاب کو یقین آ جائے[20] اور ایمان لانے والوں کا

جو لوگ آج دنیا میں اپنی شخصیت پر پھُولے پھر رہے ہیں، یہ اگر اللہ کی آیات کے ساتھ عناد کی وہ رَوِش برتیں گے جو ولید بن مُغیرہ برت رہا ہے تو ان کے منہ جھلس دیے جائیں گے اور ان کی کھال جلا کر کوئلے کی طرح سیاہ کر دی جائے گی۔

۱۷- یہاں سے لے کر "تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا" تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سلسلۂ کلام کو توڑ کر اُن معترضین کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد صرف ۱۹ ہو گی، اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ اُن کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسانوں نے بھی کفر اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور دوسری طرف ہمیں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اتنی بڑی دوزخ میں اتنے بے شمار انسانوں کو عذاب دینے کے لیے صرف ۱۹ کارکن مقرر ہوں گے۔ اس پر قریش کے سرداروں نے بڑے زور کا ٹھٹھا مارا۔ ابوجہل بولا: "بھائیو! کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی دوزخ کے ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟" بنی جُمَح کے ایک پہلوان صاحب کہنے لگے: "۱۷ سے تو میں اکیلا نمٹ لوں گا، باقی دو کو تم سب مل کر سنبھال لینا۔" انھی باتوں کے جواب میں یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۸- یعنی اُن کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا تمھاری حماقت ہے۔ وہ آدمی نہیں، فرشتے ہوں گے، اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی زبردست طاقتوں کے فرشتے پیدا کیے ہیں۔

۱۹- یعنی بظاہر تو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کی جاتی۔ لیکن ہم نے ان کی یہ تعداد اس لیے بیان کر دی ہے کہ یہ ہر اُس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کُفر چھُپائے بیٹھا ہو۔ ایسا آدمی چاہے ایمان کی کتنی ہی نمائش کر رہا ہو، اگر وہ خدا کی خدائی اور اس کی عظیم قدرتوں کے بارے میں، یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں لیے بیٹھا ہو تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ

ایمان بڑھے[21]، اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں، اور دل کے بیمار[22] اور کفّار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اِس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے[23]۔ اِس طرح

اتنی بڑی جیل میں بے حد وحساب مجرم جنّوں اور انسانوں کو صرف ۱۹ سپاہی قابو میں بھی رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کُھل کر باہر آ جائے گا۔

۲۰ ۔ بعض مفسّرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں چونکہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے، اس لیے یہ بات سُن کر ان کو یقین آ جائے گا کہ یہ بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے: اوّل، یہ کہ یہود و نصاریٰ کی جو مذہبی کتابیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں تلاش کے باوجود ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ دوسرے، قرآنِ مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہلِ کتاب کے ہاں اُن کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس ارشاد کا صحیح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے ۱۹ فرشتوں کا ذکر سن کر میرا خوب مذاق اُڑایا جائے گا، لیکن اس کے باوجود جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی، اسے انھوں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی کے مذاق و اِستہزا کی ذرّہ برابر پروانہ کی۔ جہلائے عرب تو انبیاؑ کی شان سے ناواقف تھے، مگر اہلِ کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاؑ کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے، خواہ وہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ اس بنا پر اہلِ کتاب سے یہ بات زیادہ متوقّع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر انھیں یقین آ جائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرزِ عمل بارہا ظاہر ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال معراج کا واقعہ ہے جسے آپؐ نے کفار کے مجمعِ عام میں بلاتکلّف بیان کر دیا اور اس بات کی ذرّہ برابر پروانہ کی کہ اس حیرت انگیز قصّے کو سن کر آپؐ کے مخالفین کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔

۲۱ ۔ یہ بات اس سے پہلے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے کہ ہر آزمائش کے موقع پر

جب ایک مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور شک و انکار یا اطاعت سے فرار، یا دین سے بے وفائی کی راہ چھوڑ کر یقین و اعتماد اور اطاعت و فرماں برداری اور دین سے وفاداری کی راہ اختیار کرتا ہے، تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، آیت ۱۷۳۔ جلد دوم، الانفال، آیت ۲، حاشیہ ۲، التوبہ، آیات ۱۲۴-۱۲۵، حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، الاحزاب، آیت ۲۲، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الفتح، آیت ۴، حاشیہ ۷)

۲۴- قرآنِ مجید میں چونکہ بالعُموم ''دل کی بیماری'' سے مراد منافقت لی جاتی ہے، اس لیے یہاں اس لفظ کو دیکھ کر بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ منافقین کا ظہور مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مکہ میں منافق موجود نہ تھے، اور اس کی غَلَطی ہم تفہیم القرآن، جلد سوم میں صفحہ ۶۷۲، ۶۷۴ اور ۶۸۰ تا ۶۸۲ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے، یہ طرزِ تفسیر ہمارے نزدیک دُرست نہیں ہے کہ ایک سلسلۂ کلام جو ایک خاص موقع پر خاص حالات میں ارشاد ہوا ہو، اس کے اندر یکایک کسی ایک فقرے کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے موقع پر نازل ہوا تھا اور یہاں لا کر کسی مناسبت کے بغیر شامل کر دیا گیا۔ سورۂ مدثِّر کے اس حصّے کا تاریخی پَس منظر ہمیں معتبر روایات سے معلوم ہے۔ یہ ابتدائی مکّی دَور کے ایک خاص واقعے کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اُس کا پورا سلسلۂ کلام اس واقعے کے ساتھ صریح مناسبت رکھتا ہے۔ اِس مضمون میں آخر کون سا موقع تھا کہ اِس ایک فقرے کو، اگر وہ کئی سال بعد مدینہ میں نازل ہوا تھا، اِس جگہ لا کر چسپاں کر دیا جاتا؟ اب رہا یہ سوال کہ یہاں دل کی بیماری سے مراد کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد شک کی بیماری ہے۔ مکہ ہی میں نہیں، دنیا بھر میں، پہلے بھی اور آج بھی، کم لوگ ایسے تھے اور ہیں جو قطعیّت کے ساتھ خدا، آخرت، وحی، رسالت، جنت، دوزخ وغیرہ کا انکار کرتے ہوں۔ اکثریت ہر زمانے میں انھی لوگوں کی رہی ہے جو اس شک میں مبتلا رہے ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں، آخرت ہوگی یا نہیں، فرشتوں اور جنت اور دوزخ کا واقعی کوئی وجود ہے یا یہ محض افسانے ہیں، اور رسول واقعی رسول تھے اور ان پر وحی آتی تھی یا نہیں۔ یہی شک اکثر لوگوں کو کفر کے مقام پر کھینچ لے گیا ہے، ورنہ ایسے بے وقوف دنیا میں کبھی زیادہ نہیں رہے جنھوں نے بالکل قطعی طور پر ان حقائق کا انکار کر دیا ہو، کیونکہ جس آدمی میں ذرہ برابر بھی عقل کا مادّہ موجود ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ اِن اُمور کے صحیح ہونے کا امکان بالکل رد کر دینے اور اِنھیں قطعاً خارج از امکان قرار دے دینے کے لیے ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

۲۳- اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ وہ اِسے اللہ کا کلام تو مان رہے تھے مگر تعجب اس بات پر ظاہر کر رہے تھے کہ اللہ نے یہ بات کیوں فرمائی، بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس کلام میں ایسی بعید از عقل و فہم بات کہی گئی ہے، وہ بھلا اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾

ع ۱۵

اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے[۲۴]۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا[۲۵]۔۔۔۔۔ اور اس دوزخ کا ذکر اِس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو[۲۶] ؏ ہرگز نہیں[۲۷]، قسم ہے چاند کی، اور رات کی جب کہ وہ پلٹتی ہے،

۲۴- یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور اپنے احکام وفرامین میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ارشاد فرما دیتا ہے جو لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہی بات ہوتی ہے جسے ایک راستی پسند، سلیم الطبع اور صحیح الفکر آدمی سنتا ہے اور سیدھے طریقے سے اُس کا سیدھا مطلب سمجھ کر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اُسی بات کو ایک ہٹ دھرم، کج فہم اور راستی سے گریز کرنے والا آدمی سنتا ہے اور اُس کا ٹیڑھا مطلب نکال کر اسے حق سے دُور بھاگ جانے کے لیے ایک نیا بہانہ بنا لیتا ہے۔ پہلا آدمی چونکہ خود حق پسند ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت بخش دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت چاہنے والے کو زبردستی گمراہ کر دے۔ اور دوسرا آدمی چونکہ خود ہدایت نہیں چاہتا بلکہ گمراہی کو ہی اپنے لیے پسند کرتا ہے، اس لیے اللہ اسے ضلالت ہی کے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو حق سے نفرت رکھتا ہو، وہ اسے جبراً کھینچ کر حق کی راہ پر لائے۔ (اللہ کے ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے مسئلے پر تفہیم القرآن میں بکثرت مقامات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۰، ۱۶، ۱۹، ۲۰۔ النساء، حاشیہ ۱۷۳۔ الانعام، حواشی ۱۷، ۲۸، ۹۰۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۳۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۴۔ القصص، حاشیہ ۷۱)

۲۵- یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کو کیا کیا طاقتیں اس نے بخشی ہیں، اور ان سے کیا کیا کام وہ لے رہا ہے، ان باتوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ ایک چھوٹے سے کُرۂ زمین پر رہنے والا انسان اپنی محدود نظر سے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا اپنے آلات کی مدد سے محسوس ہوتا ہے، تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کر لینا انسان کے بس میں نہیں ہے، کجا کہ اس کی ساری وسعتوں کا تصوّر اس کے چھوٹے سے دماغ میں سما سکے۔

وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ

مع ۱۶

اور صبح کی جب کہ وہ روشن ہوتی ہے، یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے،[28] انسانوں کے لیے ڈراوا، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔[29]

ہر متنفّس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے،[30] دائیں بازو والوں کے سوا،[31] جو جنّتوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ مجرموں سے پوچھیں گے:[32] "تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے: "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے

۲۶ – یعنی لوگ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانے اور اس کے عذاب کا مزا چکھنے سے پہلے ہوش میں آجائیں اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔

۲۷ – یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جس کا اِس طرح مذاق اُڑایا جائے۔

۲۸ – یعنی جس طرح چاند، اور رات اور دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عظیم نشانات ہیں، اُسی طرح دوزخ بھی عظائم قدرت میں سے ایک چیز ہے۔ اگر چاند کا وجود غیر ممکن نہ تھا، اگر رات اور دن کا اس باقاعدگی کے ساتھ آنا غیر ممکن نہ تھا، تو دوزخ کا وجود، آخر کیوں تمھارے خیال میں غیر ممکن ہو گیا؟ اِن چیزوں کو چونکہ تم رات دن دیکھ رہے ہو، اس لیے تمھیں ان پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، ورنہ اپنی ذات میں یہ بھی اللہ کی قدرت کے نہایت حیرت انگیز معجزے ہیں، جو اگر تمھارے مشاہدے میں نہ آئے ہوتے، اور کوئی تمھیں خبر دیتا کہ چاند جیسی ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، یا سورج ایک چیز ہے جس کے چھپنے سے دنیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے، اور جس کے نکل آنے سے دنیا چمک اُٹھتی ہے، تو تم جیسے لوگ اس بات کو سُن کر بھی اُسی طرح ٹھٹھے مارتے جس طرح دوزخ کا ذکر سُن کر ٹھٹھے مار رہے ہو۔

۲۹ – مطلب یہ ہے کہ اس چیز سے لوگوں کو ڈرا دیا گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے ڈر کر بھلائی کے راستے پر آگے بڑھے اور جس کا جی چاہے پیچھے ہٹ جائے۔

۳۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طُور، حاشیہ ۱۶۔

الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

نہ تھے،[۳۳] اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے،[۳۴] اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اُس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا۔"[۳۵] اُس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کسی کام

۳۱- بالفاظِ دیگر بائیں بازو والے تو اپنے کسب کے بدلے میں پکڑ لیے جائیں گے، لیکن دائیں بازو والے اپنا فکِ رہن کرالیں گے۔ (دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ واقعہ، حواشی ۵-۶)

۳۲- اس سے پہلے کئی مقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں مِیل دُور ہونے کے باوجود جب چاہیں گے ایک دوسرے کو کسی آلے کی مدد کے بغیر دیکھ سکیں گے اور ایک دوسرے سے براہِ راست گفتگو کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۴۴ تا ۵۰، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۵۰ تا ۵۷، حاشیہ ۳۲۔

۳۳- مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اوّلین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اُس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مُستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔

۳۴- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۳۵- یعنی مرتے دم تک ہم اِسی رَوِش پر قائم رہے، یہاں تک کہ وہ یقینی چیز ہمارے سامنے آ گئی جس سے ہم غافل تھے۔ یقینی چیز سے مراد موت بھی ہے اور آخرت بھی۔

الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ

نہ آئے گی۔[36]

آخر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اِس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں، گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔[37] بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں۔[38] ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔[39] ہرگز نہیں،[40]

۳۶۔ یعنی ایسے لوگ جنھوں نے مرتے دم تک یہ رَوِش اختیار کیے رکھی ہو، ان کے حق میں اگر کوئی شفاعت کرنے والا شَفاعت کرے بھی تو اسے معافی نہیں مل سکتی۔ شَفاعت کے مسئلے کو قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی کہ شفاعت کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جا سکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جا سکتی، کس کے لیے کی جا سکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جا سکتی، اور کس کے حق میں وہ نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجایش باقی نہیں چھوڑی۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل مُلاحظہ ہوں: البقرہ، ۲۵۵۔ الاَنعام، ۹۴۔ الاعراف، ۵۳۔ یونس، ۳-۱۸۔ مریم، ۸۷۔ طٰہٰ، ۱۰۹۔ الانبیاء، ۲۸۔ سَبا، ۲۳۔ الزُّمر، ۴۳-۴۴۔ المومن، ۱۸۔ الدُّخان، ۸۶۔ النجم، ۲۶۔ النبا، ۳۷-۳۸۔ تفہیم القرآن میں جہاں جہاں یہ آیات آئی ہیں ہم نے ان کی اچھی طرح تشریح کر دی ہے۔

۳۷۔ یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصّہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اِس قدر بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہلِ عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے کو اُن جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بُو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں۔

۳۸۔ یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمدؐ ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو۔ اور یہ خط ایسے ہوں جنھیں دیکھ کر انھیں یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآنِ مجید میں کفارِ مکہ کا

اِنَّهٗ تَذۡكِرَةٌ ۚ﴿۵۴﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ؕ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذۡكُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهۡلُ التَّقۡوٰى وَاَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع

یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے۔ اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے[۴۱]۔ وہ اس کا حق دار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے[۴۲] اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے[۴۳]۔ ع

یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔“ (الانعام: ۱۲۴) ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لا کر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں۔ (بنی اسرائیل: ۹۳)

۳۹- یعنی اِن کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے یہ مطالبے پُورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انھوں نے سب کچھ اِسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور اِنھیں یہ خیال نہیں ہے کہ اِس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں اِن کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے اِن کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنیٰ سمجھتے ہیں، کیونکہ اِنھیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ لازماً دنیا میں اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور بُرا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اِس مسئلے پر غور کرنا لا حاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا۔ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابلِ غور اگر ہو سکتا ہے تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور اَبدی زندگی آخرت کی زندگی ہے، جہاں حق کا انجام لازماً اچھا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہوگا۔ ایسا شخص تو اُن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے، ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے۔ لیکن آخرت کا منکر، جو سرے سے تلاشِ حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے، وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے، وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی بات ہے جو سورۂ اَنعام میں فرمائی گئی ہے کہ ”اَے نبیؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھُو کر بھی دیکھ لیتے، تو جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے، وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“ (الانعام: ۷)

۴۰- یعنی ان کا ایسا کوئی مطالبہ ہرگز پورا نہ کیا جائے گا۔

۴۱- یعنی کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اُس کی اپنی مشیّت ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اُسے نصیحت اُسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ اللہ کی مَشِیَّت بھی یہ ہو کہ وہ اُسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوسرے الفاظ میں، یہاں اِس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بندے کا کوئی فعل بھی تنہا بندے کی اپنی مشیّت سے ظُہور میں نہیں آتا، بلکہ ہر فعل اُسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب خدا کی مَشِیَّت بندے کی مَشِیَّت سے مل جائے۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جسے نہ سمجھنے سے انسانی فکر بکثرت ٹھوکریں کھاتی ہے۔ مختصر الفاظ میں اِس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اِس دنیا میں ہر انسان کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے کر گزرے، تو ساری دنیا کا نظام دَرہم بَرہم ہو جاتا۔ جو نظم اِس جہان میں قائم ہے، وہ اِسی وجہ سے ہے کہ اللہ کی مَشِیَّت ساری مَشِیَّتوں پر غالب ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے، وہ اُسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اللہ بھی یہ چاہے کہ انسان کو وہ کام کرنے دیا جائے۔ یہی معاملہ ہدایت اور ضلالت کا بھی ہے۔ انسان کا محض خود ہدایت چاہنا اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے ہدایت مل جائے، بلکہ اُسے ہدایت اُس وقت ملتی ہے جب اللہ اُس کی اِس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اسی طرح ضلالت کی خواہش بھی محض بندے کی طرف سے ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ جب اللہ اس کے اندر گمراہی کی طلب پا کر یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اسے غلط راستوں میں بھٹکنے دیا جائے تب وہ اُن راہوں میں بھٹک نکلتا ہے جن پر اللہ اسے جانے کا موقع دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چور بننا چاہے تو محض اس کی یہ خواہش اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ جہاں جس کے گھر میں گُھس کر وہ جو کچھ چاہے چُرا لے جائے، بلکہ اللہ اپنی عظیم حکمتوں اور مَصْلَحتوں کے مطابق اِس کی اِس خواہش کو جب اور جس قدر اور جس شکل میں پورا کرنے کا موقع دیتا ہے، اسی حد تک وہ اسے پورا کر سکتا ہے۔

۴۲- یعنی تمھیں اللہ کی ناراضی سے بچنے کی جو نصیحت کی جا رہی ہے، وہ اِس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو اِس کی ضرورت ہے اور اگر تم ایسا نہ کرو تو اُس سے اللہ کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ یہ نصیحت اس بنا پر کی جا رہی ہے کہ اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کے بندے اس کی رضا چاہیں اور اس کی مرضی کے خلاف نہ چلیں۔

۴۳- یعنی یہ اللہ ہی کو زیب دیتا ہے کہ کسی نے خواہ اس کی کتنی ہی نافرمانیاں کی ہوں، جس وقت بھی وہ اپنی اِس رَوِش سے باز آ جائے، اللہ اپنا دامنِ رحمت اس کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ اپنے بندوں کے لیے کوئی جذبۂ انتقام وہ اپنے اندر نہیں رکھتا کہ ان کے قصوروں سے وہ کسی حال میں درگزر ہی نہ کرے اور انھیں سزا دیے بغیر نہ چھوڑے۔

تفہیم القرآن

القیامہ

(۷۵)

القیامہ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقِیٰمَۃِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس سُورہ کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزُول اگرچہ کسی روایت سے اِس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوتا، لیکن اِس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۱۵ کے بعد یکایک سلسلۂ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ ''اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّے ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔'' اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا سے آیت ۱۵ تک چلا آ رہا تھا۔ یہ جملۂ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی، اور روایات کی رُو سے بھی، اِس بنا پر دورانِ کلام میں وارد ہُوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سُورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا رہے تھے، اس وقت آپؐ اِس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے دُہراتے جا رہے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نزولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپؐ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآنِ مجید میں اس کی دو مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک سورۂ طٰہٰ میں، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ، '' اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک کہ تمھاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔'' (آیت ۱۱۴) دوسرے سورۂ اعلیٰ میں، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤی، ''ہم عنقریب تم کو پڑھوا دیں گے، پھر تم بھُولو گے نہیں۔'' (آیت ۶) بعد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے قرآن میں اِن تین مقامات کے سوا اِس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون یہاں سے آخرِ کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر اپنے

مضمون اور اندازِ بیان سے اُس زمانے کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سورۂ مُدَّثِّر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سورتوں میں ایسے پُرزور اور مؤثّر طریقے سے نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہلِ مکہ کو ان کی گمراہیوں پر مُتنبّہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بَوکھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لیے انھوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورۂ مدّثّر کے دیباچہ میں کرچکے ہیں۔

اس سورہ میں منکرینِ آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے، اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں، ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے، بلکہ اس کا اصل محرّک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو، وہ آ کر رہے گا، تمھارا سب کیا دھرا تمھارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا، اور حقیقت میں تو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہوگا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لیے اپنی حرکات کے لیے کتنے ہی بہانے اور عذرات تراشتا رہے۔

---

۴۰ ابیاتھا | ۲ رکوعاتھا

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝۱ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲

نہیں[1]، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس[2] کی۔

۱- کلام کی ابتدا نہیں سے کرنا خود بخود اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے سے کوئی بات چل رہی تھی جس کی تردید میں یہ سُورت نازل ہوئی ہے، اور آگے کا مضمون آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ بات قیامت اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تھی جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ مذاق بھی اُڑا رہے تھے۔ اِس طرزِ بیان کو اِس مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آپ محض رسول کی صداقت کا اقرار کرنا چاہتے ہوں تو آپ کہیں گے: ''خدا کی قسم! رسول برحق ہے۔'' لیکن اگر کچھ لوگ رسول کی صداقت کا انکار کر رہے ہوں تو آپ جواب میں اپنی بات یوں شروع کریں گے کہ ''نہیں، خدا کی قسم! رسول برحق ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے، مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔

۲- قرآنِ مجید میں نفسِ انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اُکساتا ہے۔ اس کا نام نفسِ اَمّارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے، یا غلط سوچنے، یا بُری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ لَوّامہ ہے، اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ مُطمئِنّہ ہے۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اُسے بیان نہیں کیا ہے، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ اَزَلی ہے نہ اَبَدی۔ اِس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اِس گمانِ بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم

بڑھتا جاتا ہے، اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامۂ ہَست و بُود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکّی انسان کو جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمھاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمھارا وجود خود تمھارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اِس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات دَرہم بَرہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو، وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور برائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس برائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو، اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اُس کے برعکس صورت میں جب کہ اسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اِس طرح کے ایک نفس لَوّامہ کی موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یہی نفسِ لَوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعدِ موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہوسکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا، اور اس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اِس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پُورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعدِ موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسُخ یا آواگَون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے، اور اس لامتناہی سلسلے میں

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟[۳] کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی

بجائے اس کے کہ اس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اِسی صورت میں پُورا ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں انسان کی صرف ایک زندگی ہو، اور پھر پُوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

۳- اُوپر کی دو دلیلیں، جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں: ایک، یہ کہ دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے، یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعدِ موت ممکن ہے۔ مکہ میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے، وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سیکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار برس پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پُرزور جواب اللہ تعالیٰ نے اِس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ ”کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟“ یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمھارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلاشبہ تمھارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اِس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالقِ کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو، اس کے بے شمار اجزا کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزا کو جمع نہیں کر سکتا۔

نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸

پور پور تک ٹھیک بنادینے پر قادر ہیں[۴]۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے[۵]۔ پوچھتا ہے: "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟"[٦] پھر جب دِیدے پتھرا جائیں گے[۷] اور چاند بے نور ہو جائے گا

۴– یعنی بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمھارا ڈھانچا پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمھارے نازک ترین اجزائے جسم، حتیٰ کہ تمھاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

۵– اِس چھوٹے سے فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔ اِن لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اَخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انھیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں، اُسی طرح آیندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں آیندہ بھی ان کو اس کی کھُلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اِن اعمال کی جواب دِہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل اُن کی عقل انھیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اِس میں مانع ہیں۔

٦– یہ سوال اِستِفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزا کے طور پر تھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے کہ قیامت کس روز آئے گی، بلکہ مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ آتے آتے رہ کہاں گیا ہے؟

۷– اصل میں بَرِقَ الْبَصَرُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے لُغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چُندھیا جانے کے ہیں۔ لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اِسی معنی کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ خوف زدگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثے سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ٹک ٹک رہ جائے اور اُس کی نگاہ اس پریشان کُن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو، تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اِسی مضمون کو قرآنِ مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ، "اللہ تو انھیں

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾

اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں[8] گے، اُس وقت یہی انسان کہے گا: ''کہاں بھاگ کر جاؤں؟'' ہرگز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھیرنا ہوگا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔[9] بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے[10]

ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔'' (ابراہیم: ۴۲)

۸- یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظامِ عالَم کے درہم برہم ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مِل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سُورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین یکایک اُلٹی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طُلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند یک لخت زمین کی گرفت سے چھُوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔

۹- اصل الفاظ ہیں: بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنٰی ہو سکتے ہیں، اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنٰی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی، اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا، جو اس کے بعد مدت ہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنٰی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا، اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنٰی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اُسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝١٦ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۝١٧ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝١٨ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝١٩ كَلَّا بَلْ

اے نبیؐ[11]! اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں[12]، اُس وقت تم اِس کی قراءت کو غور سے سُنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے[13]۔۔۔۔ ہرگز نہیں[14]، اصل بات

اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

۱۰- یعنی آدمی کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض در حقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مجرم کو اس کا جُرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اِس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسرِ عدالت جرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اِس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چُھپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریّت یا شرک کا قائل ہے، وہ در حقیقت اس کی ایمان دارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اِس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اِن عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور اِن کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بد دیانت، ایک بدکردار، ایک حرام خور، اپنی بداعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آ جائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اِس کے باوجود اُس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

۱۱- یہاں سے لے کر ”پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے“ تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، نبوّت کے ابتدائی دَور میں، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق

پُوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلامِ الٰہی آپؐ کو سنا رہے ہیں وہ آپؐ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لیے آپؐ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اُسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اُس وقت پیش آئی جب حضرت جبریلؑ سورۂ قیامہ کی یہ آیات آپؐ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام توڑ کر آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں، اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، آپؐ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپؐ نہ بھولیں گے، نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے۔ یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام ''ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے'' سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اِس پَس منظر سے واقف نہیں ہیں، وہ اس مقام پر اِن فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اِس پَس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالبِ علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالبِ علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے۔ یہ درس اگر جُوں کا تُوں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعے سے واقف نہ ہوں گے وہ اس سلسلۂ تقریر میں اِس فقرے کو بے جوڑ محسوس کریں گے۔ لیکن جو شخص اُس اصل واقعے سے واقف ہو گا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے، وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جُوں کا تُوں نقل کیا گیا ہے، اُسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

اُوپر اِن آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے، وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نَسائی، ابنِ جَریر، طَبَرانی، بَیْہَقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ اِس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دُہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ...... یہی بات شَعْبی، ابنِ زید، ضَحّاک، حسن بصری، قَتَادَہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

۱۲ – اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام قرآن پڑھ کر سُناتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں۔''

۱۳ – اِس سے گمان ہوتا ہے، اور بعض اکابر مفسرین نے بھی اِس گمان کا اظہار کیا ہے، کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم

بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپؐ خاموشی سے اس کو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلایا گیا کہ اُس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظے میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپؐ ٹھیک اُسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشا اور مدّعا بھی پوری طرح آپؐ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اُصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنھیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اِس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا جاتا تھا، وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی، وہ بہر حال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے (قرآنِ مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب "سنّت کی آئینی حیثیت" میں صفحات ۹۴-۹۵ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدّعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی، آخر اِسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپؐ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں، تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اِس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ، "اور اَے نبیؐ! یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے۔" (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰) اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سُنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آلِ عمران، ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲۔ اِن سب آیات کی تشریح ہم "سنّت کی آئینی حیثیت" میں صفحہ ۷۴ سے ۷۷

تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو، اِس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے، کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اُس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے، وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنھیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ اُن کا حقیقی مدعا کیا ہے اور اُن میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظِ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآنِ مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عَربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعیَّن نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اِس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مراد غالبًا کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اِس اصطلاح کا مفہوم اُسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پُوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکمِ صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تعلیم آپؐ اُن سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنھوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپؐ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم اُمّت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنّت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلّق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تعلیم سے مُسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر رِوایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے

تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾

یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے مَحبّت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو[۱۵]۔ اُس روز کچھ چہرے تر و تازہ ہوں[۱۶] گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے[۱۷]۔ اور کچھ چہرے اُداس ہوں گے

اگلی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اِس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں، معاذ اللہ! وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسولؐ کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعے سے اُمّت کو کتابِ الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے، اور حدیث و سنّت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پُوری اُمّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جَعل ساز لوگ وہی سکے تو جَعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو، انھیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اِس اُمّت نے اوّل روز سے اِس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا، اُتنا ہی اِس اُمّت کے خیر خواہ اِس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے مُمیَّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مُستشرِقین کے بہکائے میں آ کر حدیث و سنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اِس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۱۴- یہاں سے سلسلۂ کلام پھر اُسی مضمون کے ساتھ جُڑ جاتا ہے جو بیچ کے جملۂ معترضہ سے پہلے چلا آ رہا تھا۔ ہرگز نہیں کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے انکارِ آخرت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ تم خالقِ کائنات کو قیامت برپا کرنے

اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دینے سے عاجز سمجھتے ہو، بلکہ اصل وجہ یہ ہے۔

۱۵- یہ انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ آیت نمبر ۵ میں بیان کی گئی تھی کہ انسان چونکہ فجور کی کُھلی چھوٹ چاہتا ہے اور اُن اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتا ہے جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُس پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس اُسے انکارِ آخرت پر اُبھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتا ہے تاکہ اپنے اِس انکار کو معقول ثابت کرے۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ بین ہیں اس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیّت اُنھی نتائج کی ہے جو اِسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیّت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ یا لذّت یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے، اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہییں، کیونکہ اسے پالیا تو گویا سب کچھ پالیا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اِسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج وغم یہاں پہنچ جائے، وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اُس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجر آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی دُور کی چیز کے لیے وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیّت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہرحال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے، خواہ اندر سے ان کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکانِ وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو اِستدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بودا ہے۔

۱۶- یعنی خوشی سے دَمک رہے ہوں گے، کیونکہ جس آخرت پر وہ ایمان لائے تھے وہ ٹھیک اُن کے یقین کے مطابق سامنے موجود ہوگی، اور جس آخرت پر ایمان لا کر انھوں نے دنیا کے ناجائز فائدے چھوڑے اور برحق نقصان برداشت کیے تھے اس کو فی الواقع اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے دیکھ کر انھیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنے رَوِیّۂ زندگی کے متعلق بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا، اب وہ وقت آ گیا ہے جب وہ اس کا بہترین انجام دیکھیں گے۔

۱۷- مفسّرین میں سے بعض نے اسے مجازی معنیٰ میں لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی کی طرف دیکھنے کے الفاظ محاورے کے طور پر اُس سے توقعات وابستہ کرنے، اس کے فیصلے کا انتظار کرنے، اس کے کرم کا امیدوار ہونے کے معنیٰ میں بولے جاتے ہیں، حتّٰی کہ ایک اندھا بھی یہ کہتا ہے کہ میری نگاہیں تو فُلاں شخص کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ میرے لیے کیا کرتا ہے۔ لیکن بکثرت احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی جو تفسیر منقول ہے وہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے مکرّم بندوں کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہوگا۔ بخاری کی رِوایت ہے کہ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا ”تم اپنے رب کو عَلانیہ دیکھو گے۔“ مسلم اور ترمذی میں حضرت صُہَیب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب جنّتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں مزید کچھ دوں؟ وہ عرض کریں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا اور جہنم سے بچا نہیں لیا؟ اِس پر اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا دے گا اور اُن لوگوں کو جو کچھ انعامات ملے تھے، ان میں سے کوئی انعام بھی اُنھیں اِس سے زیادہ محبوب نہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کی دِید سے مُشرّف ہوں، اور یہی وہ مزید انعام ہے جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَۃٌ۔ یعنی ''جن لوگوں نے نیک عمل کیا ان کے لیے اچھا اجر ہے اور اس پر مزید بھی۔'' (یونس: ۲۶) بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خُدریؓ اور حضرت ابوہُریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کو دیکھیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی دقّت ہوتی ہے جب کہ بیچ میں بادل بھی نہ ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے رب کو دیکھو گے۔ اسی مضمون سے ملتی جُلتی ایک اور روایت بخاری و مسلم میں حضرت جَریر بن عبداللہؓ سے مروی ہے۔ مُسندِ احمد، تِرمِذی، دارقُطنی، ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، طَبَرانی، بَیہَقی، ابنِ ابی شَیبَہ اور بعض دوسرے محدثین نے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ اہلِ جنت میں کم سے کم درجے کا جو آدمی ہوگا وہ اپنی سلطنت کی وسعت دو ہزار سال کی مَسافت تک دیکھے گا، اور ان میں سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگ ہر روز دو مرتبہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ پھر حضورؐ نے یہی آیت پڑھی کہ ''اُس روز کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔'' ابنِ ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف دیکھیں گے، پھر جب تک اللہ ان سے پردہ نہ فرما لے گا، اس وقت تک وہ جنّت کی کسی نعمت کی طرف توجہ نہ کریں گے اور اسی کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ یہ اور دوسری بہت سی رِوایات ہیں جن کی بنا پر اہل السنّت قریب قریب بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ آخرت میں اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرّف ہوں گے۔ اور اس کی تائید قرآنِ مجید کی اِس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ''ہرگز نہیں، وہ (یعنی کُفّار) اُس روز اپنے رب کی دِید سے محروم ہوں گے۔'' (اَلمُطَفِّفین: ۱۵) اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ محرومی کُفّار کے لیے ہوگی، نہ کہ اَبرار کے لیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان خدا کو دیکھ کیسے سکتا ہے؟ دیکھنے کے لیے تو لازم ہے کہ کوئی چیز کسی خاص جہَت، مقام، شکل اور رنگ میں سامنے موجود ہو، روشنی کی شعاعیں اُس سے منعکس ہو کر انسان کی آنکھ پر پڑیں اور آنکھ سے دماغ کے مرکزِ بینائی تک اس کی تصویر منتقل ہو۔ کیا اللہ رب العالمین کی ذات کے متعلق اِس طرح قابلِ دید ہونے کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسان اس کو دیکھ سکے؟ لیکن یہ سوال دراصل ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں دو چیزوں کے درمیان فرق نہیں کیا گیا ہے۔ ایک چیز ہے دیکھنے کی حقیقت، اور دوسری چیز ہے دیکھنے کا فعل صادر ہونے کی وہ خاص صورت جس سے ہم اِس دنیا میں آشنا ہیں۔ دیکھنے کی حقیقت یہ ہے کہ

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ

اور سمجھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے۔ ہرگز نہیں[18]، جب جان حلق تک پہنچ جائے گی، اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھُونک کرنے والا[19]، اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جُدائی کا وقت ہے، اور پنڈلی سے پنڈلی جُڑ جائے گی[20]، وہ دن ہو گا تیرے رب

دیکھنے والے میں بینائی کی صفت موجود ہو، وہ نابینا نہ ہو، اور دیکھی جانے والی چیز اُس پر عیاں ہو، اس سے مخفی نہ ہو۔ لیکن دنیا میں ہم کو جس چیز کا تجربہ اور مُشاہدہ ہوتا ہے وہ صرف دیکھنے کی وہ خاص صورت ہے جس سے کوئی انسان یا حیوان بالفعل کسی چیز کو دیکھا کرتا ہے، اور اس کے لیے لامحالہ یہ ضروری ہے کہ دیکھنے والے کے جسم میں آنکھ نامی ایک عُضو موجود ہو، اُس عضو میں بینائی کی طاقت پائی جاتی ہو، اُس کے سامنے ایک ایسی محدود مجسّم رنگ دار چیز حاضر ہو جس سے روشنی کی شعاعیں منعکس ہو کر آنکھ پر پڑیں، اور آنکھ میں اس کی شکل سما سکے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے کی حقیقت کا عملی ظہور صرف اُسی خاص صورت میں ہو سکتا ہے جس سے ہم اِس دنیا میں واقف ہیں، تو یہ خود اُس کے اپنے دماغ کی تنگی ہے، ورنہ درحقیقت خدا کی خدائی میں دیکھنے کی ایسی بے شمار صورتیں ممکن ہیں جن کا ہم تصوُّر بھی نہیں کر سکتے۔ اِس مسئلے میں جو شخص اُلجھتا ہے، وہ خود بتائے کہ اُس کا خدا بینا ہے یا نابینا؟ اگر وہ بینا ہے اور اپنی ساری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے، تو کیا وہ اِسی طرح آنکھ نامی ایک عُضو سے دیکھ رہا ہے جس سے دنیا میں انسان وحیوان دیکھ رہے ہیں، اور اُس سے بینائی کے فعل کا صُدور اُسی طریقے سے ہو رہا ہے جس طرح ہم سے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، اور جب اس کا جواب نفی میں ہے، تو آخر کسی صاحبِ عقل وفہم انسان کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ آخرت میں اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار اُس مخصوص شکل میں نہیں ہو گا جس میں انسان دنیا میں کسی چیز کو دیکھتا ہے، بلکہ وہاں دیکھنے کی حقیقت کچھ اور ہو گی جس کا ہم یہاں اِدراک نہیں کر سکتے؟ واقعہ یہ ہے کہ آخرت کے معاملات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ہمارے لیے اُس سے زیادہ مشکل ہے جتنا ایک دو برس کے بچے کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اِزدِواجی زندگی کیا ہوتی ہے، حالانکہ جوان ہو کر اُسے خود اُس سے سابقہ پیش آنا ہے۔

۱۸– اس ''ہرگز نہیں'' کا تعلق اُسی سلسلۂ کلام سے ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا ہے، یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ تمھیں مر کر فنا ہو جانا ہے اور اپنے رب کے حُضور واپس جانا نہیں ہے۔

۱۹– اصل میں لفظ رَاقٍ استعمال ہوا ہے، جو رُقیہ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے، جس کے معنی تعویذ گنڈے اور

يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾

کی طرف روانگی کا۔[۲۰]

مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا، پھر اکڑتا ہُوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔[۲۱] یہ رَوِش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں، یہ روِش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔[۲۲]

جھاڑ پھونک کے ہیں، اور رَقی سے بھی، جس کے معنٰی چڑھنے کے ہیں۔ اگر پہلے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آخر وقت میں جب مریض کے تیماردار ہر دوا دارو سے مایوس ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ ارے، کسی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کو تلاش کرو جو اِس کی جان بچالے۔ اور اگر دوسرے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اُس وقت فرشتے کہیں گے کہ اِس رُوح کو کسے لے کر جانا ہے؟ ملائکۂ عذاب کو یا ملائکۂ رحمت کو؟ بالفاظِ دیگر اُسی وقت یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ مرنے والا کس حیثیت میں عالَمِ آخرت کی طرف جا رہا ہے۔ نیک انسان ہوگا تو ملائکۂ رحمت اسے لے جائیں گے، اور بد انسان ہوگا تو رحمت کے فرشتے اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے اور عذاب کے فرشتے اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔

۲۰ - مفسّرین میں سے بعض نے لفظِ ساق (پنڈلی) کو عام لُغوی معنٰی میں لیا ہے، اور اس کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے وقت جب ٹانگیں سُوکھ کر ایک دوسری سے جُڑ جائیں گی۔ اور بعض نے عربی محاورے کے مطابق اِسے شدّت اور سختی اور مصیبت کے معنٰی میں لیا ہے، یعنی اُس وقت دو مصیبتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گی: ایک دنیا اور اس کی ہر چیز سے جدا ہو جانے کی مصیبت، اور دوسری عالَمِ آخرت میں ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہو کر جانے کی مصیبت، جس سے ہر کافر و منافق اور ہر فاسق و فاجر کو سابقہ پیش آئے گا۔

۲۱ - مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سُنا جو اُوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار ہی پر اَڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ مجاہد، قَتادَہ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ یہ شخص ابوجہل تھا۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص تھا جس نے سورۂ قیامہ کی مذکورۂ بالا آیات سننے کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

اس آیت کے یہ الفاظ کہ "اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی" خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کرنے کا اوّلین اور لازمی تقاضا یہ ہے

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ﴿۳۶﴾ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ

کیا[۲۳] انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مُہمَل چھوڑ دیا جائے گا؟[۲۴] کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا

کہ آدمی نماز پڑھے۔ شریعتِ الٰہی کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد ہی میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدّت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آ جاتا ہے اور اُسی وقت یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ واقعی اس کے دل کی آواز ہے یا محض ایک ہوا ہے جو اُس نے چند الفاظ کی شکل میں منہ سے نکال دی ہے۔

۲۲- مفسّرین نے اَوْلٰی لَکَ کے متعدد معنی بیان کیے ہیں: تُف ہے تجھ پر۔ ہلاکت ہے تیرے لیے۔ خرابی، یا تباہی، یا کمبختی ہے تیرے لیے۔ لیکن ہمارے نزدیک موقع و محل کے لحاظ سے اس کا مناسب ترین مفہوم وہ ہے جو حافظ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "جب تُو اپنے خالق سے کفر کرنے کی جرأت کر چکا ہے تو پھر تجھ جیسے آدمی کو یہی چال زیب دیتی ہے جو تُو چل رہا ہے۔" یہ اُسی طرح کا طنزیہ کلام ہے جیسے قرآنِ مجید میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں عذاب دیتے ہوئے مجرم انسان سے کہا جائے گا کہ ذُقۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ، "لے چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تُو۔" (الدُّخان: ۴۹)

۲۳- اب کلام کو ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کا اعادہ کیا جا رہا ہے جس سے کلام کا آغاز کیا گیا تھا، یعنی زندگی بعدِ موت ضروری بھی ہے اور ممکن بھی۔

۲۴- عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اُس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو، جدھر چاہے چرتا پھرے، کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اِسی معنی میں ہم شُترِ بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شُترِ بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پُرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآنِ مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا: اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمھیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمھیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے؟" (المؤمنون: ۱۱۵) ان دونوں مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمھیں اپنے اور جانور میں یہ کُھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم با اختیار، اس کے افعال میں اَخلاقی حُسن و قُبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمھارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح

مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾ ع

جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا دُرست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اِس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟[۲۵] ع

جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے، اسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھائے جانے کی معقول وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے صرف اپنی جِبلّت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا، نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سُنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل دَر نسل چلتے رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے، کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پُرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو، جب کہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اَخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مُستوجِب ہونے کا تمھاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی اچانک کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمھارے نزدیک اس کو بَلُّوہ (scot free) چھُوٹ جانا چاہیے اور اِس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمھاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اسے بھی کسی بُھنگے یا ٹِڈّے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دِہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی ہو اور جیتے جی مصیبتیں ہی بُھگتتا رہا ہو کیا تمھارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اِس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

۲۵- یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی دلیل ہے۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلّق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے تو فی الحقیقت اس دلیل کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈِھٹائی برتیں، ان کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اِس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے، وہ دوبارہ بھی اِسی انسان کو

وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اِس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اگر ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اِس بات کی کیا توجیہ ہے کہ آغازِ آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصّے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیّت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اِس تناسُب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آیندہ اُس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اِتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اُٹھ کر بے تکلّف ایک روز یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ (بیجنگ) اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حواشی ۲۷ تا ۳۰۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۷)

متعدّد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اِس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں)، کبھی سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات، خداوندا! کیوں نہیں) اور کبھی سُبْحٰنَکَ فَبَلٰی یا سُبْحٰنَکَ وَبَلٰی فرمایا کرتے تھے۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابوداؤد) ابوداؤد میں حضرت ابوہُرَیرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سورۂ تِین میں آیت اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟) پڑھو تو کہو: بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (کیوں نہیں، مَیں اِس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں) اور جب سورۂ قیامہ کی یہ آیت پڑھو تو کہو: بَلٰی۔ اور جب سورۂ مُرسَلات کی آیت فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (اس قرآن کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟) پڑھو تو کہو: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (ہم اللہ پر ایمان لائے)۔ اسی مضمون کی روایات امام احمد، تِرمِذی، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیہ، بَیْہَقی اور حاکم نے بھی نقل کی ہیں۔

تفہیم القرآن

الدہر

(۷۶)

الدھر

نام

اِس سورت کا نام "الدّہر" بھی ہے اور "الانسان" بھی۔ دونوں نام پہلی ہی آیت کے الفاظ هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ اور حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ سے ماخوذ ہیں۔

زمانۂ نُزُول

اکثر مفسّرین اس کو مکّی قرار دیتے ہیں۔ علّامہ زَمَخشَری، امام رازی، قاضی بَیضاوِی، علّامہ نظام الدین نَیسا بُوری، حافظ ابنِ کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اِسے مکّی ہی لکھا ہے، اور علّامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جُمہور کا قول ہے۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے پوری سورت کو مدنی کہا ہے، اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ہے تو مکّی، مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔

جہاں تک اِس سورت کے مضامین اور اندازِ بیان کا تعلق ہے، وہ مدنی سورتوں کے مضامین اور اندازِ بیان سے بہت مختلف ہے، بلکہ اس پر غور کرنے سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف مکّی ہے بلکہ مکۂ معظّمہ کے بھی اُس دَور میں نازل ہوئی ہے جو سورۂ مُدَّثِّر کی ابتدائی سات آیات کے بعد شروع ہوا تھا۔ رہیں آیات ۸ تا ۱۰ (وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ سے لے کر یَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِیۡرًا تک) تو وہ پوری سورت کے سلسلۂ بیان میں اِس طرح پیوست ہیں کہ سِیاق وسَباق کے ساتھ کوئی اُن کو پڑھے تو ہرگز یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ اِن سے پہلے اور بعد کا مضمون تو ۱۵-۱۶ سال پہلے نازل ہوا تھا اور اُس کے کئی سال بعد نازل ہونے والی یہ تین آیتیں یہاں لا کر ثبت کر دی گئیں۔

دراصل جس بنا پر اِس سورت کے، یا اِس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے، وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچوں کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی خادمہ فِضَّہؓ نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرما دی تو یہ سب شُکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ دونوں تندرست ہو گئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ حضرت علیؓ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔

انھوں نے تین صاع جَو قرض لیے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کرکے حاصل کیے)۔ پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے بعد کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک یتیم آ گیا اور اس نے سوال کیا۔ اُس روز بھی سارا کھانا انھوں نے اُس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آ کر وہی سوال کر دیا اور اُس روز کا بھی پورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؓ دونوں بچوں کو لیے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ بھوک کی شدّت سے تینوں باپ بیٹوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپؐ اُٹھ کر اُن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نڈھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رقّت طاری ہوگئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انھوں نے عرض کیا کہ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اہلِ بیت کے معاملے میں آپؐ کو مبارک باد دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب میں یہ پوری سورت آپؐ کو پڑھ کر سنائی۔ (ابنِ مِہران کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ سے لے کر آخر تک کی آیات سنائیں۔ مگر ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ ...... حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اِس قصّے کا اُس میں کوئی ذکر نہیں ہے)۔ یہ پورا قصّہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البَسِیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اُسی سے زَمَخْشَرِی، رازی اور نَیسابُوری وغیرہم نے اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت اوّل تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے۔ پھر دِرایت کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر آ کر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے۔ پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے، انھیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہمِ دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہوگا۔ اِس کے علاوہ قیدیوں کے معاملے میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دَور میں کبھی نہیں رہا کہ انھیں بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کی خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی، اور کسی شخص کے سُپرد کیے جاتے تو وہ شخص انھیں کھلانے پلانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس لیے مدینۂ طیّبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک

مانگنے کے لیے نکلتا۔ تاہم اِن تمام نقلی اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اِس قصّے کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اِس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس نیک عمل کا صُدُور ہوا تو جبریلؑ نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپؐ کے اہلِ بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہوا ہے، کیونکہ اُنھوں نے ٹھیک وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سورۂ دہر کی اِن آیات میں فرمائی ہے۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اِسی موقع پر ہوئی تھیں۔ شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی، تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اِس واقعے پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سُیُوطی نے اِتقان میں حافظ ابنِ تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فُلاں معاملے میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے، اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو۔" آگے چل کر وہ امام بدرالدین زَرکشی کا قول اُن کی کتاب البُرہان فی عُلوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ "صحابہؓ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اِس معاملے پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اِس واقعے کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اُس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے، نہ کہ بیانِ واقعہ کی۔" (الاِتقان فی علوم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)

موضوع اور مضمون

اِس سورہ کا موضوع انسان کو دنیا میں اُس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی اِس حیثیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر شکر کا رَوَیّہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کفر کی راہ چلے تو کس انجام سے وہ دوچار ہوگا۔ قرآن کی بڑی سورتوں میں تو یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن ابتدائی مکّی دَور کی سورتوں کا یہ خاص اندازِ بیان ہے کہ جو باتیں بعد کے دَور میں مفصّل ارشاد ہوئی ہیں، وہی اِس دَور میں بڑے مختصر مگر انتہائی مؤثر طریقے سے ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقرے استعمال کیے گئے ہیں جو سننے والوں کی زبان پر خودبخود چڑھ جائیں۔

اِس میں سب سے پہلے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب وہ کچھ نہ تھا، پھر ایک مخلوط نُطفے سے اُس کی ایسی حقیر سی ابتدا کی گئی کہ اُس کی ماں تک کو خبر نہ تھی کہ اُس کے وجود کی بنا پڑ گئی ہے اور کوئی اُس خُردبینی وجود کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے

جو آگے چل کر اِس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے۔ اس کے بعد انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اِس طرح کر کے تجھے یہ کچھ ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش گوش رکھنے والا بنایا گیا اور تیرے سامنے شُکر اور کفر کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے گئے، تاکہ یہاں کام کرنے کا جو وقت تجھے دیا گیا ہے، اس میں تُو دکھا دے کہ اس امتحان سے تو شاکر بندہ بن کر نکلا ہے یا کافر بندہ بن کر۔

پھر صرف ایک آیت میں دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اِس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے، انھیں آخرت میں کیا انجام دیکھنا ہوگا۔

اس کے بعد آیت ۵ سے ۲۲ تک مسلسل اُن انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ اپنے رب کے ہاں نوازے جائیں گے جنھوں نے یہاں بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ اِن آیات میں صرف اُن کی بہترین جزا بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُن کے وہ کیا اعمال ہیں جن کی بنا پر وہ اِس جزا کے مستحق ہوں گے۔ مکّی دَور کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصوّرات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اَخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابلِ قدر ہیں، اور کہیں اعمال و اخلاق کی اُن برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اِس لحاظ سے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ ان کا کیا اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی اِس عارضی زندگی میں نکلتا ہے، بلکہ صرف اِس حیثیت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کی ابدی اور پائدار زندگی میں اُن کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا، قطعِ نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بُری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔

یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ اس کے بعد دوسرے رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کر کے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک یہ کہ دراصل یہ ہم ہی ہیں جو اِس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تم پر نازل کر رہے ہیں، اور اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ کفّار کو خبردار کرنا ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نازل کرنے والے ''ہم'' ہیں اور ہماری حکمت ہی اِس کی مُقتضی ہے کہ اسے یک بارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کریں۔ دوسری بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمائی گئی ہے کہ تمھارے رب کا فیصلہ صادر ہونے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، اور اس دَوران میں تم پر خواہ کچھ ہی گزر جائے، بہرحال تم صبر کے ساتھ اپنا فریضۂ رسالت انجام دیے چلے جاؤ اور کبھی اِن بدعمل اور منکرِ حق لوگوں میں سے کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ تیسری بات آپؐ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ شب و روز اللہ کو یاد کرو، نماز پڑھو اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارو،

کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے کفر کی طُغیانی کے مقابلے میں اللہ کی طرف بلانے والوں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

پھر ایک فقرے میں کفار کے غلط رَوِیے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آخرت کو بھول کر دنیا پر فریفتہ ہو گئے ہیں، اور دوسرے فقرے میں اُن کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تم خود نہیں بن گئے ہو، ہم نے تمھیں بنایا ہے، یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں تم نے خود اپنے لیے نہیں بنالیے ہیں، ان کے بنانے والے بھی ہم ہی ہیں، اور یہ بات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے کہ جو کچھ ہم تمھارے ساتھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ تمھاری شکلیں بگاڑ سکتے ہیں۔ تمھیں ہلاک کر کے کوئی دوسری قوم تمھاری جگہ لا سکتے ہیں۔ تمھیں مار کر دوبارہ جس شکل میں چاہیں تمھیں پیدا کر سکتے ہیں۔

آخر میں کلام اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ یہ ایک کلمۂ نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔ مگر دنیا میں انسان کی چاہت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کسی کی چاہت بھی پوری نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہے، اور اللہ کی چاہت اندھا دُھند نہیں ہے، وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنا پر چاہتا ہے۔ اِس علم اور حکمت کی بنا پر جسے وہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور جسے وہ ظالم پاتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب کا انتظام اس نے کر رکھا ہے۔

---

۳۱ آیاتہا

سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا؟[۱]

۱ – پہلا فقرہ ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ۔ اکثر مُفسّرین ومُترجمین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنٰی میں لیا ہے، اور وہ اس کے معنٰی یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں ''کیا'' کے معنٰی ہی میں استعمال ہوتا ہے، اور اِس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فُلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں: ''کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟'' کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے، اور یہ انکار ہم اِس انداز میں کرتے ہیں کہ ''کیا یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟'' کبھی ہم ایک شخص سے کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں اور اِس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا میں نے تمھاری رقم ادا کر دی؟'' اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اِس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ مُخاطَب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبُور کر دیں جو لازماً اُس کے اقرار سے بطورِ نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں: ''کیا میں نے تمھارے ساتھ کوئی بُرائی کی ہے؟'' اِس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اُس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے، بلکہ اُسے یہ سوچنے پر مجبُور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے، اس کے ساتھ میں بُرائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیتِ زیرِ بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اِسی آخری معنٰی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اُس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبُور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اُس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا، وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہوگا؟

دوسرا فقرہ ہے: حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ۔ دہر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، اور حِین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اِس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مُدعا یہ ہے کہ اِس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوعِ انسانی ہی موجود نہ تھی۔ پھر اُس میں ایک وقت ایسا آیا جب انسان نام کی ایک نوع کا آغاز کیا گیا۔ اور

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝۲ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّ إِمَّا كَفُورًا ۝۳

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا[۲] تاکہ اس کا امتحان لیں[۳]، اور اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا[۴]۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شُکر کرنے والا بنے یا کُفر کرنے والا[۵]۔

اِسی زمانے کے اندر ہر شخص پر ایک ایسا وقت آیا ہے جب اسے عَدَم سے وجود میں لانے کی ابتدا کی گئی۔

تیسرا فقرہ ہے: لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا، یعنی اُس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اُس کا ایک حصّہ باپ کے نُطفے میں ایک خُردبینی کیڑے کی شکل میں اور دوسرا حصّہ ماں کے نُطفے میں ایک خُردبینی بیضے کی شکل میں موجود تھا۔ مدت ہائے دراز تک تو انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ اِس کیڑے اور بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقت ور خُردبینوں سے اِن دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اِس کیڑے میں اور کتنا ماں کے اِس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت ان دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خَلِیّہ (cell) وجود میں آتا ہے، وہ ایک ایسا ذرّۂ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقت ور خُردبین ہی سے نظر آ سکتا ہے، اور اسے دیکھ کر بھی بادی النظر میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے، نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اِس حقیر سی ابتدا سے نَشوونُما پا کر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قد وقامت، کس شکل و صورت، کس قابلیّت اور شخصیّت کا انسان ہوگا۔ یہی مطلب ہے اِس ارشاد کا کہ اُس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا اگرچہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کا آغاز ہو گیا تھا۔

۲- ''ایک مخلوط نُطفے'' سے مُراد یہ ہے کہ انسان کی پیدایش مرد اور عورت کے دو الگ الگ نطفوں سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ دونوں نُطفے مل کر جب ایک ہو گئے تب اُس مُرکّب نُطفے سے انسان پیدا ہوا۔

۳- یہ ہے دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدّت تک اپنے حصّے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دنیا اُس کے لیے نہ دار العذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دار الجزا ہے، جیسا کہ تناسُخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادّہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رَزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عُمر سمجھتا ہے، حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرُّف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن

حیثیتوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اِس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اِس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔ اور اُس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اِس پر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا، اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اُسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدا، یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جواب دِہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جواب دِہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ (یہ مضمون قرآنِ مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پُوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرستِ موضوعات کے اندر لفظ ''آزمائش'' نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اِس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو)۔

۴- اصل میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا'' اِس کا مفہوم صحیح طور پر ''ہوش گوش رکھنے والا بنایا'' سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنٰی ''سننے والا'' اور بصیر کے معنٰی ''دیکھنے والا'' کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ یہی ہے، مگر ہر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے، حالانکہ وہ بھی سننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سننے اور دیکھنے سے مراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مُراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائعِ علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں، اس لیے اختصار کے طور پر صرف انھی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں، وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے ہیں، کیونکہ اس کے ہر حاسّہ کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعے سے آنے والی معلومات کو جمع کر کے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے، اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رَوِیّہ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کر کے ہم اس کا امتحان لینا چاہتے تھے، یہ ارشاد فرمانا کہ اِسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا، دراصل یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب

محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا ہی ہو، تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مُستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم وعقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵- یعنی ہم نے اسے محض علم وعقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شُکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کون سا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمّہ دار وہ خود ہو۔ سورۂ بَلَد میں یہی مضمون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ''اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر وشر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے۔'' اور سورۂ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے: وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا، ''اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے۔'' اِن تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآنِ مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ''راستہ دکھانے'' سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے، بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

(۱) ہر انسان کو علم وعقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اَخلاقی حِس بھی دی گئی ہے، جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو بُرا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتّٰی کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض وخواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی بُرائیوں کو اُنھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ وہی بُرائیاں اگر کوئی دوسرا اُن کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اُٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ اُن کو بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جَہالت اور حماقت اور دقیانوسیّت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اُس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبُور ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو، یا کر رہا ہو، یا کر چکا ہو۔ اِس ضمیر کو خواہ انسان کتنی ہی تھپکیاں دے کر سُلائے، اور اس کو بے حِس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، لیکن وہ اسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ڈِھیٹ بن کر اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے، وہ حجتیں نگھار کر دنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے، وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے لیے بے شمار

عذرات تراش سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اللہ نے اس کی فطرت میں جو مُحاسِب بٹھا رکھا ہے، وہ اتنا جان دار ہے کہ کسی بُرے انسان سے یہ بات چھُپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ ''انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔'' (آیت ۱۵)

(۳) انسان کے اپنے وجود میں اور اُس کے گردوپیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے خدا اِس کارخانۂ ہستی کے بنانے والے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح آفاق اور اَنفُس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر اِن سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر اِن پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چُرائے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

(۴) انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجرِبات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مَشِیّت ہر چیز پر غالب ہے، اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجرِبات و مُشاہدات صرف خارج ہی میں اِس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے، جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی، بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

(۵) انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جرم کی سزا اور عُمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اِسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے، اور جن خدمات کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مُکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مُسَلَّم ہے کہ اِس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پُوری سزا تو درکنار، سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جا سکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کر لے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصوُّر رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب اُس کے ذمّے رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصوُّر آخر آ کہاں سے گیا؟

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَا۠ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا ④ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ⑥ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ

کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔

نیک لوگ[6] (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پییں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی، یہ ایک بہتا چشمہ[7] ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے[8] شراب پییں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے۔[9] یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دُنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں[10]، اور

(۲) اِن تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دنیا میں انبیاؑ بھیجے اور کتابیں نازل کیں، جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شُکر کی راہ کون سی ہے اور کُفر کی راہ کون سی اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاؑ اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات، بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اِتنے بڑے پیانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصوّر، آخرت کے تصوّر، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اَخلاقی اُصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاؑ اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاؑ اور کتابوں کے منکر ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنھی کی تعلیمات سے چھَن چھَن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اِن چیزوں کا اصل ماخذ کون سا ہے۔

۶- اصل میں لفظ ابرار استعمال ہوا ہے، جس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی اطاعت کا حق ادا کیا ہو، اُس کے عائد کیے ہوئے فرائض بجا لائے ہوں، اور اُس کے منع کیے ہوئے افعال سے اجتناب کیا ہو۔

۷- یعنی وہ کافور ملا ہوا پانی نہ ہوگا بلکہ ایسا قدرتی چشمہ ہوگا جس کے پانی کی صفائی اور ٹھنڈک اور خوشبو کافور سے ملتی جُلتی ہوگی۔

۸- عِبادُاللہ (اللہ کے بندے) یا عبادالرحمٰن (رحمٰن کے بندے) کے الفاظ اگرچہ لُغوی طور پر تمام انسانوں کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب ہی خدا کے بندے ہیں، لیکن قرآن میں جہاں بھی یہ الفاظ آئے ہیں،

ان سے نیک بندے ہی مراد ہیں۔ گویا کہ بدلوگ، جنھوں نے اپنے آپ کو بندگی سے خارج کر رکھا ہو، اِس قابل نہیں ہیں کہ اُن کو اللہ تعالیٰ اپنے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے عِباد اللہ یا عِباد الرحمٰن کے معزّز خطاب سے نوازے۔

۹- یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں وہ کُدال پھاوڑے لے کر نالیاں کھودیں گے اور اس طرح اس چشمے کا پانی جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے، بلکہ ان کا ایک حکم اور اشارہ اس کے لیے کافی ہوگا کہ جنت میں جہاں وہ چاہیں اُسی جگہ وہ چشمہ پھوٹ بہے۔ بسہولت نکال لینے کے الفاظ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۰- نذر پوری کرنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب کیا گیا ہو، اُسے وہ پورا کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے خود اپنے اُوپر واجب کرلیا ہو، یا بالفاظِ دیگر، جس کام کے کرنے کا اس نے عہد کیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب ہو، خواہ وہ اُس پر واجب کیا گیا ہو یا اُس نے خود اپنے اُوپر واجب کرلیا ہو، اسے وہ پُورا کرے۔ اِن تینوں مفہُومات میں سے زیادہ معروف مفہوم دوسرا ہے اور عام طور پر لفظِ نذر سے وہی مراد لیا جاتا ہے۔ بہرحال یہاں اُن لوگوں کی تعریف یا تو اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائدکردہ واجبات کو پورا کرتے ہیں، یا اِس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ ایسے نیک لوگ ہیں کہ جو خیر اور بھلائی کے کام اللہ نے ان پر واجب نہیں کیے ہیں، ان کو بھی انجام دینے کا جب وہ اللہ سے عہد کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، کجا کہ اُن واجبات کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کریں جو اللہ نے ان پر عائد فرمائے ہیں۔

جہاں تک نذر کے احکام کا تعلق ہے، اُن کو مختصر طور پر ہم تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۱۰ میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُن کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے، تاکہ لوگ نذر کے معاملے میں جو غَلَطیاں کرتے ہیں یا جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، ان سے بچ سکیں اور نذر کے صحیح قواعد سے واقف ہو جائیں:

(۱) فقہانے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں: ایک، یہ کہ ایک آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اُس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے، یہ کہ وہ اِس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فُلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فُلاں نیک کام کروں گا۔ اِن دونوں قسم کی نذروں کو فقہا کی اصطلاح میں نذرِ تَبَرُّر (نیکی کی نذر) کہتے ہیں اور اِس پر اتفاق ہے کہ اسے پُورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے، یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کرلے۔ چوتھے، یہ کہ آدمی کوئی مُباح کام کرنے کو اپنے اُوپر لازم کرلے، یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا، یا کوئی خلافِ اَولیٰ کام کرنے کا عہد کرلے۔ ان دونوں قسموں کی نذروں کو فقہا کی اصطلاح میں نذرِ لَجاج (جہالت اور جھگڑالوپن اور ضد کی نذر) کہتے ہیں۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی، اور چوتھی قسم کے متعلق فقہا میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفّارہ ادا کر دینا چاہیے، اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے، یا کفّارہ ادا کر دے۔

شافعیوں اور مالکیوں کے نزدیک یہ نذر بھی سرے سے منعقد نہیں ہوتی۔ اور حنفیوں کے نزدیک دونوں قسموں کی نذروں پر کفارہ لازم آتا ہے۔ (عُمدۃ القاری)

(۲) متعدِّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نذر ماننے سے منع فرمایا ہے جو یہ سمجھتے ہوئے مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی، یا جس میں کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے لیے بطورِ شکر کرنے کے بجائے آدمی اللہ تعالیٰ کو بطورِ معاوضہ یہ پیش کش کرے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں آپ کے لیے فلاں نیک کام کر دوں گا۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ اَخَذ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینھٰی عن النذر ویقول انہ لا یردّ شیئًا وانما یُسْتَخْرَجُ بہ من البخیل۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ نذر ماننے سے منع کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ وہ کسی ہونے والی چیز کو پھیر نہیں سکتی، البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (مسلم، ابوداؤد) حدیث کے آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ بخیل یوں تو راہِ خدا میں مال نکالنے والا نہ تھا، نذر کے ذریعے سے اِس لالچ میں وہ کچھ خیرات کر دیتا ہے کہ شاید یہ معاوضہ قبول کر کے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقدیر بدل دے۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: النّذرُ لا یُقَدِّمُ شَیْئًا ولا یُؤَخِّرُہٗ وانما یُسْتَخْرَجُ بہٖ من البخیل۔ ''نذر نہ کوئی کام پہلے کرا سکتی ہے، نہ کسی ہوتے کام میں تاخیر کرا سکتی ہے۔ البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل کے ہاتھ سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم) ایک اور روایت میں وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا: انہ لا یاتی بخیرو انما یستخرج بہ من البخیل۔ ''اس سے کوئی کام بنتا نہیں ہے، البتہ اس کے ذریعے سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم) تقریباً اسی مضمون کی متعدِّد روایات مسلم نے حضرت ابوہُرَیرہؓ سے نقل کی ہیں، اور ایک روایت بخاری و مسلم دونوں نے نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان النذر لا یقرِّب من ابن اٰدمَ شیئًا لم یکن اللّٰہ قدرہ لہٗ ولٰکن النذر یوافقُ القدر فیُخرجُ بذالک من البخیل ما لم یکن البخیل یرید ان یُّخرِجَ۔ ''درحقیقت نذر ابنِ آدم کو کوئی ایسی چیز نہیں دلوا سکتی جو اللہ نے اس کے لیے مقدّر نہ فرمائی ہو، لیکن نذر ہوتی تقدیر کے مطابق ہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تقدیرِ الٰہی وہ چیز بخیل کے پاس سے نکال لاتی ہے جسے وہ کسی اور طرح نکالنے والا نہ تھا''۔ اسی مضمون پر مزید روشنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی اس روایت سے پڑتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما النذر ما ابتُغِیَ بہٖ وجہُ اللّٰہ ''اصل نذر تو وہ ہے جس سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو۔'' (طَحاوِی)

(۳) نذر کے معاملے میں ایک اور قاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ صرف وہ نذر پوری کرنی چاہیے جو اللہ کی اطاعت میں ہو۔ اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر ہرگز پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایسی چیز میں کوئی نذر نہیں ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو، یا ایسے کام میں کوئی نذر نہیں ہے جو انسان کے بس میں نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من نذر ان یطیع اللّٰہ فَلْیُطِعْہُ ومن نذر ان یعص اللّٰہ

فلا یعصہ۔" جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہیے، اور جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اسے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، طحاوی) ثابت بن ضحّاک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا وفاء لنذرٍ فی معصیة اللّٰہ ولا فیما لا یملك ابن اٰدم۔" اللہ کی نافرمانی میں کسی نذر کے پورا کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ کسی ایسی چیز میں جو آدمی کی مِلکیّت میں نہ ہو۔" (ابوداؤد) مسلم نے اسی مضمون کی رِوایت حضرت عمرانؓ بن حُصَین سے نقل کی ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص کی روایت اس سے زیادہ مفصّل ہے جس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لا نذر ولا یمین فی مالا یملك ابن اٰدم، ولا فی معصیة اللّٰہ، ولا فی قطیعة رحمٍ۔" کوئی نذر اور کوئی قسم کسی ایسے کام میں نہیں ہے جو آدمی کے بس میں نہ ہو، یا اللہ کی نافرمانی میں ہو، یا قطعِ رحمی کے لیے ہو۔"

(۴) جس کام میں بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور آدمی نے خواہ مخواہ کسی فضول کام، یا ناقابلِ برداشت مشقّت، یا محض تعذیبِ نفس کو نیکی سمجھ کر اپنے اوپر لازم کرلیا ہو، اُس کی نذر پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اِس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا، ایک صاحب دھوپ میں کھڑے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کون ہیں اور کیسے کھڑے ہیں؟ عرض کیا گیا: یہ ابو اسرائیل ہیں، اِنھوں نے نذر مانی ہے کہ کھڑے رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، نہ سایہ کریں گے، نہ کسی سے بات کریں گے، اور روزہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: مُرُوْہُ فَلْیَتَکَلَّمْ وَلْیَسْتَظِلَّ وَلْیَقْعُدْ، وَلْیُتِمَّ صَوْمَہٗ" ان سے کہو بات کریں، سایے میں آئیں، بیٹھیں، البتہ روزہ پورا کریں۔" (بخاری، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، مُوطّا) حضرت عُقبہؓ بن عامر جُہَنیؓ کہتے ہیں کہ میری بہن نے ننگے پاؤں پیدل حج کرنے کی نذر مانی اور یہ نذر بھی مانی کہ اس سفر میں سر پر کپڑا بھی نہ ڈالیں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس سے کہو کہ سواری پر جائے اور سر ڈھانکے۔ (ابوداؤد۔ مسلم نے اس مضمون کی متعدّد روایات نقل کی ہیں جن میں کچھ لفظی اختلاف ہے)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عُقبہؓ بن عامر کی بہن کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنْ نذرھا، مُرْھا فلترکب۔" اللہ کو اِس کی اِس نذر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ سواری پر جائے۔" (ابوداؤد) ایک اور روایت میں حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: میری بہن نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللّٰہ لا یصنع بشقاء اختك شیئًا فلتحجَّ راکبة" تیری بہن کے مشقّت میں پڑنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اسے سواری پر حج کرنا چاہیے۔" (ابوداؤد) حضرت اَنسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (غالباً سفرِ حج میں) دیکھا کہ ایک بڑے میاں کو ان کے دو بیٹے سنبھالے لیے چل رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: اُنھوں نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عن تعذیب ھٰذا نفسہٗ وامرہٗ ان یرکبَ۔" اللہ تعالیٰ اِس سے بے نیاز ہے کہ یہ شخص اپنے نفس کو

عذاب میں ڈالے۔" پھر آپؐ نے اُسے حکم دیا کہ سوار ہو۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد۔ مسلم میں اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔)

(۵) اگر کسی نذر کو پورا کرنا عملاً ممکن نہ ہو تو اسے کسی دوسری صورت میں پورا کیا جاسکتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے روز ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے مکہ آپؐ کے ہاتھ پر فتح کردیا تو میں بیت المَقدِس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہیں پڑھ لے۔ اس نے پھر پوچھا۔ آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا: آپؐ نے فرمایا: شَأْنَكَ اذًا، "اچھا تو تیری مرضی۔" دوسری ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی بعث محمّدًا بالْحق، لو صلَّیت ھٰھنا لاجزأ عنك صلوٰةً فی بیت المقدس۔ "قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر تو یہیں نماز پڑھ لے تو بیت المَقدِس میں نماز پڑھنے کے بدلے یہ تیرے لیے کافی ہوگی۔" (ابوداؤد)

(۶) اگر کسی نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینے کی نذر مان لی ہو تو اس کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اسے ایک تہائی مال دے دینا چاہیے، اور مالکیہ میں سے سَحْنُون کا قول ہے کہ اسے اتنا مال دے دینا چاہیے جسے دینے کے بعد وہ تکلیف میں نہ پڑ جائے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر یہ نذر تبرُّر کی نوعیت کی ہو تو اسے سارا مال دے دینا چاہیے، اور اگر یہ نذرِ لَجاج ہو تو اُسے اختیار ہے کہ نذر پوری کرے یا قسم کا کفّارہ ادا کردے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اسے اپنا وہ سب مال دے دینا چاہیے جس میں زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، لیکن جس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، مثلاً مکان یا ایسی ہی دوسری اَملاک، اس پر اِس نذر کا اطلاق نہ ہوگا۔ حَنَفِیَہ میں سے امام زُفَر کا قول ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے دو مہینے کا نَفَقَہ رکھ کر باقی سب صدقہ کردے۔ (عُمدۃ القاری، شرح مُوَطّا از شاہ ولی اللہ صاحبؒ) حدیث میں اس مسئلے کے متعلق جو روایات آئی ہیں وہ یہ ہیں: حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جو عتاب مجھ پر ہوا تھا، اس کی جب معافی مل گئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بات بھی شامل تھی کہ میں اپنے سارے مال سے دست بردار ہو کر اسے اللہ اور رسول کی راہ میں صدقہ کردوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، ایسا نہ کرو۔ میں نے عرض کیا: پھر آدھا مال؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر ایک تہائی؟ فرمایا: ہاں۔ (ابوداؤد) دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنا کچھ مال اپنے لیے روک رکھو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ (بخاری) امام زُہری کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابولُبابہؓ نے (جن پر اِسی غزوۂ تبوک کے معاملے میں عتاب ہوا تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں صدقہ کے طور پر اپنے سارے مال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: تمھارے لیے اُس میں سے صرف ایک تہائی دے دینا کافی ہے۔ (مُوَطّا)

(۷) اسلام قبول کرنے سے پہلے اگر کسی شخص نے کسی نیک کام کی نذر مانی ہو تو کیا اسلام قبول کرنے کے بعد

اسے پُورا کیا جائے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔ بخاری، ابوداؤد اور طَحاوِی میں حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے زمانۂ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ ایک رات (اور بروایتِ بعض، ایک دن) مسجدِ حرام میں اعتکاف کریں گے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: اوفِ بنذرك ''اپنی نذر پوری کرو۔'' بعض فقہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ ایسا کرنا واجب ہے، اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مُستحب ہے۔

(۸) میّت کے ذمّہ اگر کوئی نذر رہ گئی ہو تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہَوَیہ، ابوثَور اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ میت کے ذمّہ اگر روزے یا نماز کی نذر رہ گئی ہو تو وارثوں پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ نذر اگر بدنی عبادت (نماز یا روزہ) کی ہو تو وارثوں پر اُس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، اور اگر مالی عبادت کی ہو، اور مرنے والے نے اپنے وارثوں کو اسے پورا کرنے کی وصیّت نہ کی ہو تو اسے بھی پورا کرنا واجب نہیں، البتہ اگر اس نے وصیّت کی ہو تو اس کے ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک نذر پوری کرنی واجب ہو گی۔ مالکیہ کا مذہب بھی اس سے ملتا جُلتا ہے۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر غیر مالی عبادت کی ہو، یا مالی عبادت کی ہو اور میت نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا ہو، تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر میّت نے ترکہ چھوڑا ہو تو وارثوں پر مالی عبادت کی نذر پوری کرنا واجب ہے، خواہ اس نے وصیّت کی ہو یا نہ کی ہو۔ (شرح مسلم لِلنَّوَوِی۔ بَذْلُ الْمَجْهُود شرح ابی داؤد) حدیث میں اس مسئلے کے متعلّق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمّہ ایک نذر تھی جو انھوں نے پوری نہیں کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے پوری کر دو۔ (ابوداؤد، مسلم) دوسری رِوایَت ابنِ عباسؓ سے یہ ہے کہ ایک عورت نے بحری سفر کیا اور نذر مانی کہ اگر میں زندہ سلامت واپس گھر پہنچ گئی تو ایک مہینے کے روزے رکھوں گی۔ واپس آنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور وہ مر گئی۔ اس کی بہن یا بیٹی نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے تُو روزے رکھ لے۔ (ابوداؤد) ایسی ہی ایک روایت ابوداؤد نے حضرت بُریدہؓ سے نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ سے اسی طرح کا مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے اسے وہی جواب دیا جو اُوپر مذکور ہوا ہے۔ ان روایات میں چونکہ یہ بات صاف نہیں ہے کہ حضورؐ کے یہ ارشادات وجوب کے معنیٰ میں تھے یا استحباب کے معنیٰ میں، اور حضرت سعد بن عُبادہؓ کی والدہ کی نذر کے معاملے میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ مالی عبادت کے بارے میں تھی یا بدنی عبادت کے بارے میں، اسی بنا پر فقہا کے درمیان اِس مسئلے میں اختلافات ہوئے ہیں۔

(۹) غلط اور ناجائز نوعیت کی نذر کے معاملے میں یہ بات تو صاف ہے کہ اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اس پر کفّارہ لازم آتا ہے یا نہیں۔ اِس مسئلے میں چونکہ روایات مختلف ہیں، اس لیے فقہا

يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝۷ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ

اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی، اور اللہ کی محبّت[11] میں مسکین اور یتیم اور قیدی[12] کو کھانا کھلاتے ہیں[13] (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے

کے مسالک بھی مختلف ہیں۔ ایک قسم کی روایات میں یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی صورت میں کفّارہ کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا نذر فی معصیۃ وکفارتہٗ کفارۃ یمین**، ''معصیت میں کوئی نذر نہیں ہے اور اس کا کفّارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہے۔'' (ابوداؤد) عُقبہ بن عامر جُہنی کی بہن کے معاملے میں (جس کا ذکر اُوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اپنی نذر توڑ دیں اور تین دن کے روزے رکھیں۔ (مسلم، ابوداؤد) ایک اور عورت کے معاملے میں بھی، جس نے پیدل حج کی نذر مانی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ سواری پر حج کے لیے جائے اور قسم کا کفّارہ ادا کردے۔ (ابوداؤد) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من نذر نذرًا لم یسمہ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا فی معصیۃ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا لایطیقہ فکفارتہ کفّارۃ یمین، ومن نذر نذرًا اطاقہ فلیفِ بہٖ**۔ ''جس نے ایک نذر مان لی اور اس بات کا تعیُّن نہ کیا کہ کس بات کی نذر مانی ہے وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے معصیت کی نذر مانی وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ قدرت نہ رکھتا ہو وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے وہ پورا کرسکتا ہو وہ اسے پورا کرے۔'' (ابوداؤد) دوسری طرف وہ احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کفّارہ نہیں ہے۔ اُوپر نمبر ۴ میں جن صاحب کا ذکر آیا ہے کہ انھوں نے دھوپ میں کھڑے رہنے اور کسی سے بات نہ کرنے کی نذر مانی تھی، اُن کا قصّہ نقل کرکے امام مالکؒ نے مُوَطّا میں لکھا ہے کہ مجھے کسی ذریعے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نذر توڑنے کا حکم دینے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہو کہ وہ کفارہ ادا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرًا منھا فلیدعھا ولیاتِ الذی ھو خیرٌ فان ترکھا کفارتھا**، ''جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں وہ دیکھے کہ اس سے بہتر بات دوسری ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہو اور اسے چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے۔'' (ابوداؤد۔ بَیْہَقِی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اور حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت کہ ''جو کام بہتر ہے وہ کرے، اور یہی اس کا کفارہ ہے'' ثابت نہیں ہے۔) امام نَوَوی اِن احادیث پر بحث کرتے ہوئے شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، شافعیؒ، ابوحنیفہؒ، داؤد ظاہری اور جُمہور علما کہتے ہیں کہ مَعصِیَت کی نذر باطل ہے اور اسے پورا نہ کرنے پر کفارہ لازم نہیں آتا۔

جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹ إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰
فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝۱۱

نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ[۱۴]، ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انھیں اُس دن کے شر سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور سُرور بخشے گا[۱۵]،

اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ کفارہ لازم آتا ہے۔

۱۱- اصل الفاظ ہیں: عَلٰی حُبِّہٖ۔ اکثر مفسّرین نے حُبِّہٖ کی ضمیر کا مَرجَع "کھانے" کو قرار دیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کھانے کے محبوب اور دل پسند ہونے اور خود اس کے حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے: عَلٰی حُبِّ الْاِطْعَامِ، یعنی غریبوں کو کھانا کھلانے کے شوق میں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور حضرت فُضَیل بن عیاضؒ اور ابوسلیمان الدّارانیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد کا یہ فقرہ کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (ہم تو اللہ کی خوشنودی کی خاطر تمھیں کھلا رہے ہیں) اِسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

۱۲- قدیم زمانے میں دستور یہ تھا کہ قیدیوں کو ہتھکڑی اور بیڑیاں لگا کر روزانہ باہر نکالا جاتا تھا اور وہ سڑکوں پر یا محلّوں میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے تھے۔ بعد میں اسلامی حکومت نے یہ طریقہ بند کیا۔ (کتاب الخَراج، امام ابو یُوسف، صفحہ ۱۵۰، طبع ۱۳۸۲ھ) اِس آیت میں قیدی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قید میں ہو، خواہ کافر ہو یا مسلمان، خواہ جنگی قیدی ہو، یا کسی جرم میں قید کیا گیا ہو، خواہ اسے قید کی حالت میں کھانا دیا جاتا ہو یا بھیک منگوائی جاتی ہو، ہر حالت میں ایک بے بس آدمی کو جو اپنی روزی کے لیے خود کوئی کوشش نہ کرسکتا ہو، کھانا کھلانا ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔

۱۳- اگرچہ بجائے خود کسی غریب کو کھانا کھلانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے، لیکن کسی حاجت مند کی دوسری حاجتیں پوری کرنا بھی ویسا ہی نیک کام ہے جیسا بھوکے کو کھانا کھلانا۔ مثلاً کوئی کپڑے کا محتاج ہے، یا کوئی بیمار ہے اور علاج کا محتاج ہے، یا کوئی قرض دار ہے اور قرض خواہ اسے پریشان کر رہا ہے، تو اس کی مدد کرنا کھانا کھلانے سے کم درجے کی نیکی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں نیکی کی ایک خاص صورت کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے، ورنہ اصل مقصود حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

۱۴- ضروری نہیں ہے کہ غریب کو کھانا کھلاتے ہوئے زبان ہی سے یہ بات کہی جائے۔ دل میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے، اور اللہ کے ہاں اِس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زبان سے کہنے کی ہے۔ لیکن زبان سے یہ بات کہنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جس کی مدد کی جائے، اُس کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ ہم اس سے کسی قسم کا شکریہ یا بدلہ

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ
لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا

اور ان کے صبر کے بدلے میں[۱۶] انھیں جنّت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اُونچی مَسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انھیں دُھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی،

نہیں چاہتے، تاکہ وہ بے فکر ہو کر کھائے۔

۱۵ – یعنی چہروں کی تازگی اور دل کا سرور۔ دوسرے الفاظ میں روزِ قیامت کی ساری سختیاں اور ہولناکیاں صرف کفار و مجرمین کے لیے ہوں گی، نیک لوگ اُس دن ہر تکلیف سے محفوظ اور نہایت خوش وخرم ہوں گے۔ یہی بات سُورۂ انبیاء میں بیان کی گئی ہے کہ "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" (آیت ۱۰۳) اور اسی کی صراحت سورۂ نمل میں کی گئی ہے کہ "جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اُسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا، اور ایسے لوگ اُس دن کے ہَول سے محفوظ ہوں گے۔" (آیت ۸۹)

۱۶ – یہاں صبر بڑے وسیع معنٰی میں استعمال ہوا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہلِ ایمان کی پوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دَم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجا لانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتّٰی کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہِ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اُس فائدے اور لذّت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج اور اذیّت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اِس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اِس نیک رَوِیّے کے ثمرات اِس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۶۰۔ آلِ عمران، حواشی ۱۳، ۱۰۷، ۱۳۱۔ الانعام، حاشیہ ۲۳۔ جلد دوم، الانفال، حواشی ۳۷، ۴۷۔ یونس، حاشیہ ۹۔ ہود، حاشیہ ۱۱۔ الرعد، حاشیہ ۳۹۔ النحل، حاشیہ ۹۸۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۴۰۔ الفرقان، حاشیہ ۹۴۔ القصص، حواشی ۷۵، ۱۰۰۔ العنکبوت، حاشیہ ۹۷۔ جلد چہارم، لقمان، حواشی ۲۹، ۵۶۔ السجدہ، حاشیہ ۳۷۔ الاحزاب، حاشیہ ۵۸۔ الزُّمَر، حاشیہ ۳۲۔ حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۳۸۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۵۳)

وَ ذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا تَذۡلِيۡلًا ﴿۱۴﴾ وَ يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ اَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا۠ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيۡرَا۠ مِنۡ فِضَّةٍ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا ﴿۱۶﴾ وَ يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ﴿۱۷﴾ عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ﴿۱۸﴾

قرأ حفص بغیر الالف فی الاول فیہما ووقف علی الاول بالالف وعلی الثانی بغیر الالف ۱۲

اور اُس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انھیں توڑ لیں)۔ اُن کے آگے چاندی کے برتن[17] اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے، شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے،[18] اور ان کو (منتظمینِ جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہو گا۔[19] ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سُونٹھ کی آمیزش ہو گی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔[20]

۱۷- سورۂ زُخرُف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے آگے سونے کے برتن گردش کرائے جا رہے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی وہاں سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندی کے۔

۱۸- یعنی وہ ہو گی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہو گی۔ چاندی کی یہ قسم اِس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف جنّت کی خصوصیت ہو گی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہلِ جنّت کے دسترخوان پر پیش کیے جائیں گے۔

۱۹- یعنی ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیے جائیں گے۔ نہ وہ اُس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ بالفاظِ دیگر، اہلِ جنت کے خُدّام اس قدر ہوشیار اور تمیزدار ہوں گے کہ وہ جس کی خدمت میں جامِ شراب پیش کریں گے، اس کے متعلّق ان کو پورا اندازہ ہو گا کہ وہ کتنی شراب پینا چاہتا ہے۔ (جنت کی شراب کی خُصوصیات کے متعلق مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصافّات، آیات ۴۵ تا ۴۷، حواشی ۲۴ تا ۲۷۔ جلد پنجم، سورۂ محمد، آیت ۱۵، حاشیہ ۲۲۔ الطُّور، آیت ۲۳، حاشیہ ۱۸۔ الواقعہ، آیت ۱۹، حاشیہ ۱۰)

۲۰- اہلِ عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں اُن کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی۔ لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ ہو گی کہ اس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا، بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہو گا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہو گی مگر اس کی تلخی نہ ہو گی، اس لیے اُس کا نام سلسبیل ہو گا۔ سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔ مفسرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اُس چشمے کے لیے بطورِ صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطورِ اسم۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾

ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دَوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔[۲۱] وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمھیں نظر آئے گا۔[۲۲] اُن کے اُوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے،[۲۳] ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے،[۲۴] اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔[۲۵] یہ ہے تمھاری جزا، اور تمھاری کارگزاری قابلِ قدر ٹھیری ہے۔[۲۶] ع

۲۱- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصافات، حاشیہ ۲۶۔ جلد پنجم، الطُّور، حاشیہ ۱۹، الواقعہ، حاشیہ ۹۔

۲۲- یعنی دنیا میں خواہ کوئی شخص فقیر بے نوا ہی کیوں نہ رہا ہو، جب وہ اپنے اعمالِ خیر کی بنا پر جنت میں جائے گا تو وہاں اِس شان سے رہے گا کہ گویا وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے۔

۲۳- یہی مضمون سورۂ کہف، آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے کہ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ "وہ (یعنی اہلِ جنت) باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اُونچی مَسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔" اس بنا پر اُن مفسرین کی رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی جنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جو اُن کی مسندوں یا مسہریوں کے اُوپر لٹکے ہوئے ہوں گے، یا یہ اُن لڑکوں کا لباس ہوگا جو اُن کی خدمت میں دوڑے پھر رہے ہوں گے۔

۲۴- سورۂ کہف، آیت ۳۱ میں فرمایا گیا ہے: يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ "وہ وہاں سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے۔" یہی مضمون سورۂ حج، آیت ۲۳، اور سورۂ فاطر، آیت ۳۳ میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تین صورتیں ممکن محسوس ہوتی ہیں: ایک، یہ کہ کبھی وہ چاہیں گے تو سونے کے کنگن پہنیں گے اور کبھی چاہیں گے تو چاندی کے کنگن پہن لیں گے۔ دونوں چیزیں ان کے حسبِ خواہش موجود ہوں گی۔ دوسرے، یہ کہ سونے اور چاندی کے کنگن وہ بیک وقت پہنیں گے، کیونکہ دونوں کو ملا دینے سے

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِيۡلًا ﴿۲۳﴾ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ

اے نبیؐ! ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے[۲۷]، لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو،[۲۸]

حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ تیسرے، یہ کہ جس کا جی چاہے گا سونے کے کنگن پہنے گا اور جو چاہے گا چاندی کے کنگن استعمال کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ زیور تو عورتیں پہنتی ہیں، مَردوں کو زیور پہنانے کا کیا موقع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں بادشاہوں اور رئیسوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہاتھوں اور گلے اور سر کے تاجوں میں طرح طرح کے زیورات استعمال کرتے تھے، بلکہ ہمارے زمانے میں برطانوی ہند کے راجاؤں اور نوابوں تک میں یہ دستور رائج رہا ہے۔ سورۂ زُخرُف میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب اپنے سادہ لباس میں بس ایک لاٹھی لیے ہوئے فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے کہا کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تو اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ اچھا سفیر ہے جو اس حالت میں میرے سامنے آیا ہے، فَلَوۡلَاۤ اُلۡقِيَ عَلَيۡهِ اَسۡوِرَةٌ مِّنۡ ذَهَبٍ اَوۡ جَآءَ مَعَهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ مُقۡتَرِنِيۡنَ (آیت ۵۳) یعنی اگر یہ زمین و آسمان کے بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا ملائکہ کا کوئی لشکر ہی اس کی اَردَلی میں آتا۔

۲۵ – پہلے دو شرابوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ ایک وہ جس میں آبِ چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری وہ جس میں آبِ چشمۂ زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ ان دونوں شرابوں کے بعد اب پھر ایک شراب کا ذکر کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کا رب انھیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ کوئی اور بہترین نوعیت کی شراب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضلِ خاص کے طور پر انھیں پلائی جائے گی۔

۲٦ – اصل الفاظ ہیں: كَانَ سَعۡيُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا، یعنی تمھاری سعی مشکور ہوئی۔ سَعی سے مراد وہ پورا کارنامۂ حیات ہے جو بندے نے دنیا میں انجام دیا۔ جن کاموں میں اس نے اپنی محنتیں اور جن مقاصد کے لیے اس نے اپنی کوششیں صَرف کیں، اُن سب کا مجموعہ اُس کی سعی ہے، اور اس کے مشکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قابلِ قدر قرار پائی۔ شکر یہ جب بندے کی طرف سے خدا کے لیے ہو تو اس سے مراد اس کی نعمتوں پر احسان مندی ہوتی ہے، اور جب خدا کی طرف سے بندے کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمات کی قدر فرمائی۔ آقا کی یہ بہت بڑی عنایت ہے کہ بندہ جب اس کی مرضی کے مطابق اپنا فرض انجام دے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔

۲۷ – یہاں مُخاطَب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن دراصل رُوئے سُخَن کفار کی طرف ہے۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآنِ مجید میں بعض مقامات پر اُن کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے،

وَ لَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ﴿۲۴﴾ وَ اذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّ اَصِيۡلًا ﴿۲۵﴾ وَ مِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَ سَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيۡلًا ﴿۲۶﴾

اور اِن میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو۔[۲۹] اپنے رب کا نام صبح وشام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔[۳۰]

(مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۰۲-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶۔ بنی اسرائیل، ۱۱۹)، اور یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مصنف نہیں ہیں، اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں، یعنی یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کر دیں، بلکہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیجیں۔

۲۸- یعنی تمھارے رب نے جس کارِ عظیم پر تمھیں مامور کیا ہے، اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔

۲۹- یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دینِ حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور کسی بدعمل کی خاطر دین کی اَخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکرِ حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم وتغیّر کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ جو کچھ حرام وناجائز ہے، اسے برملا حرام وناجائز کہو، خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمّت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو۔ اور جو عقائد باطل ہیں انھیں کُھلّم کُھلّا باطل، اور جو حق ہیں انھیں عَلانِیَہ حق کہو، چاہے کفار تمھارا منہ بند کرنے، یا اِس معاملے میں کچھ نرمی اختیار کر لینے لیے بعدتم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

۳۰- قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلے میں صبر وثبات کی تلقین کی گئی ہے، وہاں اُس کے معاً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دینِ حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اِسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح وشام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہوسکتا ہے، مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعیُّن کے ساتھ دیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اِس آیت میں سب سے پہلے فرمایا: وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا۔ بکرہ عربی زبان میں صبح کو کہتے ہیں۔ اور اَصیل کا لفظ زوال کے وقت سے غروب تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ظہر اور عصر کے اوقات آجاتے ہیں۔ پھر فرمایا: وَ مِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ ۔ رات کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لیے رات کو سجدہ کرنے کے حکم میں مغرب اور عشاء، دونوں وقتوں کی نمازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو،

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ يَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ ۚ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبّت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں[۳۱]۔ ہم نے ہی اِن کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں، اور ہم جب چاہیں اِن کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں[۳۲]۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے[۳۳]۔ یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۳۴]۔ ع

نمازِ تہجّد کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۹۲ تا ۹۷۔ جلد ششم، اَلمزّمّل، حاشیہ ۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے یہی اوقات ابتدا سے اسلام میں تھے، البتہ اوقات اور رکعتوں کے تعیُّن کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے موقع پر دیا گیا۔

۳۱- یعنی یہ کفارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مُصِر ہیں، اور جس بنا پر آپؐ کی دعوتِ حق کے لیے اِن کے کان بہرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل اِن کی دنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اس لیے ایک سچے خدا پرست انسان کا راستہ اِن کے راستے سے اِتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مُصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۲- اصل الفاظ ہیں: اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا۔ اِس فقرے کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر کے اِنھی کی جنس کے دوسرے لوگ اِن کی جگہ لا سکتے ہیں، جو اپنے کردار میں اِن سے مختلف ہوں۔ دوسرے، یہ کہ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست

اور سلیم الاعضاء بنا سکتے ہیں، اُسی طرح ہم اِس پر بھی قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں، کسی کو لقوہ مار جائے، اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر اپاہج ہو جائے۔ تیسرے، یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد اِن کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۳- تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المُدّثِّر، حاشیہ ۴۱۔ (نیز مُلاحَظہ ہو: ضمیمہ ۱، صفحہ ۵۷۶)

۳۴- اس کی تشریح ہم اِسی سورت کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ (نیز مُلاحَظہ ہو: ضمیمہ ۲، صفحہ ۵۷۷)

تفہیم القرآن

المرسلات

(۷۷)

المرسلات

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ وَالْمُرْسَلٰتِ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اس کا پورا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی دو سُورتیں سورۂ قیامہ، اور سورۂ دہر، اور اس کے بعد کی دو سُورتیں، سورۂ نبا اور سورۂ نازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جس کو ان میں مختلف پیرایوں سے اہلِ مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع قیامت اور آخرت کا اِثبات، اور اُن نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو اِن حقائق کے انکار اور اقرار سے آخرِ کار برآمد ہوں گے۔

پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اِس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں، وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ اِن میں اِستدلال یہ ہے کہ جس قادرِ مُطلَق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے، اُس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہوسکتی، اور جو صریح حکمت اِس انتظام میں کارفرما نظر آ رہی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عَبَث اور بے مقصد نہیں ہوسکتا، اور آخرت نہ ہو تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سارا کارخانۂ ہستی سراسر فضول ہے۔

اہلِ مکّہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو، اسے لا کر دکھاؤ، تب ہم اسے مانیں گے۔ آیت ۸ سے ۱۵ تک اُن کے اِس مطالبے کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں ہے کہ جب کوئی مسخرا اُسے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے۔ وہ تو تمام نوعِ انسانی، اور اس کے تمام افراد کے مقدّمے کے فیصلے کا دن ہے۔ اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اُسی وقت پر وہ آئے گا۔ اور جب آئے گا تو ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُس وقت ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت انھی رسولوں کی شہادت پر

اِن کے مقدمے کا فیصلہ ہوگا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں، پھر اِنھیں خود پتا چل جائے گا کہ اِنھوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کیا ہے۔

آیت ۱۶ سے ۲۸ تک مسلسل قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجوب کے دلائل دیے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدایش، اور جس زمین پر وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالمِ آخرت کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔ انسانی تاریخ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ آخرکار بگڑیں اور تباہی سے دوچار ہوئیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آخرت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کا رویہ اگر متصادم ہو تو اُس کا انجام وہی ہوتا ہے جو اُس اندھے کا انجام ہوتا ہے، جو سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے مقابلے میں بگ ٹُٹ چلا جا رہا ہو۔ اور اس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانینِ طبیعی (physical laws) ہی کارفرما نہیں ہیں بلکہ ایک قانونِ اخلاقی (moral law) بھی کام کر رہا ہے، جس کے تحت خود اِس دنیا میں بھی مُکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مُکافات چونکہ اپنی کامل و مکمل صورت میں واقع نہیں ہو رہی ہے اس لیے کائنات کا اخلاقی قانون لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب یہ بھرپور طریقے سے واقع ہو اور اُن تمام بھلائیوں اور برائیوں کی پوری جزا و سزا دی جائے جو یہاں جزا سے محروم رہ گئی ہیں یا سزا سے بچ نکلی ہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو، اور انسان کی پیدایش دنیا میں جس طرح ہوتی ہے اس پر اگر انسان غور کرے تو اس کی عقل —— بشرطیکہ وہ سلیم ہو —— اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفے سے ابتدا کر کے اُسے پورا آدمی بنایا ہے، اُس کے لیے اسی آدمی کو پھر پیدا کر دینا یقیناً ممکن ہے۔ زندگی بھر انسان جس زمین پر رہتا ہے، مرنے کے بعد اس کے اجزائے جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے، اِسی زمین پر اُن کا ایک ایک ذرّہ موجود رہتا ہے۔ اِسی زمین کے خزانوں سے وہ بنتا اور پھلتا پھولتا اور پرورش پاتا ہے، اور پھر اِسی زمین کے خزانوں میں واپس جمع ہو جاتا ہے۔ جس خدا نے اُسے پہلے زمین کے اِن خزانوں سے نکالا تھا، وہی اُن میں جمع ہو جانے کے بعد اُسے پھر اُن سے نکال لا سکتا ہے۔ اُس کی قدرت پر غور کرو تو تم اِس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور اس کی حکمت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ زمین پر جو اختیارات اُس نے تمھیں دیے ہیں اُن کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً

اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ سے ۴۰ تک آخرت کے منکرین کا، اور ۴۱ سے ۴۵ تک اُن لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنھوں نے اُس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے، اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال، اور سیرت و کردار کی اُن برائیوں سے اجتناب کیا ہے جو چاہے آدمی کی دنیا بناتی ہوں، مگر اس کی عاقبت خراب کر دینے والی ہوں۔

آخر میں منکرینِ آخرت اور خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کو مُتنبِّہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اڑا لو، آخرِ کار تمھارا انجام سخت تباہ کُن ہو گا۔ اور بات اِس پر ختم کی گئی ہے کہ اِس قرآن سے بھی جو شخص ہدایت نہ پائے، اسے پھر دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔

---

۵۰ آیاتها

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ

۲ رکوعاتها

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷

قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو پے درپے بھیجی جاتی ہیں، پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور (بادلوں کو) اُٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر (اُن کو) پھاڑ کر جُدا کرتی ہیں، پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں، عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور[1] پر، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے[2] وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔[3]

۱- یعنی کبھی تو ان کی آمد کے رُکنے اور قحط کا خطرہ پیدا ہونے سے دل گداز ہوتے ہیں اور لوگ اللہ سے توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔ کبھی اُن کے بارانِ رحمت لانے پر لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور کبھی ان کی طوفانی سختی دلوں میں خوف پیدا کرتی ہے اور تباہی کے ڈر سے لوگ خدا کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۳، صفحہ ۵۷۹)

۲- دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "جس چیز کا تمھیں خوف دلایا جارہا ہے۔" مراد ہے قیامت اور آخرت۔

۳- یہاں قیامت کے ضرور واقع ہونے پر پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک، الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا "پے درپے، یا بھلائی کے طور پر بھیجی جانے والیاں۔" دوسرے، الْعٰصِفٰتِ عَصْفًا۔ "بہت تیزی اور شدّت کے ساتھ چلنے والیاں"۔ تیسرے، النّٰشِرٰتِ نَشْرًا "خوب پھیلانے والیاں"۔ چوتھے، الْفٰرِقٰتِ فَرْقًا "الگ الگ کرنے والیاں۔" پانچویں، الْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا۔ "یاد کا اِلقا کرنے والیاں۔" چونکہ اِن الفاظ میں صرف صفات بیان کی گئی ہیں، اور یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کس چیز یا کن چیزوں کی صفات ہیں، اس لیے مفسّرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ پانچوں صفات ایک ہی چیز کی ہیں، یا الگ الگ چیزوں کی، اور وہ چیز یا چیزیں کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچوں سے مراد ہوائیں ہیں۔ دوسرا کہتا ہے: پانچوں سے مراد فرشتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے: پہلے تین سے مراد ہوائیں ہیں اور باقی دو سے مراد فرشتے۔ چوتھا کہتا ہے: پہلے دو سے مراد ہوائیں اور باقی تین سے مراد فرشتے ہیں۔ اور ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ پہلے سے مراد ملائکۂ رحمت، دوسرے سے مراد ملائکۂ عذاب اور باقی تین سے مراد قرآنِ مجید کی آیات ہیں۔

ہمارے نزدیک پہلی بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ جب ایک ہی سلسلۂ کلام میں پانچ صفات کا مسلسل ذکر کیا گیا ہے اور کوئی علامت بیچ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ کہاں تک ایک چیز کی صفات کا ذکر ہے اور کہاں سے دوسری چیز کی صفات کا ذکر شروع ہوا ہے، تو یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ محض کسی بے بنیاد قیاس کی بنا پر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں دو یا تین مختلف چیزوں کی قَسمیں کھائی گئی ہیں، بلکہ اس صورت میں نظمِ کلام خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پُوری عبارت کو کسی ایک ہی چیز کی صفات سے متعلق مانا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقتِ غیر محسوس کا یقین دلانے کے لیے کسی چیز، یا بعض چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، وہاں قسم دراصل اِستدلال کی ہم معنیٰ ہوتی ہے، یعنی اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ چیز یا چیزیں اُس حقیقت کے صحیح و برحق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ اِس غرض کے لیے ظاہر ہے کہ ایک غیر محسوس شے کے حق میں کسی دوسری غیر محسوس شے کو بطورِ استدلال پیش کرنا دُرست نہیں ہوسکتا، بلکہ غیر محسوس پر محسوس سے دلیل لانا ہی موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں صحیح تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد ہوائیں ہیں، اور اُن لوگوں کی تفسیر قابلِ قبول نہیں ہے جنھوں نے ان پانچوں چیزوں سے مراد فرشتے لیے ہیں، کیونکہ وہ بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح قیامت کا وقوع غیر محسوس ہے۔

اب غور کیجیے کہ قیامت کے وقوع پر ہواؤں کی یہ کیفیات کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ زمین پر جن اسباب سے حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوئی ہے ان میں سے ایک نہایت اہم سبب ہَوا ہے۔ ہر نوع کی زندگی سے اُس کی صفات کا جو تعلق ہے، وہ بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی قادرِ مُطلَق اور صانعِ حکیم ہے جس نے اِس کُرۂ خاکی پر زندگی کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور اِس غرض کے لیے یہاں ایک ایسی چیز پیدا کی جس کی صفات زندہ مخلوقات کے وجود کی ضروریات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتی ہیں۔ پھر اُس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ زمین کو ہَوا کا ایک لَبادَہ اُڑھا کر چھوڑ دیا ہو، بلکہ اپنی قدرت اور حکمت سے اِس ہَوا میں اس نے بے شمار مختلف کیفیات پیدا کی ہیں، جن کا انتظام لاکھوں کروڑوں برس سے اس طرح ہو رہا ہے کہ انھی کی بدولت موسم پیدا ہوتے ہیں، کبھی حَبس ہوتا ہے اور کبھی بادِ نسیم چلتی ہے، کبھی گرمی آتی ہے اور کبھی سردی، کبھی بادل آتے ہیں اور کبھی آتے ہوئے اُڑ جاتے ہیں، کبھی نہایت خوش گوار جھونکے چلتے ہیں اور کبھی انتہائی تباہ کُن طوفان آجاتے ہیں، کبھی نہایت نفع بخش بارش ہوتی ہے اور کبھی کال پڑ جاتا ہے۔ غرض ایک ہوا نہیں بلکہ طرح طرح کی ہوائیں ہیں جو اپنے اپنے وقت پر چلتی ہیں اور ہر ہَوا کسی نہ کسی مقصد کو پُورا کرتی ہے۔ یہ انتظام ایک غالب قدرت کا ثبوت ہے، جس کے لیے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از امکان ہوسکتا ہے، نہ اسے مٹا دینا، اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔ اِسی طرح یہ انتظام کمال درجہ حکمت و دانائی کا ثبوت بھی ہے، جس سے صرف ایک نادان آدمی ہی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ یہ سارا کاروبار محض کھیل کے طور پر کیا جارہا ہو اور اس کا کوئی عظیم تر مقصد نہ ہو۔ اس حیرت انگیز انتظام کے مقابلے میں انسان اتنا بے بس ہے کہ کبھی وہ نہ اپنے لیے مفیدِ طلب ہَوا چلا سکتا ہے، نہ اپنے اُوپر ہلاکت

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ﴿۱۱﴾ لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ﴿۱۲﴾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ؕ﴿۱۴﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۵﴾

پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے[۴]، اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا[۵]، اور پہاڑ دُھنک ڈالے جائیں گے، اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا[۶] (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی)۔ کس روز کے لیے یہ کام اُٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمھیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے[۷]۔

خیز ہَوا کا طوفان آنے کو روک سکتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی ڈِھٹائی اور بے شُعوری اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے، کبھی نہ کبھی یہی ہَوا اُس کو یاد دلا دیتی ہے کہ اُوپر کوئی زبردست اقتدار کارفرما ہے جو زندگی کے اِس سب سے بڑے ذریعے کو جب چاہے اُس کے لیے رحمت اور جب چاہے ہلاکت کا سبب بنا سکتا ہے، اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، الذّاریات، حواشی ۱ تا ۴)

۴- یعنی بے نور ہو جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

۵- یعنی عالَمِ بالا کا وہ بندھا ہوا نظام، جس کی بدولت ہر ستارہ اور سیّارہ اپنے مدار پر قائم ہے، اور جس کی بدولت کائنات کی ہر چیز اپنی اپنی حد میں رُکی ہوئی ہے، توڑ ڈالا جائے گا اور اس کی ساری بندشیں کھول دی جائیں گی۔

۶- قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدّمہ پیش ہوگا تو ہر قوم کے رسول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا، تاکہ وہ اِس اَمر کی گواہی دے کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجّت ہوگی، جس سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط رَوِش کے خود ذمّہ دار ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاَعراف، آیات ۶، ۷، ۱۷۲، ۱۷۳، حواشی ۱۳۴، ۱۳۵۔ جلد چہارُم، الزُّمَر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰۔ جلد ششم، الملک، آیت ۸، حاشیہ ۱۴۔

۷- یعنی اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اُس دن کے آنے کی خبر کو جھوٹ سمجھا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب اُنھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی

اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَؕ ۝۱۶ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ۝۱۷ كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝۱۸ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۹ اَلَمۡ نَخۡلُقكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍۙ ۝۲۰ فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍۙ ۝۲۱ اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍۙ ۝۲۲ فَقَدَرۡنَا ۖ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ۝۲۳ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۲۴

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟[8] پھر اُنھی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں[9] گے۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اُس دن جھُٹلانے والوں کے لیے۔[10]

کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا اور ایک مُقرّرہ مدت تک[11] اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟[12] تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔[13] تباہی ہے اُس روز جھُٹلانے والوں کے لیے۔[14]

جواب دہی کرنی ہوگی۔

۸ - یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود اِسی دنیا میں اپنی تاریخ کو دیکھ لو۔ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کر کے اِسی دنیا کو اصل زندگی سمجھا اور اِسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو خیر و شر کا معیار سمجھ کر اپنا اَخلاقی رَوِیّہ مُتعیّن کیا، بلا اِستِثنا وہ سب آخرِ کار تباہ ہو کر رہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے، جسے نظر انداز کر کے کام کرنے والا اُسی طرح نقصان اٹھاتا ہے جس طرح ہر اُس شخص کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کر کے چلے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۸۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۲۵)

۹ - یعنی یہ ہمارا مستقل قانون ہے۔ آخرت کا انکار جس طرح پہلے گزری ہوئی قوموں کے لیے تباہ کُن ثابت ہوا ہے، اسی طرح آگے آنے والی قوموں کے لیے بھی یہ ہمیشہ تباہ کُن ہی ثابت ہوگا۔ اِس سے نہ کوئی قوم پہلے مستثنیٰ تھی نہ آیندہ کبھی ہوگی۔

۱۰ - یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ دنیا میں اُن کا جو انجام ہوا ہے یا آیندہ ہوگا، وہ اُن کی اصل سزا نہیں ہے، بلکہ اصلی تباہی تو اُن پر فیصلے کے دن نازل ہوگی۔ یہاں کی پکڑ تو صرف یہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب کوئی شخص مسلسل جرائم کرتا چلا جائے اور کسی طرح اپنی بگڑی ہوئی رَوِش سے باز نہ آئے تو آخرِ کار اسے گرفتار کر لیا جائے۔ عدالت، جہاں اس کے مقدمے کا فیصلہ ہونا ہے اور اسے اس کے تمام کرتوتوں کی سزا دی جانی ہے،

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۸﴾

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مُردوں کے لیے بھی، اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے، اور تمھیں میٹھا پانی پلایا؟[15] تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔[16]

اِس دنیا میں قائم نہیں ہوگی بلکہ آخرت میں ہوگی، اور وہی اُس کی تباہی کا اصل دن ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵)

۱۱- اصل الفاظ ہیں: قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ وہ مدت مُقرّر ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس کی مدت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ کسی بچّے کے متعلق کسی ذریعے سے بھی انسان کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ کتنے مہینے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور سیکنڈ ماں کے پیٹ میں رہے گا، اور اس کا ٹھیک وقتِ ولادت کیا ہوگا۔ اللہ ہی نے ہر بچے کے لیے ایک خاص مدت مقرر کی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔

۱۲- یعنی رحِم مادر، جس میں استقرارِ حمل ہوتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جمایا جاتا ہے اور اتنے انتظامات اس کی حفاظت اور پرورش کے کیے جاتے ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اس کا اِسقاط نہیں ہوسکتا، اور مصنوعی اِسقاط کے لیے بھی غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں، جو فنِّ طِبّ کی جدید ترقیات کے باوجود خطرے اور نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

۱۳- یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی صریح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک حقیر نُطفے سے تمھاری ابتدا کر کے تمھیں پورا انسان بنانے پر قادر تھے، تو آخر دوبارہ تمھیں کسی اور طرح پیدا کر دینے پر کیوں قادر نہ ہوں گے؟ ہماری یہ تخلیق، جس کے نتیجے میں تم آج زندہ موجود ہو، خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں، ایسے عاجز نہیں ہیں کہ ایک دفعہ پیدا کر کے پھر تمھیں پیدا نہ کرسکیں۔

۱۴- یہاں یہ فقرہ اس معنٰی میں ارشاد ہوا ہے کہ حیات بعدِ موت کے امکان کی یہ صریح دلیل سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی جو لوگ اُس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ آج اُس کا جتنا چاہیں مذاق اُڑا لیں، اور جس قدر چاہیں اس کے ماننے والوں کو دقیانوسی، تاریک خیال اور اَوہام پرست قرار دیتے رہیں، مگر جب وہ دن آجائے گا جسے یہ جھٹلا رہے ہیں تو انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ ان کے لیے تباہی کا دن ہے۔

۱۵- یہ آخرت کے ممکن اور معقول ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔ یہی ایک کُرۂ زمین ہے جو کروڑوں اور اربوں

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝٢٩ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝٣٠

چلو[17] اب اُسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اُس سایے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے،[18]

سال سے بے حد وحساب مخلوقات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، ہر قسم کی نباتات، ہر قسم کے حیوانات اور انسان اِس پر جی رہے ہیں، اور سب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اِس کے پیٹ میں سے طرح طرح کے اتھاہ خزانے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر یہی زمین ہے جس پر اِن تمام اقسام کی مخلوقات کے بے شمار افراد روز مرتے ہیں، مگر ایسا بے نظیر انتظام کر دیا گیا ہے کہ سب کے لاشے اِسی زمین میں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور یہ پھر ہر مخلوق کے نئے افراد کے جینے اور بسنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اِس زمین کو سپاٹ گیند کی طرح بھی بنا کر نہیں رکھ دیا گیا ہے، بلکہ اس میں جگہ جگہ پہاڑی سلسلے اور فلک بوس پہاڑ قائم کیے گئے ہیں جن کا موسموں کے تغیُّرات میں، بارشوں کے برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، زرخیز وادیوں کے وجود میں، بڑے بڑے شہتیر فراہم کرنے والے درختوں کے اُگنے میں، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں بہت بڑا دخل ہے۔ پھر اس زمین کے پیٹ میں بھی میٹھا پانی پیدا کیا گیا ہے، اِس کی پیٹھ پر بھی میٹھے پانی کی نہریں بہا دی گئی ہیں، اور سمندر کے کھاری پانی سے صاف ستھرے بخارات اُٹھا کر بھی نتھرا ہوا پانی آسمان سے برسانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک قادرِ مُطلَق نے یہ سب کچھ بنایا ہے، اور وہ محض قادر ہی نہیں ہے بلکہ علیم و حکیم بھی ہے؟ اب اگر اس کی قدرت اور حکمت ہی سے یہ زمین اِس سر و سامان کے ساتھ اور اِن حکمتوں کے ساتھ بنی ہے تو ایک صاحبِ عقل آدمی کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ اُسی کی قدرت اِس دنیا کی بِساط لپیٹ کر پھر ایک دوسری دنیا نئے طرز پر بنا سکتی ہے، اور اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اِس کے بعد ایک دوسری دنیا بنائے، تاکہ انسان سے اُن اعمال کا حساب لے جو اُس نے اِس دنیا میں کیے ہیں؟

۱۶ – یہاں یہ فقرہ اس معنٰی میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ خدا کی قدرت اور حکمت کے یہ کرشمے دیکھ کر بھی آخرت کے ممکن اور معقول ہونے کا انکار کر رہے ہیں اور اِس بات کو جھُٹلا رہے ہیں کہ خدا اِس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا پیدا کرے گا اور اُس میں انسان سے اُس کے اعمال کا حساب لے گا، وہ اپنی اِس خام خیالی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو رہیں۔ جس روز یہ سب کچھ اُن کی توقُّعات کے خلاف پیش آ جائے گا، اس روز انھیں پتا چل جائے گا کہ انھوں نے یہ حماقت کر کے خود اپنے لیے تباہی مول لی ہے۔

۱۷ – اب آخرت کے دلائل دینے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ واقع ہو جائے گی تو وہاں اِن منکرین کا حشر کیا ہوگا۔

۱۸ – سایے سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ اور تین شاخوں کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بہت بڑا دھواں اٹھتا ہے تو اُوپر جا کر وہ کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ

نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لَپَٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی (جو اُچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اُونٹ ہیں[19]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انھیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں[20]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمھیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر

---

۱۹ – یعنی ہر چنگاری ایک قصر جیسی بڑی ہوگی، اور جب یہ بڑی بڑی چنگاریاں اُٹھ کر پھٹیں گی اور چاروں طرف اُڑنے لگیں گی، تو یوں محسوس ہوگا جیسے زرد رنگ کے اُونٹ اُچھل کود کر رہے ہیں۔

۲۰ – یہ اُن کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلے کے وقت اُن پر طاری ہوگی۔ اُس سے پہلے میدانِ حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے، حتّٰی کہ بعض لوگ پوری ڈِھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے اُن کا مجرم ہونا پوری طرح ثابت کر دیا جائے گا، اور جب ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اور اُن کے اعضا تک اُن کے خلاف گواہی دے کر ثبوتِ جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے، اور جب بالکل بجا اور برحق طریقے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے انھیں سزا سنا دی جائے گی، تو وہ دم بخود رہ جائیں گے اور ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کا موقع نہ دینے یا اس کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اِس طرح قطعی ناقابلِ انکار حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ وہ اپنی معذرت میں کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ یہ ایسا

ع ۲

لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلے میں چل دیکھو۔[۲۱] تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ع

متّقی[۲۲] لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (اُن کے لیے حاضر ہیں)۔ کھاؤ اور پیو مزے سے، اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔[۲۳]

کھا[۲۴]لو اور مزے کرلو تھوڑے دن۔[۲۵] حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اُس روز

ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے اُس کو بولنے نہیں دیا، یا میں نے اس کی زبان بند کردی، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس پر ایسی حجّت تمام کی کہ اُس کے لیے زبان کھولنے یا کچھ بولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔

۲۱ – یعنی دنیا میں تو تم بہت مکّاریاں اور چالبازیاں کرتے رہے، اب یہاں کوئی چال چل کر میری پکڑ سے بچ سکتے ہو تو ذرا بچ دکھاؤ۔

۲۲ – چونکہ یہ لفظ یہاں مُکَذِّبِین (جھٹلانے والوں) کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے متّقیوں سے مراد اس جگہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو جُھٹلانے سے پرہیز کیا اور اُس کو مان کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ ہمیں آخرت میں اپنے اقوال و افعال اور اپنے اَخلاق و کردار کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

۲۳ – یہاں یہ فقرہ اس معنیٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے ایک مصیبت تو وہ ہوگی جو اُوپر بیان ہو چکی ہے کہ میدانِ حشر میں وہ مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے، علی الاعلان ان کے جرائم اِس طرح ثابت کردیے جائیں گے کہ ان کے لیے زبان کھولنے تک کا یارا نہ رہے گا، اور آخرِ کار جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ دوسری مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوگی کہ وہی ایمان لانے والے جن سے اُن کی عمر بھر لڑائی رہی، جنھیں وہ بیوقوف اور تنگ خیال اور رَجعت پسند کہتے رہے، جن کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور جنھیں اپنے نزدیک حقیر و ذلیل سمجھتے رہے، انھی کو وہ جنّت میں مزے اڑاتے دیکھیں گے۔

۲۴ – اب کلام ختم کرتے ہوئے نہ صرف کُفّارِ مکہ کو بلکہ دنیا کے تمام کفار کو مُخاطَب کرتے ہوئے یہ کلمات

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

ع ۲ / ۱۰ / ۲۲

جھٹلانے والوں کے لیے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے[۲۶]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔ اب اس (قرآن) کے بعد اور کون سا کلام ایسا ہوسکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں[۲۷]؟ ع

ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

۲۵ — یعنی دنیا کی اِس چند روزہ زندگی میں۔

۲۶ — اللہ کے آگے جھکنے سے مراد صرف اس کی عبادت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی نازل کردہ کتاب کو ماننا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

۲۷ — یعنی جو بڑی سے بڑی چیز انسان کو حق و باطل کا فرق سمجھانے والی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والی ہوسکتی تھی وہ قرآن کی صورت میں نازل کر دی گئی ہے۔ اِس کو پڑھ کر یا سُن کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا تو اِس کے بعد پھر اور کیا چیز ایسی ہوسکتی ہے جو اس کو راہِ راست پر لا سکے؟

تفہیم القرآن

اَلنَّبَا

(۷۸)

اَلنَّبَا

نام دوسری آیت کے فقرے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کے لفظ النَّبَا کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس سورت کے مضامین کا عنوان بھی ہے، کیونکہ نبا سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور سورت میں ساری بحث اسی پر کی گئی ہے۔

زمانۂ نُزُول جیسا کہ ہم سورۂ مُرسَلات کے دیباچہ میں بیان کر چکے ہیں، سورۂ قیامت سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور یہ سب مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا مضمون بھی وہی ہے جو سورۂ مُرسَلات کا ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اِثبات، اور اس کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا۔

مکۂ معظمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں: ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپؐ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اِس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالَم برپا ہوگا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انھوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اس محاسبے میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنّت میں جائیں گے، اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان تینوں باتوں میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے، اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اِس لیے جھگڑا صرف اِس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات میں اور اُلوہیّت کی ذات میں اُن کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو مکے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اِس امر سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنھی کے درمیان

گزاری تھی، اس میں انھوں نے کبھی آپؐ کو جھوٹا یا فریب کار، یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپؐ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انھیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار، اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے معاملات میں تو راست باز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں، معاذ اللہ! جھوٹے ہیں۔

اِس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکہ کے لیے دراصل اُتنی زیادہ اُلجھن کی مُوجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اُسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجُّب کا اظہار کیا، اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصوُّر ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتارا جائے، کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملے میں اُن کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملے میں اُن کا معیارِ اقدار بدل سکتا، اور وہ دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام اُن کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صَرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصوُّر بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے، اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔

اِس دَور کی سُورتوں میں آخرت کے مضمون کی اِس تکرار کا سبب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اِس سورت کے مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس میں سب سے پہلے اُن چرچوں اور چہ میگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت کی خبر سُن کر مکہ کے ہر کوچہ و بازار اور اہلِ مکہ کی ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد انکار کرنے والوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا تمھیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمھارے لیے فرش بنا رکھا ہے؟ کیا یہ بلند و بالا پہاڑ تمھیں نظر نہیں آتے جنھیں ہم نے زمین میں گاڑ رکھا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہم نے تمھیں مَردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اپنی نیند کو نہیں دیکھتے جس کے ذریعے سے ہم نے تم کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد ہر چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کر رکھا ہے؟ کیا تم رات اور دن کی آمد و رفت کو نہیں دیکھتے جسے ٹھیک تمھاری ضرورت کے مطابق ہم باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟ کیا تم اپنے اُوپر آسمانوں کے مضبوط بندھے ہوئے

نظام کو نہیں دیکھتے؟ کیا یہ سُورج تمھیں نظر نہیں آتا جس کی بدولت تمھیں روشنی اور حرارت میسّر آ رہی ہے؟ کیا تم اُن بارشوں کو نہیں دیکھتے جو بادلوں سے برس رہی ہیں اور اُن کے ذریعے سے غلّے اور سبزیاں اور گھنے باغ اُگ رہے ہیں؟ یہ ساری چیزیں کیا تمھیں یہی بتا رہی ہیں کہ جس قادرِ مُطلَق نے اِن کو پیدا کیا ہے، اُس کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے سے عاجز ہے؟ اور اِس پُورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کارفرما ہے، کیا اس کو دیکھتے ہوئے تمھاری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اِس کارخانے کا ایک ایک جُز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پورا کارخانہ بے مقصد ہے؟ آخر اس سے زیادہ لغو اور بے معنیٰ بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کارخانے میں انسان کو پیش دست (foreman) کے منصب پر مامور کر کے اسے یہاں بڑے وسیع اختیارات تو دے دیے جائیں، مگر جب وہ اپنا کام پورا کر کے یہاں سے رخصت ہو تو اسے یونہی چھوڑ دیا جائے؟ نہ کام بنانے پر پنشن اور انعام، نہ کام بگاڑنے پر باز پُرس اور سزا؟

یہ دلائل دینے کے بعد پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گا۔ صُور میں بس ایک پُھونک مارنے کی دیر ہے، وہ سب کچھ جس کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے سامنے آ جائے گا، اور تم آج چاہے مانو یا نہ مانو، اُس وقت جہاں جہاں بھی تم مرے پڑے ہو گے، وہاں سے فوج در فوج اپنا حساب دینے کے لیے نکل آؤ گے۔ تمھارا انکار اِس واقعے کو پیش آنے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد آیت ۲۱ سے ۳۰ تک بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھُٹلا دیا ہے، ان کا ایک ایک کرتُوت گن گن کر ہمارے ہاں لکھا ہوا ہے، اور ان کی خبر لینے کے لیے جہنم گھات لگائے ہوئے تیار ہے، جہاں ان کے اعمال کا بھرپور بدلہ انھیں دے دیا جائے گا۔ پھر آیت ۳۱ سے ۳۶ تک اُن لوگوں کی بہترین جزا بتائی گئی ہے جنھوں نے اپنے آپ کو ذمہ دار و جواب دہ سمجھ کر دنیا میں اپنی آخرت دُرست کرنے کی پہلے ہی فکر کر لی ہے، اور انھیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انھیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائے گا بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہاں کسی کے اَڑ کر بیٹھ جانے اور اپنے مُتوسّلین کو بخشوا کر چھوڑنے کا کیا سوال، کوئی بلا اجازت زبان تک نہ کھول سکے گا، اور اجازت بھی اِس شرط کے ساتھ ملے گی کہ جس کے حق میں سِفارش کا اِذن ہو، صرف اسی کے لیے سفارش کرے اور سفارش میں کوئی بے جا بات نہ کہے۔ نیز سفارش کی اجازت صرف اُن لوگوں کے حق میں دی جائے گی جو

دنیا میں کلمۂ حق کے قائل رہے ہیں اور محض گناہ گار ہیں۔ خدا کے باغی اور حق کے منکر کسی سفارش کے مستحق نہ ہوں گے۔

پھر کلام کو اِس تنبیہ پر ختم کیا گیا ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کا آنا برحق ہے، اُسے دُور نہ سمجھو، وہ قریب ہی آلگا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔ لیکن اِس تنبیہ کے باوجود جو اُس کا انکار کرے گا، اس کا سارا کیا دھرا اُس کے سامنے آجائے گا اور پھر وہ پچھتا پچھتا کر کہے گا کہ کاش! مَیں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اُس وقت اُس کا یہ احساس اُسی دنیا کے بارے میں ہوگا جس پر وہ آج لٹو ہو رہا ہے۔

---

۴۰ آیاتھا — سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ — ۲ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ ﴿۲﴾ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۭ ﴿۳﴾ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ ﴿۴﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اُس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں[1]؟ ہرگز نہیں[2]، عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہاں، ہرگز نہیں، عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا[3]۔

۱- بڑی خبر سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے جس کو اہلِ مکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنتے تھے، پھر ہر محفل میں اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ پُوچھ گچھ سے مراد یہی چہ میگوئیاں ہیں۔ لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ بھائی، کبھی پہلے بھی تم نے سُنا ہے کہ مر کے کوئی دوبارہ زندہ ہو گا؟ کیا یہ ماننے کے قابل بات ہے کہ گل سڑ کر جو ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں، ان میں نئے سرے سے جان پڑے گی؟ کیا عقل میں یہ بات سماتی ہے کہ اگلی پچھلی ساری نسلیں اٹھ کر ایک جگہ جمع ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے جمے ہوئے پہاڑ ہوا میں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں گے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چاند، سورج اور تارے سب بُجھ کر رہ جائیں اور دنیا کا یہ سارا جما جمایا نظام الٹ پلٹ ہو جائے؟ یہ صاحب جو کل تک اچھے خاصے دانا آدمی تھے، آج اِنھیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں ایسی عجیب انہونی خبریں سُنا رہے ہیں۔ یہ جنّت اور یہ دوزخ آخر پہلے کہاں تھیں جن کا ذکر ہم نے کبھی اُن کی زبان سے نہ سنا تھا؟ اب یہ ایک دم کہاں سے نکل آئی ہیں کہ اِنھوں نے اُن کے عجیب وغریب نقشے ہمارے سامنے کھینچنے شروع کر دیے ہیں؟

هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ''وہ اس کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔'' دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے انجام کے بارے میں یہ لوگ خود بھی کوئی ایک مُتَّفَق عَلَیہ عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ ''ان کے درمیان اس کے متعلق مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔'' اُن میں سے کوئی عیسائیوں کے خیالات سے متأثر تھا اور زندگی بعدِ موت کو مانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ وہ دوسری زندگی جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہو گی۔ کوئی آخرت کا قطعی مُنکر نہ تھا مگر اسے شک تھا کہ وہ ہو سکتی ہے یا نہیں، چنانچہ قرآنِ مجید ہی میں اس خیال کے لوگوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ، ''ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے۔'' (الجاثیہ، آیت ۳۲)

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ﴿۶﴾ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ﴿۷﴾ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا ﴿۸﴾ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا،[4] اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا،[5] اور تمھیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا،[6] اور تمھاری نیند کو باعثِ سکون بنایا،[7] اور رات کو پردہ پوش

اور کوئی بالکل صاف صاف کہتا تھا کہ وَقَالُوۡۤا اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ "جو کچھ بھی ہے بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔" (الانعام: آیت ۲۹) پھر کچھ لوگ ان میں سے دَہریے تھے اور کہتے تھے کہ مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا یُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔" (الجاثیہ: ۲۴) اور کچھ دوسرے لوگ دَہریے تو نہ تھے مگر دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے، یعنی ان کے نزدیک یہ خدا کی قدرت سے خارج تھا کہ وہ مرے ہوئے انسانوں کو پھر سے زندہ کر سکے۔ ان کا قول تھا: مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهِیَ رَمِیۡمٌ "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" (یٰسین: ۷۸) یہ اُن کے مختلف اقوال خود ہی اس بات کا ثبوت تھے کہ ان کے پاس اِس مسئلے میں کوئی علم نہ تھا، بلکہ وہ محض گمان و قیاس کے تیر تکّے چلا رہے تھے، ورنہ علم ہوتا تو سب کسی ایک بات کے قائل ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الذّاریات، حاشیہ ۶)

۲ – یعنی آخرت کے متعلق جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں سب غلط ہیں۔ جو کچھ انھوں نے سمجھ رکھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۳ – یعنی وہ وقت دُور نہیں ہے جب وہی چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آ جائے گی جس کے بارے میں یہ فضول چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اُس وقت انھیں پتا چل جائے گا کہ رسول نے جو خبر ان کو دی تھی وہی صحیح تھی اور قیاس و گمان سے جو باتیں یہ بنا رہے تھے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

۴ – زمین کو انسان کے لیے فرش، یعنی ایک پُرسکون قیام گاہ بنانے میں قدرت و حکمت کے جو کمالات کارفرما ہیں، ان پر اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدد مقامات پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر مقاماتِ ذیل مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۲۹۔ المومن، حواشی ۹۰-۹۱۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۷۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸۔

۵ – زمین پر پہاڑ پیدا کرنے کی حکمتوں کے متعلق مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۷۴۔ جلد ششم، المُرسَلات، حاشیہ ۱۵۔

وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾

اور دن کو مَعاش کا وقت بنایا،[8] اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے،[9] اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا،[10] اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی، تاکہ اس کے ذریعے سے غلّہ اور سبزی اور گھنے باغ اُگائیں؟[11]

۶ - انسان کو مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا اپنے اندر جو عظیم حکمتیں رکھتا ہے، ان کی تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الروم، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۱۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۷۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۱۲۔ جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۲۵۔

۷ - انسان کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس حکمت کے ساتھ اس کی فطرت میں نیند کا ایک ایسا داعیہ رکھ دیا ہے جو ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹے سونے پر مجبور کر دیتا ہے، اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حاشیہ ۳۳ میں کر چکے ہیں۔

۸ - یعنی رات کو اِس غرض کے لیے تاریک بنا دیا کہ اس میں تم روشنی سے محفوظ رہ کر زیادہ آسانی کے ساتھ نیند کا سُکون حاصل کر سکو، اور دن کو اِس مقصد سے روشن بنایا کہ اس میں تم زیادہ سہولت کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کام کر سکو۔ زمین پر باقاعدگی کے ساتھ مسلسل رات اور دن کا اُلٹ پھیر کرتے رہنے کے بے شمار فوائد میں سے صرف اِس ایک فائدے کی طرف اشارہ یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد، یا اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے بلکہ اِس کے پیچھے ایک بڑی حکمت کام کر رہی ہے، جس کا براہِ راست تمھارے اپنے مفاد سے گہرا تعلق ہے۔ تمھارے وجود کی ساخت اپنے سُکون و راحت کے لیے جس تاریکی کی طالب تھی وہ رات کو، اور اپنی معیشت کے لیے جس روشنی کی طالب تھی وہ دن کو مہیا کی گئی ہے۔ تمھاری ضروریات کے عین مطابق یہ انتظام خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر نہیں ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۶۵۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۲۔ المؤمن، حاشیہ ۸۵۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۴)

۹ - مضبوط کا لفظ اِس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرّہ برابر تغیُّر و تبدُّل نہیں ہونے پاتا، اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالَمِ بالا کے بے شمار تاروں اور سیّاروں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے نہ تمھاری زمین پر آ گرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔

جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۲۔ الحِجر، حواشی ۸ و ۱۲۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۱۳۔ یٰسین، حاشیہ ۳۷۔ الصافّات، حواشی ۵-۶۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔ جلد پنجم، قٓ، حواشی ۷-۸)

۱۰- مراد ہے سورج۔ اصل میں لفظ وَھَّاج استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی، اس لیے ترجمے میں ہم نے دونوں معنٰی درج کر دیے ہیں۔ اِس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُس کا قطر زمین کے قُطر سے ۱۰۹ گُنا اور اس کا حَجم زمین کے حَجم سے ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گُنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دُور ہونے کے باوجود اُس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر بَرَہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے، اور اس کی گرمی کا حال یہ ہے کہ زمین کے بعض حصّوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجۂ حرارت ۱۴۰ ڈگری فاہرن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اُس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اُس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دُور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اِسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اُسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں، جو ہمارے لیے سببِ حیات بنے ہوئے ہیں۔ اُسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اُسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اُٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعے سے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اِس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سُلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظامِ شمسی میں پھینکے چلی جا رہی ہے۔

۱۱- زمین پر بارش کے انتظام اور نباتات کی روئیدگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے جو جو حیرت انگیز کمالات کارفرما ہیں، ان پر تفصیل کے ساتھ تفہیم القرآن کے حسبِ ذیل مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے: جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۷۔ الشعراء، حاشیہ ۵۔ الروم، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔ یٰسین، حاشیہ ۲۹۔ المؤمن، حاشیہ ۲۰۔ الزُّخرُف، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔

اِن آیات میں پے در پے بہت سے آثار وشواہد کو پیش کر کے قیامت اور آخرت کے منکرین کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر زمین اور پہاڑوں اور خود اپنی پیدایش اور اپنی نیند اور بیداری اور روز وشب کے اِس انتظام کو دیکھو، کائنات کے بندھے ہوئے نظام اور آسمان کے چمکتے ہوئے سورج کو دیکھو، بادلوں سے برسنے والی بارش اور اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھو، تو تمھیں دو باتیں ان میں نمایاں نظر آئیں گی: ایک، یہ کہ یہ سب کچھ ایک زبردست قدرت کے بغیر نہ وجود میں آ سکتا ہے، نہ اِس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر ایک عظیم حکمت کام کر رہی ہے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ اب یہ بات صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جو قدرت اِن ساری چیزوں کو وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انھیں فنا کر دینے اور

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿١٧﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿١٨﴾ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿١٩﴾ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾

بے شک فیصلے کا دن ایک مقرّر وقت ہے۔ جس روز صُور میں پھُونک ماردی جائے گی، تم فوج در فوج نکل آؤ گے[12]۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا، اور پہاڑ چلائے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ سَراب ہو جائیں گے[13]۔

دوبارہ کسی اور صورت میں پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی صرف ایک بے عقل ہی کہہ سکتا ہے کہ جس حکیم نے اس کائنات میں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا ہے، اس نے اپنی دنیا میں انسان کو سمجھ بُوجھ، خیر و شر کی تمیز، طاعت و عِصیان کی آزادی، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر تَصرُّف کے اختیارات بے مقصد ہی دے ڈالے ہیں، انسان اُس کی دی ہوئی اِن چیزوں کو اچھی طرح استعمال کرے یا بری طرح، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا، کوئی بھلائیاں کرتے کرتے مر جائے تو بھی مٹی میں مل کر ختم ہو جائے گا، اور برائیاں کرتے کرتے مر جائے تو بھی مٹی ہی میں مل کر ختم ہو جائے گا، نہ بھلے کو اس کی بھلائی کا کوئی اجر ملے گا، نہ برے سے اس کی برائی پر کوئی باز پُرس ہوگی۔ زندگی بعدِ موت اور قیامت و آخرت پر یہی دلائل ہیں جو جگہ جگہ قرآنِ مجید میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ الروم، حاشیہ ۶۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۱۰ و ۱۲۔ الصّافات، حواشی، ۸-۹۔

۱۲ – اس سے مراد وہ آخری نفخ صُور ہے جس کا آوازہ بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان یکایک جی اٹھیں گے، اور تم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اُس وقت مُخاطَب تھے، بلکہ وہ تمام انسان ہیں جو آغازِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴۶-۴۷۔ الزُّمَر، حاشیہ ۷۹)

۱۳ – اِس مقام پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں بھی قرآن کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح قیامت کے مختلف مراحل کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اُس کیفیت کا ذکر ہے جو آخری نفخ صور کے وقت پیش آئے گی، اور بعد کی دو آیتوں میں وہ حالت بیان کی گئی ہے جو دوسرے نفخ صُور کے موقع پر رونما ہوگی۔ اس کی وضاحت ہم تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ الحاقّہ، حاشیہ ۱۰ میں کر چکے ہیں۔ ’’آسمان کھول دیا جائے گا‘‘ سے مراد یہ ہے کہ عالَمِ بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ہر طرف سے ہر آفتِ سماوی اِس طرح ٹوٹی پڑ رہی ہوگی کہ معلوم ہوگا گویا اس کے آنے کے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے کوئی دروازہ بھی بند نہیں رہا ہے۔ پہاڑوں کے چلنے اور سَراب بن کر رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اُڑیں گے

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا ۝۲۱ لِّلطّٰغِيۡنَ مَاٰبًا ۝۲۲ لّٰبِثِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَحۡقَابًا ۝۲۳

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے[14]، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدّتوں پڑے رہیں[15] گے۔

اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر اس طرح پھیل جائیں گے کہ جہاں پہلے کبھی پہاڑ تھے وہاں ریت کے وسیع میدانوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اِسی کیفیّت کو سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ اِن سے کہو: میرا رب ان کو دھول بنا کر اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بَل اور سَلوَٹ تک نہ دیکھو گے۔'' (آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ مع حاشیہ ۸۳)

۱۴- گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری کی حالت میں آئے اور اچانک اس میں پھنس جائے۔ جہنّم کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اُس سے بے خوف ہو کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اُچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی اُن کے لیے ایک کھُلی آماجگاہ ہے، اور یہاں کسی پکڑ کا خطرہ نہیں ہے، لیکن جہنّم اُن کے لیے ایک ایسی چھُپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ یکایک پھنسیں گے اور بس پھنس کر ہی رہ جائیں گے۔

۱۵- اصل میں لفظ اَحۡقَاب استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: پے در پے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل اَدوار کہ ایک دَور ختم ہوتے ہی دُوسرا دَور شروع ہو جائے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنّم میں ہمیشگی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مدّتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں، بہرحال جب مدّتوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہی متصوّر ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہوں گی بلکہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ اِستِدلال دو وجوہ سے غلط ہے: ایک، یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حُقُب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حُقُب کے پیچھے دوسرا حُقُب ہو، اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دَور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دَور نہ آئے۔ دوسرے، یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآنِ مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اُصولاً غلط ہے جو اُسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہلِ جہنّم کے لیے خُلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تین جگہ صرف لفظِ خُلُود ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر اَبَدًا (ہمیشہ ہمیشہ) کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ چاہیں گے کہ جہنّم سے نکل جائیں، مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں، اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔'' (المائدہ، آیت ۳۷) ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ ''اِسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔'' اور یہی بات اہلِ جنت کے متعلق بھی فرمائی گئی ہے کہ ''جنّت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔'' (ہُود، آیات ۱۰۷-۱۰۸) اِن تصریحات کے بعد لفظِ اَحقاب کی بنیاد پر یہ

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ ع اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾

اُس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزا وہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھووَن[16]، (ان کے کرتُوتوں کا) بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انھوں نے بالکل جُھٹلا دیا تھا[17]، اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گِن گِن کر لکھ رکھی تھی[18]۔ اب چکھو مزا، ہم تمھارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے ع

یقیناً متّقیوں[19] کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور، اور نوخیز ہم سِن لڑکیاں[20]،

کہنے کی آخر کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنّم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا بلکہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا؟

۱۶- اصل میں لفظ غَسَّاق استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق پیپ، لہو، کچ لہو، اور آنکھوں اور کھالوں سے بننے والی اُن تمام رطوبتوں پر ہوتا ہے جو شدید تعذیب کی وجہ سے بہ نکلتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس میں سخت تعفّن اور سڑاند ہو۔

۱۷- یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر وہ جہنم کے اس خوف ناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ایک یہ کہ دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انھیں خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ کے ذریعے سے اُن کی ہدایت کے لیے جو آیات بھیجی تھیں انھیں ماننے سے انھوں نے قطعی انکار کر دیا اور ان کو جھوٹ قرار دیا۔

۱۸- یعنی اُن کے اقوال و افعال، ان کی حرکات و سکنات، حتّٰی کہ ان کی نیتوں اور خیالات اور مقاصد تک کا مکمل ریکارڈ ہم تیار کرتے جا رہے تھے جس سے کوئی چیز چھُوٹی ہوئی نہ تھی، اور وہ بے وقوف اِس سے بے خبر اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ کسی اندھیر نگری میں جی رہے ہیں، جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، اُس کی بازپُرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

۱۹- یہاں مُتّقیوں کا لفظ اُن لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے

وَّ كَاْسًا دِهَاقًاؕ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًاۚ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًاۙ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًاۚ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّاۗۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

اور چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سُنیں گے[21]۔ جزا اور کافی انعام[22] تمھارے رب کی طرف سے، اُس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے، جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں[23]۔

جس روز رُوح[24] اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا، سوائے اُس کے جسے رحمٰن اجازت دے

اور جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ اس لیے لامحالہ اِس لفظ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی آیات کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ اُنھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

۲۰ – اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اُن لوگوں کی ہم سِن ہوں گی جن کی زوجیت میں وہ دی جائیں گی۔ سورۂ صٓ، آیت ۵۲، اور سورۂ واقعہ، آیت ۳۷ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔

۲۱ – قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اِس بات کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ آدمی کے کان وہاں بیہودہ اور جھوٹی اور گندی باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ وہاں کوئی یاوہ گوئی اور فضول گپ بازی نہ ہوگی، کوئی کسی سے نہ جھوٹ بولے گا نہ کسی کو جھٹلائے گا، دنیا میں گالم گلوچ، بہتان، افترا، تہمت اور الزام تراشیوں کا جو طوفان برپا ہے، اس کا کوئی نام ونشان وہاں نہ ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۱۳-۱۴)

۲۲ – جزا کے بعد کافی انعام دینے کا ذکر یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اُن کو صرف وہی جزا نہیں دی جائے گی جس کے وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر مستحق ہوں گے، بلکہ اس پر مزید انعام اور کافی انعام بھی انھیں دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہلِ جہنّم کے بارے میں صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ انھیں ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ دے دیا جائے گا، یعنی نہ ان کے جرائم سے کم سزا دی جائے گی، نہ اس سے زیادہ۔ یہ بات قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثلاً: یونس، آیات ۲۶-۲۷۔ النمل، آیات ۸۹-۹۰، القصص، آیت ۸۴۔ سبا، آیات ۳۳ تا ۳۸۔ المومن، آیت ۴۰۔

وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع

اور جو ٹھیک بات کہے۔[۲۵] وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کر لے۔

ہم نے تم لوگوں کو اُس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔[۲۶] جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اُٹھے گا کہ کاش! میں خاک[۲۷] ہوتا۔ ع

۲۳- یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رُعب کا یہ عالَم ہوگا کہ اہلِ زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حُضور زبان کھول سکے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔

۲۴- اہلِ تفسیر کی اکثریت کا خیال یہی ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ان کا جو بلند مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے، اس کی وجہ سے ملائکہ سے الگ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المعارج، حاشیہ ۳)

۲۵- بولنے سے مراد شفاعت ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی: ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور دُرست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے، اور جس کے معاملے میں وہ سفارش کر رہا ہو، وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو، یعنی محض گناہ گار ہو، کافر نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱۔ جلد دوم، یُونُس، حاشیہ ۵۔ ہود، حاشیہ ۱۰۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۲۔ طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۲۷۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۴۰-۴۱۔ المومن، حاشیہ ۳۲۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۶۸۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۲۱۔ جلد ششم، المدَّثِّر، حاشیہ ۳۶)

۲۶- بظاہر ایک آدمی یہ خیال کر سکتا ہے کہ جن لوگوں کو خطاب کر کے یہ بات کہی گئی تھی، ان کو مرے ہوئے اب ۱۴ سو سال گزر چکے ہیں، اور اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت آیندہ کتنے سو، یا کتنے ہزار، یا کتنے لاکھ برس بعد

آئے گی۔ پھر یہ بات کس معنیٰ میں کہی گئی ہے کہ جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ قریب آلگا ہے؟ اور سورت کے آغاز میں یہ کیسے کہا گیا ہے کہ عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وقت کا احساس صرف اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اِس دنیا میں زمان و مکان کی حدود کے اندر جسمانی طور پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ مرنے کے بعد جب صرف روح باقی رہ جائے گی، وقت کا احساس و شعور باقی نہ رہے گا، اور قیامت کے روز جب انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا، اس وقت اسے یُوں محسوس ہو گا کہ ابھی سوتے سوتے اسے کسی نے جگا دیا ہے۔ اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہو گا کہ وہ ہزار ہا سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۴۸)

۲۷ – یعنی دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا، یا مر کر مٹی میں مل جاتا اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کی نوبت نہ آتی۔

تفہیم القرآن

النازعات

(۷۹)

النازعات

نام

پہلے ہی لفظ وَ النّٰزِعٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ سورۂ نباء (عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع قیامت اور زندگی بعدِ موت کا اِثبات ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر تنبیہ بھی کہ خدا کے رسول کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آغازِ کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے، اور اللہ کے احکام کو بلا تاخیر بجالانے والے، اور حکمِ الٰہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھا کر یہ یقین دلایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آ کر رہے گی۔ کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے، اُنھی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی بھی جا سکتی ہے، اور جو فرشتے آج اللہ کے حکم کی تعمیل بلا تاخیر بجالاتے اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں، وہی فرشتے کل اُسی خدا کے حکم سے کائنات کا یہ نظام دَرہم بَرہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام، جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دشوار کام ہی نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ بس ایک جھٹکا دنیا کے اِس نظام کو دَرہم بَرہم کر دے گا، اور ایک دوسرا جھٹکا اِس کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ دوسری دنیا میں یکایک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ۔ اُس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے تھے، خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہوں گے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

پھر حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصّہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ رسول کو جھٹلانے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو رد کرنے اور چال بازیوں سے اس کو شکست دینے کی کوشش کا کیا انجام فرعون دیکھ چکا ہے۔ اُس سے عبرت حاصل کر کے اِس رَوِش سے باز نہ آؤ گے تو وہی انجام تمھیں بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے منکرین سے پوچھا گیا ہے کہ تمھیں دوبارہ پیدا کر دینا زیادہ سخت کام ہے یا اِس عظیم کائنات کو پیدا کرنا جو عالم بالا میں اپنے بے حد و حساب ستاروں اور سیّاروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے؟ جس خدا کے لیے

یہ کام مشکل نہ تھا، اس کے لیے تمھاری بارِ دگر تخلیق آخر کیوں مشکل ہو گی؟ صرف ایک فقرے میں امکانِ آخرت کی یہ مُسکِت دلیل پیش کرنے کے بعد زمین اور اُس سروسامان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین میں انسان اور حیوان کی زِیست کے لیے فراہم کیا گیا ہے اور جس کی ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ اشارہ کر کے اِس سوال کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ آیا اِس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ کر اُس کا مُحاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت نظر آتا ہے، یا یہ کہ وہ زمین میں ہر طرح کے کام کر کے مر جائے اور خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے اور کبھی اُس سے حساب نہ لیا جائے کہ اِن اختیارات کو اس نے کیسے استعمال کیا اور اِن ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کیا؟ اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے آیات ۳۴-۴۱ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آخرت برپا ہوگی تو انسان کے دائمی اور اَبدی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں حدِ بندگی سے تجاوُز کر کے اپنے خدا سے سرکشی کی اور دنیا ہی کے فائدوں اور لذّتوں کو مقصود بنالیا، اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے سے احتراز کیا۔ یہ بات خود بخود اُوپر کے سوال کا صحیح جواب ہر اُس شخص کو بتا دیتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر ایمان داری کے ساتھ اُس پر غور کرے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا بالکل عقلی، منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ اِسی بنیاد پر آخرِ کار اُس کا مُحاسبہ کیا جائے اور اسے جزا یا سزا دی جائے۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ قیامت آئے گی کب؟ یہ سوال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کرتے تھے۔ جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اُس کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسول کا کام صرف خبردار کر دینا ہے کہ وہ وقت آئے گا ضرور۔ اب جس کا جی چاہے اس کے آنے کا خوف کر کے اپنا رَوِیّہ دُرست کر لے، اور جس کا جی چاہے بے خوف ہو کر شُترِ بے مہار کی طرح چلتا رہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو وہی لوگ جو اِس دنیا کی زندگی پر مرے مٹتے تھے اور اِسی کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں وہ صرف گھڑی بھر ٹھیرے تھے۔ اُس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ اس چند روزہ زندگی کی خاطر انھوں نے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل برباد کر لیا۔

---

۴۶ آیاتھا ۔ سُوۡرَۃُ النّٰزِعٰتِ مَکِّیَّۃٌ ۔ ۲ رکوعاتھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾ یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۙ﴿۶﴾ وقف لازم

قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ڈُوب کر کھینچتے ہیں، اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں، اور (اُن فرشتوں کی جو کائنات میں) تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر (حکم بجالانے میں) سبقت کرتے ہیں، پھر (احکامِ الٰہی کے مطابق) معاملات کا انتظام چلاتے ہیں[1]۔ جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا،

۱- یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ لیکن بعد کا مضمون اِس امر پر خود دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان ضرور اَز سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اِس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں، لیکن صحابہؓ اور تابعینؒ کی بڑی تعداد نے اور اکثر مفسّرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مَسْرُوق، سعید بن جُبَیر، ابوصالح، ابوالضُّحٰی اور سُدِّی کہتے ہیں کہ ڈوب کر کھینچنے والوں اور آہستگی سے نکال لے جانے والوں سے مُراد وہ فرشتے ہیں جو موت کے وقت انسان کی جان کو اس کے جسم کی گہرائیوں تک اُتر کر اور اس کی رگ رگ سے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ تیزی سے تیرتے پھرنے والوں سے مراد بھی حضرت علیؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، مجاہد، سعید بن جُبَیر اور ابوصالح نے فرشتے ہی لیے ہیں، جو احکامِ الٰہی کی تعمیل میں اِس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں جیسے کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوں۔ یہی مفہوم ''سبقت کرنے والوں'' کا حضرت علیؓ، مجاہد، مَسْرُوق، ابوصالح اور حسن بصری نے لیا ہے، اور سبقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کا اشارہ پاتے ہی اُن میں سے ہر ایک اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ ''معاملات کا انتظام چلانے والوں'' سے مراد بھی فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت علیؓ، مجاہد، عطاء، ابوصالح، حسن بصری، قَتَادَہ، رَبیع بن اَنَس اور سُدِّی سے منقول ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ سلطنتِ کائنات کے وہ کارکن ہیں جن کے ہاتھوں دنیا کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ اِن آیات کے یہ معنٰی اگرچہ کسی صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہوئے ہیں، لیکن چند اکابر صحابہ نے، اور اُن تابعین نے جو صحابہ ہی کے شاگرد تھے، جب ان کا یہ مطلب بیان کیا ہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ علم حضورؐ ہی سے حاصل کیا گیا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر ان فرشتوں کی قسم کس بنا پر کھائی گئی ہے، جب کہ

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝٧ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝٨ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝٩

اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا،[۲] کچھ دل ہوں گے جو اُس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے،[۳] نگاہیں اُن کی سہمی ہوئی ہوں گی۔

یہ خود بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطورِ شہادت اور بطورِ اِستدلال پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے، واللہ اعلم، کہ اہلِ عرب فرشتوں کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ خود اِس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے، زمین سے آسمان تک آناً فاناً وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ہر کام، جس کا انھیں حکم دیا جائے، بلا تاخیر انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ یہ فرشتے حکمِ الٰہی کے تابع ہیں اور کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے چلاتے ہیں، خودمختار اور اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ جہالت کی بنا پر وہ اُن کو اللہ کی بیٹیاں ضرور کہتے تھے اور اُن کو معبود بھی بنائے ہوئے تھے، لیکن اُن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اصل اختیارات انھی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے یہاں وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر اُن کے مذکورۂ بالا اوصاف سے استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جس خدا کے حکم سے فرشتے تمھاری جان نکالتے ہیں، اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں۔ اور جس خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں، اسی کے حکم سے، جب بھی اُس کا حکم ہو، اِس کائنات کو وہ دَرہم بَرہم بھی کر سکتے ہیں، اور ایک دوسری دنیا بنا بھی سکتے ہیں۔ اُس کے حکم کی تعمیل میں ان کی طرف سے ذرہ برابر بھی سُستی یا لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی۔

۲- پہلے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا، اور دوسرے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جس کے بعد تمام مُردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اِسی کیفیت کو سورۂ زُمَر میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اور صُور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں وہ سب مر کر گر جائیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر ایک دوسرا صُور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔'' (آیت ۶۸)

۳- ''کچھ دل'' کے الفاظ اِس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید کی رُو سے صرف کُفّار و فُجّار اور منافقین ہی پر قیامت کے روز ہَول طاری ہو گا۔ مومنینِ صالحین اُس ہَول سے محفوظ ہوں گے۔ سورۂ انبیاء میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ''وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' (آیت ۱۰۳)

يَقُوۡلُوۡنَ ءَ اِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِى الۡحَافِرَةِ ؕ‏ ﴿۱۰﴾ ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ‏ ﴿۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ‌ ۘ‏ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ‏ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ؕ‏ ﴿۱۴﴾ هَلۡ اَتٰٮكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى‌ۘ ‏﴿۱۵﴾ اِذۡ نَادٰٮهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى‌ ۚ‏ ﴿۱۶﴾

وقف لازم

وقف لازم

یہ لوگ کہتے ہیں: ”کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟“ کہنے لگے: ”یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی![4]“ حالانکہ یہ بس اِتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کُھلے میدان میں موجود ہوں[5] گے۔

کیا[6] تمھیں موسیٰؑ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اُسے طُویٰ کی مقدّس وادی[7] میں پکارا تھا

۴ – یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں، ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یارو! اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تب تو ہم مارے گئے، اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔

۵ – یعنی یہ لوگ اسے ایک امرِ محال سمجھ کر اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، حالانکہ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کو انجام دینے کے لیے کچھ بڑی لمبی چوڑی تیاریوں کی ضرورت ہو۔ اِس کے لیے صرف ایک ڈانٹ یا جھڑکی کافی ہے، جس کے ساتھ ہی تمھاری خاک یا راکھ، خواہ کہیں پڑی ہو، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے گی اور تم یکایک اپنے آپ کو زمین کی پیٹھ پر زندہ موجود پاؤ گے۔ اِس واپسی کو گھاٹے کی واپسی سمجھ کر چاہے تم اِس سے کتنا ہی فرار کرنے کی کوشش کرو، یہ تو ہو کر رہنی ہے، تمھارے انکار یا فرار یا تمسخر سے یہ رُک نہیں سکتی۔

۶ – چونکہ کفارِ مکہ کا قیامت اور آخرت کو نہ ماننا اور اس کا مذاق اڑانا دراصل کسی فلسفے کو رد کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ کے رسول کو جھٹلانا تھا، اور جو چالیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چل رہے تھے، وہ کسی عام آدمی کے خلاف نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی دعوت کو زک دینے کے لیے تھیں، اس لیے وقوعِ آخرت کے مزید دلائل دینے سے پہلے اُن کو حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ سنایا جا رہا ہے، تاکہ وہ خبردار ہو جائیں کہ رسالت سے ٹکرانے اور رسول کے بھیجنے والے خدا کے مقابلے میں سر اٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۷ – وادیِ مقدسِ طُویٰ کے معنی بالعموم مفسّرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ”وہ مقدس وادی جس کا نام طُویٰ تھا۔“ لیکن اس کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ ”وہ وادی جو دو مرتبہ مقدس کی گئی“، کیونکہ ایک

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ

کہ ”فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس سے کہہ: کیا تو اِس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اُس کا) خوف تیرے اندر پیدا[۸] ہو؟“ پھر موسیٰؑ نے (فرعون کے پاس جا کر) اُس کو بڑی نشانی[۹] دکھائی، مگر اُس نے جھٹلا دیا اور

دفعہ اُسے اُس وقت مقدس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰؑ کو مخاطب فرمایا، اور دوسری دفعہ اسے تقدیس کا شرف اُس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اِس وادی میں لائے۔ دوسرے، یہ کہ ”رات کے وقت وادیِ مقدس میں پکارا۔“ عربی میں محاورہ ہے: جاء بعد طُوی، یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصّہ گزرنے کے بعد آیا۔

۸ – یہاں چند باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

(۱) حضرت موسیٰؑ کو منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت جو باتیں اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی تھیں، اُن کو قرآنِ مجید میں حسبِ موقع کہیں مختصر اور کہیں مفصّل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں موقع اختصار کا طالب تھا، اس لیے اُن کا صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ، آیات ۹ تا ۴۸، سورۂ شُعَراء، آیات ۱۰ تا ۱۷، سورۂ نمل، آیات ۷ تا ۱۲، اور سورۂ قصص، آیات ۲۹ تا ۳۵ میں ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

(۲) فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوُز کر کے خالق اور خلق، دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ خالق کے مقابلے میں اُس کی سرکشی کا ذکر تو آگے آ رہا ہے کہ اس نے اپنی رعیت کو جمع کر کے اعلان کیا کہ ”میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔“ اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر وہ سخت ظلم وستم ڈھا رہا تھا، اور اپنی پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص، آیت ۴ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۵۴ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى، ”تم اور ہارون دونوں بھائی اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔“ (طٰہٰ، آیت ۴۴) اِس نرم کلام کا ایک نمونہ تو اِن آیات میں دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مُبلّغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ، آیات ۴۹ تا ۵۲، الشعراء، ۲۳ تا ۲۸، اور القصص، آیت ۳۷ میں دیے گئے ہیں۔ یہ منجملہ اُن آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حکمتِ تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔

عَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿٢٢﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ

نہ مانا، پھر چالبازیاں کرنے کے لیے پلٹا[۱۱] اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا: "میں تمھارا سب سے

(۴) حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بِعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہِ راست دکھانا تھا، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہِ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اصل میں ایک مسلمان قوم تھے) اُس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات اِن آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اِن میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے، بلکہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اُن مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے تبلیغِ اسلام بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً مُلاحظہ ہو: الاَعراف، آیات ۱۰۴-۱۰۵۔ طٰہٰ، آیات ۴۷ تا ۵۲۔ الشُّعَراء، آیات ۱۶-۱۷ و ۲۳ تا ۲۸۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۷۴)

(۵) یہاں پاکیزگی (تَزَکّی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اَخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا، یا دوسرے الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابنِ زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تَزَکّی کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں: وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى، "اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے"، یعنی اسلام لے آئے۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى، اور "تمھیں کیا خبر، شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے"، یعنی مسلمان ہو جائے۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى، "اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے"، یعنی مسلمان نہ ہو۔ (ابن جریر)

(۶) یہ ارشاد کہ "میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف) تیرے دل میں پیدا ہو"، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اپنے رب کو پہچان لے گا اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو اُس کا بندہ ہے، مردِ آزاد نہیں ہے، تو لازماً تیرے دل میں اُس کا خوف پیدا ہوگا، اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا میں آدمی کے رَویّے کے صحیح ہونے کا انحصار ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر کسی پاکیزگی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

۹- بڑی نشانی سے مراد عصا کا اژدہا بن جانا ہے، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بے جان لاٹھی سب دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے عَلانیہ اژدہا بن جائے، جادُوگر اُس کے مقابلے میں لاٹھیوں اور رسّیوں کے جو مصنوعی اژدہے بنا کر دکھائیں ان سب کو وہ نگل جائے، اور پھر حضرت موسیٰؑ جب اس کو پکڑ کر اُٹھا لیں تو وہ پھر لاٹھی کی لاٹھی بن کر رہ جائے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ وہ اللہ ربّ العالمین ہی ہے، جس کی طرف سے حضرت موسیٰؑ بھیجے گئے ہیں۔

۱۰- اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے تمام مصر سے ماہر جادُوگروں

الْاَعْلٰى ۝۲۴ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ۝۲۵ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۲۶ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ۝۲۷

ع ۲۶/۳

بڑا رب ہوں۔[11]" آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اِس میں بڑی عبرت ہے ہر اُس شخص کے لیے جو ڈرے[12] ؏

کیا[13] تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟[14] اللہ نے اُس کو بنایا،

کو بلوایا اور ایک مجمعِ عام میں ان سے لاٹھیوں اور رسّیوں کے اژدہے بنوا کر دکھائے، تاکہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی نبی نہیں بلکہ ایک جادوگر ہیں، اور لاٹھی کا اژدہا بنانے کا جو کرشمہ انھوں نے دکھایا ہے وہ دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی یہ چال اُلٹی پڑی اور جادوگروں نے شکست کھا کر خود تسلیم کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے۔

۱۱ — فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمھیں قید کر دوں گا۔" (الشُّعراء، آیت ۲۹) ایک اور موقع پر اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کر کے کہا: "اے سردارانِ قوم! میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور خدا بھی ہے۔" (القصص، آیت ۳۸) ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدّعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآنِ مجید ہی میں اِس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلّق ہے، وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا، چنانچہ اس کے اہلِ دربار ایک موقع پر اس کو مُخاطَب کر کے کہتے ہیں کہ "کیا آپ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاَعراف، آیت ۱۲۷) اور قرآن میں فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰؑ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اَردَلی میں کیوں نہ آئے؟ (الزُّخرُف، آیت ۵۳) پس درحقیقت وہ مذہبی معنیٰ میں نہیں بلکہ سیاسی معنیٰ میں اپنے آپ کو الٰہ اور ربِّ اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اُوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہو سکتا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاَعراف، حاشیہ ۸۵۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۱۔ الشُّعراء، حواشی ۲۴ و ۲۶۔ القصص، حواشی ۵۲–۵۳۔ جلد چہارم، الزُّخرُف، حاشیہ ۴۹)

۱۲ — یعنی خدا کے رسول کو جھٹلانے کے اُس انجام سے ڈرے جو فرعون دیکھ چکا ہے۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ﴿۳۱﴾

اُس کی چھت خوب اُونچی اُٹھائی پھر اُس کا توازُن قائم کیا، اور اُس کی رات ڈھانکی اور اُس کا دن نکالا۔[15] اِس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا،[16] اُس کے اندر سے اُس کا پانی اور چارا نکالا،[17]

۱۳ – اب قیامت اور حیات بعد الموت کے ممکن اور مقتضائے حکمت ہونے کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

۱۴ – تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالَمِ بالا ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیّارے، بے حد و حساب شمسی نظام اور اَن گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امرِ محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی، اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اِسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا، اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اِس پر قادر نہ ہو سکے؟ حیات بعد الموت پر یہی دلیل قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر دی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین میں ہے: ''اور کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اِس پر قادر نہیں ہے کہ اِن جیسوں کو (پھر سے) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں، وہ تو بڑا زبردست خالق ہے، تخلیق کے کام کو خوب جانتا ہے۔'' (آیت ۸۱) اور سورۂ مومن میں فرمایا: ''یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔'' (آیت ۵۷)

۱۵ – رات اور دن کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ آسمان کا سورج غروب ہونے سے ہی رات آتی ہے اور اسی کے طُلوع ہونے سے دن نکلتا ہے۔ رات کے لیے ڈھانکنے کا لفظ اس معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد رات کی تاریکی اس طرح زمین پر چھا جاتی ہے جیسے اُوپر سے اس پر پردہ ڈال کر ڈھانک دیا گیا ہو۔

۱۶ – ''اِس کے بعد زمین کو بچھانے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی، بلکہ یہ ایسا ہی طرزِ بیان ہے جیسے ہم ایک بات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''پھر یہ بات غور طلب ہے۔'' اس سے مقصود ان دونوں باتوں کے درمیان واقعاتی ترتیب بیان کرنا نہیں ہوتا کہ پہلے یہ بات ہوئی اور اس کے بعد دوسری بات، بلکہ مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔ اِس طرزِ بیان کی متعدِّد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ قلم میں فرمایا: عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ''جفاکار ہے اور اس کے بعد بداصل۔'' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفاکار بنا اور اس کے بعد بداصل ہوا، بلکہ

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے سامانِ زیست کے طور پر تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے۔[۱۸]

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے، اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ بلد میں فرمایا: فَكُّ رَقَبَةٍ...... ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ''غلام آزاد کرے...... پھر ایمان لانے والوں میں سے ہو۔'' اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ نیک اعمال کرے، پھر ایمان لائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اس میں مومن ہونے کی صفت بھی ہو۔ اِس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن میں کہیں زمین کی پیدایش کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور آسمانوں کی پیدایش کا ذکر بعد میں، جیسے سورۂ بقرہ، آیت ۲۹ میں ہے، اور کسی جگہ آسمان کی پیدایش کا ذکر پہلے اور زمین کی پیدایش کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے، جیسے اِن آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ دراصل تضاد نہیں ہے۔ اِن مقامات میں سے کسی جگہ بھی مقصودِ کلام یہ بتانا نہیں ہے کہ کسے پہلے بنایا گیا اور کسے بعد میں، بلکہ جہاں موقع و محل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات کو نمایاں کیا جائے وہاں آسمانوں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور زمین کا بعد میں، اور جہاں سلسلۂ کلام اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لوگوں کو اُن نعمتوں کا احساس دلایا جائے جو انھیں زمین پر حاصل ہو رہی ہیں وہاں زمین کے ذکر کو آسمانوں کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۱۳-۱۴)

۱۷- چارا سے مراد اِس جگہ صرف جانوروں کا چارا نہیں ہے بلکہ وہ تمام نباتات مراد ہیں جو انسان اور حیوان دونوں کی غذا کے کام آتے ہیں۔ رَعْی اور رَتْع اگرچہ بالعموم عربی زبان میں جانور کے چَرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی انسان کے لیے بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں، مثلاً سورۂ یوسف میں آیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے والد ماجد سے کہا: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ، ''آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیں کہ کچھ چَر چُگ لے اور کھیلے۔'' (آیت ۱۲) یہاں بچے کے لیے چَرنے (رتع) کا لفظ جنگل میں چل پھر کر پھل توڑنے اور کھانے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۱۸- اِن آیات میں قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے اِستِدلال کیا گیا ہے۔ ایک، یہ کہ اس خدا کی قدرت سے اِن کا برپا کرنا ہرگز بعید نہیں ہے جس نے یہ وسیع و عظیم کائنات اِس حیرت انگیز توازُن کے ساتھ اور یہ زمین اِس سروسامان کے ساتھ بنائی ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ کے کمالِ حکمت کے جو آثار اس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں، وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ عالَمِ بالا میں بے شمار ستاروں اور سیّاروں اور کہکشانوں کے درمیان جو توازُن قائم ہے، وہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ اَلَل ٹَپ نہیں ہو گیا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اِس کے پیچھے کارفرما ہے۔ یہ رات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾

پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا،[19] جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا،[20]

خود اِسی زمین پر وہ خطّے بھی موجود ہیں جہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر دن اور رات کا اُلٹ پھیر ہو جاتا ہے، اور وہ خطّے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔ زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصّہ پہلی قسم کے خطّوں میں ہے، اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ۶ مہینے کے دن اور ۶ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔ یہ دونوں نمونے اِسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اِس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمد و رفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ایک اندازے کے مطابق کیا گیا ہے۔ اِسی طرح زمین کو اِس طرح بچھانا کہ وہ قابلِ سکونت بن سکے، اِس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے روئیدگی کے قابل ہو، اِس میں پہاڑوں کا جمانا اور وہ تمام چیزیں پیدا کرنا جو انسان اور ہر قسم کے حیوانات کے لیے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بن سکیں، یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ اتفاقی حوادث یا کسی کھلنڈرے کے بے مقصد کام نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر کام ایک بہت بڑی حکیم و دانا ہستی نے بامقصد کیا ہے۔ اب یہ ہر صاحبِ عقل آدمی کے خود سوچنے کی بات ہے کہ آیا آخرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ جو شخص اِن ساری چیزوں کو دیکھنے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ آخرت نہیں ہوگی، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ یہاں اَور سب کچھ تو حکمت اور مقصدیّت کے ساتھ ہو رہا ہے، مگر زمین پر انسان کو ذی ہوش اور بااختیار بنا کر پیدا کرنا بے مقصد اور بے حکمت ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد اور بے حکمت بات نہیں ہو سکتی کہ اِس زمین میں تصرّف کے وسیع اختیارات دے کر انسان کو یہاں ہر طرح کے اچھے اور بُرے کام کرنے کا موقع تو دے دیا جائے مگر کبھی اس کا مُحاسبہ نہ کیا جائے۔

۱۹ – اس سے مراد ہے قیامت، اور اس کے لیے الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ طامّہ بجائے خود کسی ایسی بڑی آفت کو کہتے ہیں جو سب پر چھا جائے۔ اس کے بعد اس کے لیے کُبریٰ کا لفظ مزید استعمال کیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شدت کا تصوّر دلانے کے لیے محض لفظِ طامّہ بھی کافی نہیں ہے۔

۲۰ – یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبے کا دن آ گیا ہے جس کی اُسے دنیا میں خبر دی جا رہی تھی، تو قبل اِس کے کہ اُس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے، اسے ایک ایک کر کے اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دنیا میں کر کے آیا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ تجربہ خود اِس دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ اگر یکایک کسی وقت وہ

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾

اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنّت اس کا ٹھکانا ہوگی۔[21]

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھیرے[22] گی؟" تمھارا کیا کام کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو ہر اُس شخص کو جو اُس کا خوف کرے۔[23]

کسی ایسے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس میں موت ان کو بالکل قریب کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو اپنی پُوری زندگی کی فلم اُن کی چشمِ تصوّر کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔

۲۱ – یہاں چند مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخرت میں اصل فیصلہ کس چیز پر ہونا ہے۔ دنیا میں زندگی کا ایک رَوِیّہ یہ ہے کہ آدمی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے اپنے خدا کے مقابلے میں سرکشی کرے اور یہ طے کرلے کہ اِسی دُنیا کے فائدے اور لذّتیں اُسے مطلوب ہیں، خواہ کسی طرح بھی وہ حاصل ہوں۔ دوسرا رَوِیّہ یہ ہے کہ یہاں زندگی بسر کرتے ہوئے آدمی اِس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ آخرِ کار ایک دن اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور نفس کی بُری خواہشات کو پورا کرنے سے اِس لیے باز رہے کہ اگر یہاں اُس نے اپنے نفس کا کہا مان کر کوئی ناجائز فائدہ کما لیا، یا کوئی ناروا لذّت حاصل کرلی تو اپنے رب کو کیا جواب دے گا۔ آخرت میں فیصلہ اِسی بات پر ہونا ہے کہ انسان نے اِن دونوں میں سے کون سا رَوِیّہ دنیا میں اختیار کیا۔ پہلا رَوِیّہ اختیار کیا ہو تو اس کا مستقل ٹھکانا دوزخ ہے، اور دوسرا رَوِیّہ اختیار کیا ہو تو اس کی مستقل جائے قیام جنت۔

۲۲ – کُفّارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال بار بار کرتے تھے اور اس سے مقصود قیامت کی آمد کا وقت اور اس کی تاریخ معلوم کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن،

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾ ع

جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انھیں یوں محسوس ہوگا کہ (یہ دنیا میں یا حالتِ موت میں) بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھیرے ہیں۔[۲۴] ع

جلد ششم، تفسیر سورۂ مُلک، حاشیہ ۳۵)

۲۳- اِس کی تشریح بھی ہم تفسیر سورۂ مُلک، حاشیہ ۳۶ میں کر چکے ہیں۔ رہا یہ ارشاد کہ تم ہر اُس شخص کو خبردار کر دینے والے ہو جو اس کا خوف کرے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوف نہ کرنے والوں کو خبردار کرنا تمھارا کام نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے خبردار کرنے کا فائدہ اسی کو پہنچے گا جو اُس دن کے آنے کا خوف کرے۔

۲۴- یہ مضمون اِس سے پہلے کئی جگہ قرآن میں بیان ہو چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۵۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔ المؤمنون، حاشیہ ۱۰۱۔ الروم، حواشی ۸۱-۸۲۔ جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۴۸۔ اس کے علاوہ یہ مضمون سورۂ اَحقاف، آیت ۳۵ میں بھی گزر چکا ہے، جس کی تشریح ہم نے وہاں نہیں کی، کیونکہ پہلے کئی جگہ تشریح ہو چکی تھی۔

تفہیم القرآن

عَبَسَ

(۸۰)

عَبَسَ

نام پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مفسّرین و محدثین نے بالاتفاق اِس سورہ کا سببِ نُزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکۂ معظّمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابنِ اُمّ مَکْتُومؓ نامی ایک نابینا، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپؐ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپؐ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ اِس تاریخی واقعے سے اِس سورہ کا زمانۂ نزول بآسانی متعیّن ہو جاتا ہے۔

اوّلاً، یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابنِ اُمّ مَکْتُومؓ بالکل ابتدائی دَور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابنِ حَجَر اور حافظ ابنِ کثیر تصریح کرتے ہیں کہ **اَسْلَمَ بِمَكَّةَ قَدِيْمًا**، اور **هُوَ مِمَّنْ اَسْلَمَ قَدِيْمًا**، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکۂ معظّمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً، حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لا چکے تھے، اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضورؐ کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے آ کر عرض کیا تھا: یا رسُول اللّٰہ! ارشدنی، ”یا رسولؐ اللہ! مجھے سیدھا راستہ بتایئے۔“ (ترمِذِی، حاکم، ابنِ حِبّان، ابنِ جَرِیر، ابویَعلیٰ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ آ کر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضورؐ سے عرض کیا: یا رسول اللّٰہ علّمنی مِمّا علّمك اللّٰہ، ”یا رسولؐ اللہ! مجھے وہ علم سکھایئے جو اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے۔“ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم) اِن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابنِ زیدؒ آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى کا مطلب لَعَلَّهٗ يُسْلِمُ ”شاید کہ وہ اسلام قبول کر لے“ بیان کرتے ہیں۔ (ابنِ جَرِیر) اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ ”تمھیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟“ اور یہ کہ ”جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو“ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق کا

گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپؐ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ اُن کی یہ طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انھیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً، حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اِس فہرست میں ہمیں عُتبہ، شَیبہ، ابوجہل، اُمَیّہ بن خَلَف، اُبَیّ بن خَلَف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِن لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کش مکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپؐ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپؐ کے ساتھ اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب اُمور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورت بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اِس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبُّر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غَلَطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپؐ اختیار فرما رہے تھے۔ آپؐ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپؐ بڑے لوگوں کو مُعزّز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ! یہ کوئی کج خُلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے بااثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا، جس کا مُحرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا، نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیُّل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپؐ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپؐ کی توجہ کے

اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سورت سے آیت ۱۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۷ سے براہِ راست عتاب کا رخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رَوِیّے پر اُنھیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خالق و رازق پروردگار کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس رَوش کا کیسا ہولناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

---

۴۲ آیاتھا ۱ رکوعاتھا

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤىۙ ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰىؕ ﴿۲﴾ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ

تُرش رُو ہوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آ گیا۔[1] تمھیں کیا خبر، شاید

۱- اِس پہلے فقرے کا اندازِ بیان عجیب لُطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ تُرش رُوئی اور بے رُخی برتنے کا یہ فعل حضورؐ ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن کلام کی ابتدا اِس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضورؐ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صُدور ہوا ہے۔ اِس طرزِ بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپؐ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اِسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپؐ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رَوِیّے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابنِ اُمِّ مَکْتُوم ہیں۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے اَلْاِسْتِیْعاب میں اور حافظ ابنِ حَجَرؒ نے اَلْاِصَابَہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، ان کی ماں اُمِّ مکتوم اور حضرت خدیجہؓ کے والد خُوَیلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اِس شُبہے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ آپؐ نے اُن کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے اپنے برادرِ نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رَوِیّہ اختیار کیا، لفظِ اَعْمٰی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ مَیں اِس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں، اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پا لے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابنِ مکتومؓ ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر اِن سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اِس لیے اِن کو اِس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں، اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

يَزَّكّٰىٓ ۙ﴿۳﴾ اَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّكۡرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيۡكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنۡ جَآءَكَ يَسۡعٰى ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخۡشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّاۤ اِنَّهَا

وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجُّہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دَوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو[۲]۔ ہرگز نہیں[۳]، یہ تو ایک

۲- یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ دین کے معاملے میں اِس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابنِ اُمِّ مَکْتُومؓ کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپؐ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالبِ حق ہے، اِس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رَوِیّہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اِس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیرِ بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اِس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اُس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرلے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی رَوِش عَلانِیَہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صَرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

۳- یعنی ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر پُھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اُس کے سامنے اِسے بَاِلحاح پیش کیا جائے،

تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾

وقف لازم

نصیحت[۴] ہے، جس کا جی چاہے اِسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرّم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں[۵]، معزّز اور نیک کاتبوں[۶] کے ہاتھوں میں رہتے ہیں[۷]۔

اور نہ تمھاری یہ شان ہے کہ اِن مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمھاری کوئی غرض اِن سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمھاری دعوت فروغ پا سکے گی، ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق اِن سے اُتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

۴ – مراد ہے قرآن۔

۵ – یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔ ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریّات اِن میں راہ نہیں پا سکے ہیں۔ جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کر دی گئی ہیں اُن کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکا ہے۔ انسانی تخیُّلات ہوں، یا شیطانی وساوِس، اُن سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

۶ – ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے اِن صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے تھے، اُن کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انھیں جُوں کا تُوں پہنچا رہے تھے۔ ان کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: ایک کِرام، یعنی معزّز۔ دوسرے بارّ، یعنی نیک۔ پہلے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزّت ہیں کہ جو امانت ان کے سُپرد کی گئی ہے، اس میں ذرّہ برابر خیانت کا صُدور بھی اُن جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان صحیفوں کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے، اُس کا حق وہ پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

۷ – جس سلسلۂ بیان میں یہ آیات ارشاد ہوئی ہیں، ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآنِ مجید کی یہ تعریف محض اُس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے، بلکہ اصل مقصود ان تمام مُتکبّر لوگوں کو، جو حقارت کے ساتھ اِس کی دعوت سے منہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف جتا دینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اِس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ تمھاری حضوری میں اِسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرفِ قبولیت عطا کرو۔ یہ تمھاری محتاج نہیں ہے بلکہ تم اِس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خنّاس تمھارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح اس کی دعوت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بے نیاز بنتے ہو اُس سے بہت زیادہ یہ تم سے بے نیاز

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾ مِنۡ اَىِّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ ۙ﴿۲۰﴾

لعنت[8] ہو انسان[9] پر، کیسا سخت منکرِ حق ہے[10] یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اِسے پیدا کیا ہے؟ نُطفے کی ایک بُوند سے[11]۔ اللہ نے اِسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی[12]، پھر اِس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی[13]،

ہے۔ تمھاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمھاری بڑائی کا سارا گھمنڈ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

۸ - یہاں سے عِتاب کا رخ براہِ راست اُن کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بے نیازی برت رہے تھے۔ اس سے پہلے آغازِ سورۃ سے آیت ۱۶ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور عِتاب در پردہ کفار پر فرمایا جارہا تھا۔ اُس کا اندازِ بیان یہ تھا کہ اے نبیؐ! ایک طالبِ حق کو چھوڑ کر آپؐ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صَرف کر رہے ہیں جو دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بالکل بے قدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپؐ جیسا عظیم القدر پیغمبر قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

۹ - قرآنِ مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مَذمّت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ''انسان'' کا لفظ کہیں تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کہیں اِس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعیُّن کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو اُن میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے نصیحت کا یہ طریقہ زیادہ موثّر ہوتا ہے کہ عُمومی انداز میں بات کہی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۶۵۔ الشُّوریٰ، حاشیہ ۷۵)

۱۰ - دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟'' یعنی بالفاظِ دیگر کس بَل بُوتے پر یہ کفر کرتا ہے؟ کفر سے مراد اِس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے محسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق و رازق اور مالک کے مقابلے میں باغیانہ روِش بھی۔

۱۱ - یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اِس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اِس اصل کو بھول کر یہ ہمچو ما دیگرے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اِس کے دماغ میں یہ ہوا بھرتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے؟ (یہی بات ہے جو سورۂ یٰسین، آیات ۷۷-۷۸ میں فرمائی گئی ہے۔)

۱۲ - یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کر دی گئی۔ اِس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا

پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا[14]۔ پھر جب چاہے وہ اِسے دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے[15]۔ ہر گز نہیں، اِس نے

کیا ہوگا۔ اِس کا قد کتنا ہوگا۔ اِس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضا کس حد تک صحیح وسالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی؟ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اُٹھے گا۔ اس کی شخصیّت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اِسے زمین پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اِس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر ردو بدل کر سکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ جرأت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے، اُس کے مقابلے میں کفر کرتا ہے۔

۱۳ – یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے اُن کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ مزید برآں خالق نے اِس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اُس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

۱۴ – یعنی اپنی پیدایش اور اپنی تقدیر کے معاملے ہی میں نہیں، بلکہ اپنی موت کے معاملے میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بے بس ہے۔ نہ اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحے کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اِس کی موت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اُسی وقت، اُسی جگہ اور اُسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کر دی گئی ہے اُسی نوعیت کی قبر میں ودیعت ہو جاتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا الاؤ، یا کسی درندے کا معدہ۔ انسان خود تو درکنار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملے میں خالق کے اِس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

۱۵ – یعنی اِس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اِسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کر سکے۔ پہلے جب اسے پیدا کیا گیا تھا تو اِس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اِس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تُو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کر دیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اِسی طرح اب دوبارہ پیدایش بھی اِس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اُٹھے اور اُٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اُٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اِس معاملے میں بھی یہ قطعی بے بس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اِسے اُٹھا کھڑا کرے گا اور اِس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾

وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اِسے حکم دیا تھا۔[16] پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔[17] ہم نے خوب پانی لُنڈھایا،[18] پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا،[19] پھر اُس کے اندر اُگائے غلّے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے سامانِ زِیست کے طور پر۔[20]

۱۶- حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرّہ اور قدرتِ الٰہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے بھیجا اور ہر دَور کے صالحین کے ذریعے سے پھیلایا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ دَہر، حاشیہ ۵) اِس سلسلۂ بیان میں یہ بات اِس معنیٰ میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اُوپر کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اُن کی بِنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرماں برداری کرتا، مگر اس نے اُلٹی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندۂ مخلوق ہونے کا جو تقاضا تھا اسے پورا نہ کیا۔

۱۷- یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمولی چیز سمجھتا ہے، اُس پر ذرا غور تو کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اِس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کر لیتا؟

۱۸- اِس سے مُراد بارش ہے۔ سُورج کی حرارت سے بے حدّ و حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اُٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلاتی ہیں، پھر عالَمِ بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں از سرِ نو پانی کی شکل اختیار کرتی اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی ہیں، پھر وہ پانی براہِ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیرِ زمین کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اُس کا خالق اُس

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ ﴿۳۶﴾ لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ

آخرِ کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز[21] بلند ہوگی ــــــ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا[22]۔ ان میں سے ہر شخص پر

کی رزق رسانی کے لیے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

۱۹- زمین کو پھاڑنے سے مراد اُس کو اِس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پنیریاں انسان اُس کے اندر بوئے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعے سے، یا کسی اور طریقے سے اُس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے، اور جو تخم خدا نے پیدا کر دیے ہیں، انھیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اُسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اُسی نے اِن تخموں میں یہ خاصیّت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھُوٹیں اور ہر تخم سے اُسی کی جنس کی نباتات اُگے۔ اور اُسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسبِ حال غذا بہم پہنچا کر اسے نَشْو و نَما دے۔ یہ تخم اِن خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

۲۰- یعنی تمھارے ہی لیے نہیں بلکہ اُن جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمھاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اس سرو سامان سے مُتمتّع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اُسی سے کفر کرو؟

۲۱- مراد ہے آخری نفخِ صُور کی قیامت خیز آواز، جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اُٹھیں گے۔

۲۲- اِس سے ملتا جُلتا مضمون سورۂ معارِج، آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اِن عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اِس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے،

يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

ع ۴۲ ۵

اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔[۲۳] کچھ چہرے اُس روز دَمک رہے ہوں گے، ہشّاش بشّاش اور خوش وخرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اُڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔ع

اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدّمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۲۳۔ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز سب لوگ ننگے بُچّے اُٹھیں گے۔" آپؐ کی ازواجِ مُطہّرات میں سے کسی نے (بروایتِ بعض حضرت عائشہؓ نے، اور بروایت بعض حضرت سَودہؓ نے، اور بروایتِ بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا: یارسولؐ اللہ! کیا ہمارے سَتر اُس روز سب کے سامنے کُھلے ہوں گے؟ حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اُس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا۔ (نَسائی، تِرمِذی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جریر، طَبَرانی، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی، حاکم)

تفہیم القرآن

التکویر

(۸۱)

التکویر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ کُوِّرَتْ سے ماخوذ ہے۔ کُوِّرَتْ تکویر سے صیغۂ ماضی مجہول ہے، جس کے معنی ہیں لپیٹی گئی۔ اس نام سے مراد یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لپیٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول مضمون اور اندازِ بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کے دو موضوع ہیں: ایک آخرت، دوسرے رسالت۔

پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے جب سُورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اُڑنے لگیں گے، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اُٹھیں گے۔ پھر سات آیتوں میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جب رُوحیں اَزسرِنَو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی، نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، جرائم کی بازپُرس ہو گی، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنّت سب چیزیں نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ آخرت کا یہ سارا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہہ کر انسان کو سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اُس وقت ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کا مضمون لیا گیا ہے۔ اس میں اہلِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں ہے، نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے، بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے ایک بزرگ، عالی مقام اور امانت دار پیغام بر کا بیان ہے، جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے آسمان کے اُفُق پر دن کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اِس تعلیم سے منہ موڑ کر آخر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟

---

۲۹ آیاتھا

سُوۡرَةُ التَّكۡوِيۡرِ مَكِّيَّةٌ

رکوعاتھا ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝۲ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝۳ وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۝۴ وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۝۵

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا،[1] اور جب تارے بکھر جائیں گے،[2] اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے،[3] اور جب دس مہینے کی حاملہ اُونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی،[4] اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے،[5]

۱ – سورج کے بے نور کر دیے جانے کے لیے یہ ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تکویر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔ سر پر عمامہ باندھنے کے لیے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں، کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اُسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اُس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے نظامِ شمسی میں پھیلتی ہے، عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا، یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔

۲ – یعنی وہ بندش جس نے اُن کو اپنے اپنے مدار اور مقام پر باندھ رکھا ہے، کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اِنکدار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔

۳ – دوسرے الفاظ میں زمین کی وہ کشش بھی ختم ہو جائے گی جس کی بدولت پہاڑ وزنی ہیں اور جمے ہوئے ہیں۔ پس جب وہ باقی نہ رہے گی تو سارے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور بے وزن ہو کر زمین پر اِس طرح چلنے لگیں گے جیسے فضا میں بادل چلتے ہیں۔

۴ – عربوں کو قیامت کی سختی کا تصوّر دلانے کے لیے یہ بہترین طرزِ بیان تھا۔ موجودہ زمانے کے ٹرک اور بسیں چلنے سے پہلے اہلِ عرب کے لیے اُس اُونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ جننے کے قریب ہو۔ اِس حالت میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی، تاکہ وہ کھوئی نہ جائے، کوئی اسے چُرا نہ لے، یا اور کسی طرح وہ ضائع نہ ہو جائے۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا گویا یہ معنی رکھتا تھا کہ اُس وقت کچھ ایسی سخت اُفتاد لوگوں پر پڑے گی کہ انھیں اپنے اِس عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔

۵ – دنیا میں جب کوئی عام مصیبت کا موقع آتا ہے تو ہر قسم کے جانور بھاگ کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۪ۙ﴿۷﴾ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۚ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ

اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے،[6] اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی،[7][8] اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟[9] اور جب اعمال نامے

اُس وقت نہ سانپ ڈستا ہے، نہ شیر پھاڑتا ہے۔

۶ – اصل میں لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تَسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عَرَبی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اِس میں کوئی چیز بھی قابلِ تعجُّب محسوس نہ ہوگی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن، دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اُٹھنے والی ہے، اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادّہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اِس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اِس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔

۷ – یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

۸ – یعنی انسان از سرِ نَو اُسی طرح زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ دنیا میں مرنے سے پہلے جسم و روح کے ساتھ زندہ تھے۔

۹ – اس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضب ناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضب ناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ ان کو مُخاطَب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچّی سے پوچھا جائے گا کہ تُو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی، اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فَحوٰی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیّت نے ان کو اَخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انھیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیّت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اِس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا، آخر اس کی کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے،

اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اِس بے دردانہ ظلم کی باز پُرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اِس پر کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا، نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے دادرہ جانا چاہیے؟

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا۔ ایک، مَعاشی خستہ حالی، جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔ بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انھیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انھیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے، عام بدامنی، جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اُلٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ تیسرے، عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں، انھیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ اِن وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا، تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملے میں جو شقاوت برتی جاتی تھی، اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُنَنِ دارمی کے پہلے ہی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے عہدِ جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکّا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی: ہائے ابا، ہائے ابا۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو دیے اور آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا: اے شخص! تو نے حضورؐ کو غمگین کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: اِسے مت روکو، جس چیز کا اِسے سخت احساس ہے اُس کے بارے میں اِسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کر۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپؐ سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اللہ نے اسے معاف کر دیا، اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہلِ عرب اِس انتہائی غیر انسانی فعل کی قَباحَت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی برائی کے احساس سے بالکل خالی

نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی گئی ہے، بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تُو کس قصور میں ماری گئی۔ عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانہ جاہلیّت میں اس رسم کی قباحت کا احساس تھا۔ طَبَرانی کی روایت ہے کہ فَرَزْدَق شاعر کے دادا صَعْصَعَہ بن ناجیۃ المُجاشِعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسولَ اللہ! میں نے جاہلیّت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اُونٹ فِدیے میں دیے۔ کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں، تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

درحقیقت یہ اسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ عرب سے اس انتہائی سنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا، بلکہ اِس تخیُّل کو مٹایا کہ بیٹی کی پیدائش کوئی حادثہ اور مصیبت ہے جسے بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے۔ اِس کے برعکس اسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کو پرورش کرنا، انھیں عمدہ تعلیم و تربیت دینا اور انھیں اس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی گھر والی بن سکیں، بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں لڑکیوں کے متعلق لوگوں کے عام تصوُّر کو جس طرح بدلا ہے، اس کا اندازہ آپؐ کے ان بہت سے ارشادات سے ہوسکتا ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہم آپؐ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں:

من ابتُلِیَ من ھٰذہ البنات بشیءٍ فاحسن الیھنّ کن لہٗ ستْرًا من النار۔ (بخاری، مسلم)	جو شخص اِن لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر وہ اِن سے نیک سلوک کرے تو یہ اس کے لیے جہنّم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔
من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا و ھٰکذا و ضم اصابعہٗ۔ (مسلم)	جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں، تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا، یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا۔
من عال ثلٰث بنات او مثلھن من الاخوات فادّبھن و رحمھن حتّٰی یغنیھن اللّٰہ اوجب اللّٰہ لہ الجنّۃ۔ فقال رجل یا رسول اللّٰہ او اثنتین؟ قال او اثنتین حتّٰی لو قالوا او واحدۃ لقال	جس شخص نے تین بیٹیوں، یا بہنوں کو پرورش کیا، ان کو اچھا ادب سکھایا اور ان سے شفقت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں، تو اللہ اس کے لیے جنت واجب کردے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسولَ اللہ! اور دو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾ وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾ وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾

کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے[۱۰] گا، اور جب جہنّم دہکائی جائے گی، اور جب جنّت قریب لے آئی جائے[۱۱] گی، اُس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

واحدۃ۔ (شرح السُّنَّۃ)

نے فرمایا: اور دو بھی۔ حدیث کے راوی ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ اس وقت ایک کے متعلق پوچھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

من کانت له انثٰی فلم یئدها ولم یهنها ولم یؤثر ولده علیها ادخله الله الجنّة۔ (ابوداؤد)

جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے، نہ بیٹے کو اُس پر ترجیح دے، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

من کان له ثلاث بنات وصبر علیهنّ وکساهُنّ من جِدَتِهٖ کن له حجابًا مّن النار۔

(بخاری فی الادب المفرد، ابن ماجہ)

جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے اور اپنی وسعت کے مطابق ان کو اچھے کپڑے پہنائے، وہ اس کے لیے جہنّم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

ما من مسلم تدرکه ابنتان فیحسن صحبتهما الا ادخلتاه الجنّة۔

(بخاری، ادب المفرد)

جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کو اچھی طرح رکھے، وہ اسے جنّت میں پہنچائیں گی۔

انّ النّبی صلی الله علیه وسلم قال لسُراقة بن جُعْشُم الا ادلك علی اعظم الصدقة او من اعظم الصدقة؟ قال بلٰی یا رسول اللّٰہ۔ قال ابنتك المردودة الیك لیس لها کاسب غیرك۔

(ابنِ ماجہ، بخاری فی الادب المفرد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سُراقہؓ بن جُعْشُم سے فرمایا: میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ (یا فرمایا: بڑے صدقوں میں سے ایک) کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ضرور بتایئے یا رسولؐ اللہ۔ فرمایا: تیری وہ بیٹی جو (طلاق پا کر یا بیوہ ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو۔

یہی وہ تعلیم ہے جس نے لڑکیوں کے متعلق لوگوں کا نقطۂ نظر صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی اُن تمام قوموں

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ

پس نہیں،[۱۲] میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے اور چھُپ جانے والے تاروں کی، اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہوئی، اور صبح کی جب کہ اس نے سانس لیا،[۱۳] یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول[۱۴] ہے جو بڑی توانائی رکھتا ہے،[۱۵]

میں بدل دیا جو اسلام کی نعمت سے فیض یاب ہوتی چلی گئیں۔

۱۰ – یعنی جو کچھ اب نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ سب عیاں ہو جائے گا۔ اب تو صرف خلا نظر آتا ہے یا پھر بادل، گرد و غبار، چاند، سورج اور تارے۔ لیکن اُس وقت خدا کی خدائی اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب کے سامنے بے پردہ ہو جائے گی۔

۱۱ – یعنی میدانِ حشر میں جب لوگوں کے مقدّمات کی سماعت ہو رہی ہو گی اُس وقت جہنّم کی دہکتی ہوئی آگ بھی سب کو نظر آ رہی ہو گی اور جنّت بھی اپنی ساری نعمتوں کے ساتھ سب کے سامنے موجود ہو گی، تاکہ بد بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے محروم ہو کر کہاں جانے والے ہیں، اور نیک بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے بچ کر کن نعمتوں سے سرفراز ہونے والے ہیں۔

۱۲ – یعنی تم لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ کسی دیوانے کی بڑ ہے یا کوئی شیطانی وسوسہ ہے۔

۱۳ – یہ قسم جس بات پر کھائی گئی ہے، وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہے۔ مطلب اِس قسم کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے، بلکہ جب تارے چھُپ گئے تھے، رات رخصت ہو گئی تھی اور صبح روشن نمودار ہو گئی تھی، اُس وقت کھُلے آسمان پر اُنھوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں، وہ اُن کے آنکھوں دیکھے مُشاہدے اور پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔

۱۴ – اس مقام پر بزرگ پیغامبر (رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ) سے مراد وحی لانے والا فرشتہ ہے، جیسا کہ آگے کی آیات سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے۔ اور قرآن کو پیغام بر کا قول کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اس فرشتے کا اپنا کلام ہے، بلکہ ”قولِ پیغامبر“ کے الفاظ خود ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا کلام ہے جس نے اسے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ سورۂ الحاقّہ، آیت ۴۰ میں اِسی طرح قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہا گیا ہے، اور وہاں بھی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حضورؐ کا اپنا تصنیف کردہ ہے بلکہ اسے ”رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ“ کا قول کہہ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس چیز کو حضورؐ خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ محمدؐ بن عبداللہ کی حیثیت سے۔ دونوں جگہ قول کو

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍۙ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍؕ۝۲۱ وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍۚ۝۲۲ وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِۚ۝۲۳

عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اُس کا حکم مانا جاتا ہے[16]، وہ بااعتماد ہے[17]۔ اور (اے اہلِ مکّہ!) تمھارا رفیق[18] مجنون نہیں ہے، اُس نے اُس پیغام بر کو روشن اُفق پر دیکھا ہے[19]۔

فرشتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیغام لانے والے فرشتے کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الحاقّہ، حاشیہ ۲۲)

۱۵- سورۂ نجم آیات ۴-۵ میں اِسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیۙ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰیۙ ”یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے، اُس کو زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے۔“ یہ بات درحقیقت متشابہات میں سے ہے کہ جبریل علیہ السلام کی اِن زبردست قوتوں اور ان کی اِس عظیم توانائی سے کیا مراد ہے۔ بہرحال اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں میں بھی وہ اپنی غیر معمولی طاقتوں کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ مسلم، کتاب الایمان میں حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے دو مرتبہ جبریلؑ کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، اُن کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ بخاری، مسلم، ترمِذی اور مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اِس شان میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پَر تھے۔ اس سے کچھ ان کی زبردست طاقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۶- یعنی وہ فرشتوں کا افسر ہے۔ تمام فرشتے اُس کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں۔

۱۷- یعنی وہ اپنی طرف سے کوئی بات خدا کی وحی میں ملا دینے والا نہیں ہے، بلکہ ایسا امانت دار ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے اُسے جُوں کا تُوں پہنچا دیتا ہے۔

۱۸- رفیق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور آپؐ کو اہلِ مکہ کا رفیق کہہ کر دراصل انھیں اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ آپؐ اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ انھی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں۔ انھی کے درمیان آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی ہے، اور اُن کے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپؐ کس قدر دانا اور ہوش مند ہیں۔ ایسے شخص کو جانتے بُوجھتے مجنون کہتے ہوئے انھیں کچھ تو شرم آنی چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حواشی ۲-۳)

۱۹- سورۂ نجم، آیات ۷ تا ۹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس مُشاہَدے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ ﴿۲۵﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿۲۶﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَّسْتَقِيمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿۲۹﴾ ع

اور وہ غیب (کے اِس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملے میں بخیل نہیں ہے[۲۰]۔ اور یہ کسی شیطان مَرۡدُود کا قول نہیں ہے[۲۱]۔ پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے جو راہِ راست پر چلنا چاہتا ہو[۲۲]۔ اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ ربّ العالمین نہ چاہے[۲۳]۔ ع

کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حواشی ۷-۸)

۲۰ – یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے۔ غیب کے جو حقائق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کھولے گئے ہیں، خواہ وہ اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں ہوں، یا فرشتوں کے بارے میں، یا زندگی بعدِ موت اور قیامت اور آخرت اور جنّت اور دوزخ کے بارے میں، سب کچھ تمھارے سامنے بے کم وکاست بیان کر دیتے ہیں۔

۲۱ – یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بُت پرستی اور دہریت والحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شُترِ بے مہار بن کر رہنے کے بجائے خدا کے حضور ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسموں اور ظلم اور بداخلاقی اور بدکرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشُّعراء، آیات ۲۱۰ تا ۲۱۲ مع حواشی ۱۳۰ تا ۱۳۳، اور آیات ۲۲۱ تا ۲۲۳ مع حواشی ۱۴۰-۱۴۱)

۲۲ – بالفاظِ دیگر، یہ کلام نصیحت ہے تو ساری نوعِ انسانی کے لیے، مگر اس سے فائدہ وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جو خود راست روی اختیار کرنا چاہتا ہو۔ انسان کا طالبِ حق اور راستی پسند ہونا اِس سے فائدہ اٹھانے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔

۲۳ – یہ مضمون اِس سے پہلے سورۂ مُدَّثِّر، آیت ۵۶ اور سورۂ دہر، آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، المُدَّثِّر، حاشیہ ۴۱۔

تفہیم القرآن

اَلِانفِطار

(۸۲)

الانفطار

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْفَطَرَتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنْفِطار مصدر ہے، جس کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا اور سورۂ تکویر کا مضمون ایک دوسرے سے نہایت مشابہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت ہے۔ مُسْنَدِ احمد، ترْمِذی، ابن اَلْمُنذِر، طَبَرانی، حاکم اور ابن مَرْدُوْیَہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا: مَنْ سَرَّہٗ اَن ینظر الی یوم القیٰمۃ کانہ رأی عین فلیقرأ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ، وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ ”جو شخص چاہتا ہو کہ روزِ قیامت کو اس طرح دیکھ لے جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سورۂ تکویر اور سورۂ اِنْفِطار اور سورۂ اِنْشِقاق کو پڑھ لے۔“

اِس میں سب سے پہلے روزِ قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آجائے گا تو ہر شخص کے سامنے اس کا کیا دھرا سب آجائے گا۔ اس کے بعد انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس رب نے تجھ کو وجود بخشا اور جس کے فضل و کرم کی وجہ سے آج تُو سب مخلوقات سے بہتر جسم اور اعضا لیے پھرتا ہے، اس کے بارے میں یہ دھوکا تجھے کہاں سے لگ گیا کہ وہ صرف کرم ہی کرنے والا ہے، انصاف کرنے والا نہیں ہے؟ اُس کے کرم کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ تُو اس کے انصاف سے بے خوف ہو جائے۔ پھر انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تُو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ، تیرا پورا نامۂ اعمال تیار کیا جا رہا ہے، اور نہایت معتبر کاتب ہر وقت تیری تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ آخر میں پورے زور کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یقیناً روزِ جزا برپا ہونے والا ہے، جس میں نیک لوگوں کو جنت کا عیش اور بد لوگوں کو جہنم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا، فیصلے کے اختیارات بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

---

۱۹ آیاتہا — سُوۡرَةُ الۡاِنۡفِطَارِ مَكِّيَّةٌ — ۱ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡكَوَاكِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے بکھر جائیں گے، اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے[۱]، اور جب قبریں کھول دی جائیں گی[۲]، اُس وقت ہر شخص کو اُس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا[۳]۔

---

۱ — سورۂ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رُو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقے تک محدود نہ ہو گا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اُٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اُس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اُس اندرونی حصّے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے اُن دو ابتدائی اجزا کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن، جلانے والی، اور دوسری، یعنی ہائیڈروجن، بھڑک اُٹھنے والی ہے، اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردِّ عمل (chain reaction) شروع ہو جائے گا، جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے، باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

۲ — پہلی تین آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے اور اِس آیت میں دوسرا مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ قبروں کے کھولے جانے سے مراد لوگوں کا ازسرِنَو زندہ کر کے اٹھایا جانا ہے۔

۳ — اصل الفاظ ہیں: مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں:

(۱) جو اچھا یا برا عمل آدمی نے کر کے آگے بھیج دیا وہ مَّا قَدَّمَتۡ ہے، اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مَا اَخَّرَتۡ۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ commission اور omission کے ہم معنیٰ ہیں۔

(۲) جو کچھ پہلے کیا وہ مَّا قَدَّمَتۡ ہے، اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مَا اَخَّرَتۡ یعنی آدمی کا پورا نامۂ اعمال ترتیب وار

يَآيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝٦ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝٧ فِيٓ أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝٨ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ۝٩ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِينَ ۝١٠ كِرَامًا

اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اُس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے دُرست کیا، تجھے مُتناسِب بنایا، اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟[۴] ہرگز نہیں،[۵] بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزا و سزا کو جُھٹلاتے ہو[۶] حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں، ایسے معزز

اور تاریخ وار اس کے سامنے آجائے گا۔

(۳) جو اچھے اور بُرے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے، وہ مَا قَدَّمَتْ ہیں، اور ان اعمال کے جو آثار و نتائج وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا، وہ مَا اَخَّرَتْ۔

۴- یعنی اوّل تو اُس محسن پروردگار کے احسان و کرم کا تقاضا یہ تھا کہ تو شکر گزار اور احسان مند ہو کر اس کا فرماں بردار بنتا اور اُس کی نافرمانی کرتے ہوئے تجھے شرم آتی، مگر تو اِس دھوکے میں پڑ گیا کہ تو جو کچھ بھی بنا ہے خود ہی بن گیا ہے، اور یہ خیال تجھے کبھی نہ آیا کہ اِس وجود کے بخشنے والے کا احسان مانے۔ دوسرے، تیرے رب کا یہ کرم ہے کہ دنیا میں جو کچھ تو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ جونہی تجھ سے کوئی خطا سرزد ہو وہ تجھ پر فالج گرا دے، یا تیری آنکھیں اندھی کر دے، یا تجھ پر بجلی گرا دے۔ لیکن تو نے اِس کریمی کو کمزوری سمجھ لیا اور اس دھوکے میں پڑ گیا کہ تیرے خدا کی خدائی میں اِنصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

۵- یعنی کوئی معقول وجہ اس دھوکے میں پڑنے کی نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جُڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اِس مکمل انسانی شکل میں ترکیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ اِس کو دیکھ کر تیرا سر بارِ احسان سے جھک جاتا اور اُس ربِّ کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جراءت نہ کرتا۔ تو یہ بھی جانتا ہے کہ تیرا رب صرف رحیم و کریم ہی نہیں ہے، جبّار و قہّار بھی ہے۔ جب اس کی طرف سے کوئی زلزلہ یا طوفان یا سیلاب آجاتا ہے تو تیری ساری تدبیریں اس کے مقابلے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا رب جاہل و نادان نہیں بلکہ حکیم و دانا ہے، اور حکمت و دانائی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسے عقل دی جائے اُسے اُس کے اعمال کا ذمہ دار بھی ٹھیرایا جائے، جسے اختیارات دیے جائیں اس سے حساب

كٰتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١٢﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿١٣﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿١٤﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿١٥﴾ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿١٦﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

کاتب جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔[۵]

یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنّم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اُس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں، تمھیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا،[۸] فیصلہ اُس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

بھی لیا جائے کہ اس نے اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کیا، اور جسے اپنی ذمّہ داری پر نیکی اور بدی کرنے کی طاقت دی جائے اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا بھی دی جائے۔ یہ سب حقیقتیں تیرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، اس لیے تُو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے ربِّ کریم کی طرف سے جس دھوکے میں تُو پڑ گیا ہے، اس کی کوئی معقول وجہ موجود ہے۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اُس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیری شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اِس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اُس کے مقابلے میں جَری ہو جائے اور اِس غلط فہمی میں پڑ جائے کہ میں جو کچھ چاہوں کروں، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

۶ – یعنی دراصل جس چیز نے تم لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے وہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے، بلکہ محض تمھارا یہ احمقانہ خیال ہے کہ دنیا کے اِس دار العمل کے پیچھے کوئی دار الجزا نہیں ہے۔ اِسی غلط اور بے بنیاد گمان نے تمھیں خدا سے غافل، اُس کے انصاف سے بے خوف، اور اپنے اخلاقی رویّے میں غیر ذمّہ دار بنا دیا ہے۔

۷ – یعنی تم لوگ چاہے دار الجزا کا انکار کرو، یا اُس کو جھٹلاؤ، یا اُس کا مذاق اُڑاؤ، اِس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے رب نے تمھیں دنیا میں شُترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس نے تم میں سے

ایک ایک آدمی پر نہایت راست باز نگران مقرر کر رکھے ہیں، جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمھارے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں، اور ان سے تمھارا کوئی کام چھپا ہوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، خلوتوں میں، سنسان جنگلوں میں، یا اور کسی ایسی حالت میں اُس کا ارتکاب کرو جہاں تمھیں پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہِ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ اِن نگراں فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کِراماً کاتِبِیْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں۔ کسی سے نہ ذاتی محبت رکھتے ہیں نہ عداوت، کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلافِ واقعہ ریکارڈ تیار کریں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئے بغیر بطورِ خود غلط سلط اندراجات کرلیں۔ رشوت خوار بھی نہیں ہیں کہ کچھ لے دے کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ ان کا مقام اِن ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہوگی، اور کسی کے ذمّے کوئی ایسی بدی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔ پھر ان فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو اُسے وہ جانتے ہیں"، یعنی ان کا حال دنیا کی سی آئی ڈی اور اِطّلاعات (intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ ساری تگ و دَو کے باوجود بہت سی باتیں ان سے چھپی رہ جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہیں، ہر جگہ، ہر حال میں، ہر شخص کے ساتھ اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اُسے یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کی نگرانی کر رہا ہے، اور انھیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیت سے کوئی کام کیا ہے۔ اس لیے اُن کا مُرتّب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے، جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔ اِسی کے متعلق سورۂ کہف، آیت ۴۹ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے، اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی ہے، جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سب جُوں کا تُوں اُن کے سامنے حاضر ہے۔

۸ – یعنی کسی کی وہاں یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ کسی شخص کو اس کے اعمال کے نتائج بھگتنے سے بچا سکے۔ کوئی وہاں ایسا بااثر یا زور آور یا اللہ کا چہیتا نہ ہوگا کہ عدالتِ خداوندی میں اَڑ کر بیٹھ جائے اور یہ کہہ سکے کہ فُلاں شخص میرا عزیز یا مُتوسّل ہے، اِسے تو بخشنا ہی ہوگا، خواہ یہ دنیا میں کیسے ہی بُرے افعال کر کے آیا ہو۔

تفہیم القرآن

المطفّفین

(۸۳)

المطففين

نام پہلی ہی آیت وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے اندازِ بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے جب اہلِ مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے در پے سورتیں نازل ہو رہی تھیں، اور اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب اہلِ مکہ نے سڑکوں پر، بازاروں میں اور مجلسوں میں مسلمانوں پر آوازے کسنے اور ان کی توہین و تذلیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، مگر ظلم و ستم اور مار پیٹ کا دَور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ اِس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابنِ عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض بُری طرح پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے۔ (نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ مَردُویَہ، ابنِ جَرِیر، بَیْہَقی فی شُعَبِ الایمان) لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم سورۂ دَہر کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، صحابہؓ اور تابعینؒ کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملے پر چسپاں ہوتی ہو، اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فُلاں معاملے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ابنِ عباسؓ کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بُری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ نے یہ سورت ان کو سنائی اور اِس سے اُن کے معاملات دُرست ہو گئے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع بھی آخرت ہے۔ پہلی چھ آیتوں میں اُس عام بے ایمانی پر گرفت کی گئی ہے جو کاروباری لوگوں میں بکثرت پھیلی ہوئی تھی کہ دوسروں سے لینا ہوتا تھا تو پورا ناپ کر اور تول کر لیتے تھے، مگر جب دوسروں کو دینا ہوتا تو ناپ تول میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ گھاٹا دیتے تھے۔ معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے اِس ایک خرابی کو، جس کی قباحت سے کوئی انکار نہ کر سکتا تھا، بطورِ مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک روز خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے، اُس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راست بازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانت داری کو "اچھی پالیسی" سمجھ کر بعض چھوٹے چھوٹے معاملات میں

دیانت برت بھی لے تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک ''مفید پالیسی'' ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانت داری اگر پیدا ہوسکتی ہے تو صرف خدا کے خوف اور آخرت پر یقین ہی سے ہوسکتی ہے، کیونکہ اِس صورت میں دیانت ایک ''پالیسی'' نہیں بلکہ ''فریضہ'' قرار پاتی ہے اور آدمی کے اُس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔

اِس طرح اَخلاق کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا تعلق نہایت مؤثّر اور دل نشین طریقے سے واضح کرنے کے بعد آیت ۷ سے ۱۷ تک بتایا گیا ہے کہ بدکار لوگوں کے نامۂ اعمال پہلے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے رجسٹر (black list) میں درج ہو رہے ہیں اور آخرت میں ان کو سخت تباہی سے دوچار ہونا ہے۔ پھر آیت ۱۸ سے ۲۸ تک نیک لوگوں کا بہترین انجام بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اعمال نامے بلند پایہ لوگوں کے رجسٹر میں درج ہو رہے ہیں جس پر مقرّب فرشتے مامور ہیں۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تسلّی دی گئی ہے اور اِس کے ساتھ کفار کو خبردار بھی کیا گیا ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تذلیل کر رہے ہیں، قیامت کے روز یہی مجرم لوگ اپنی اِس رَوِش کا بہت بُرا انجام دیکھیں گے اور یہی ایمان لانے والے اِن مجرموں کا بُرا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔
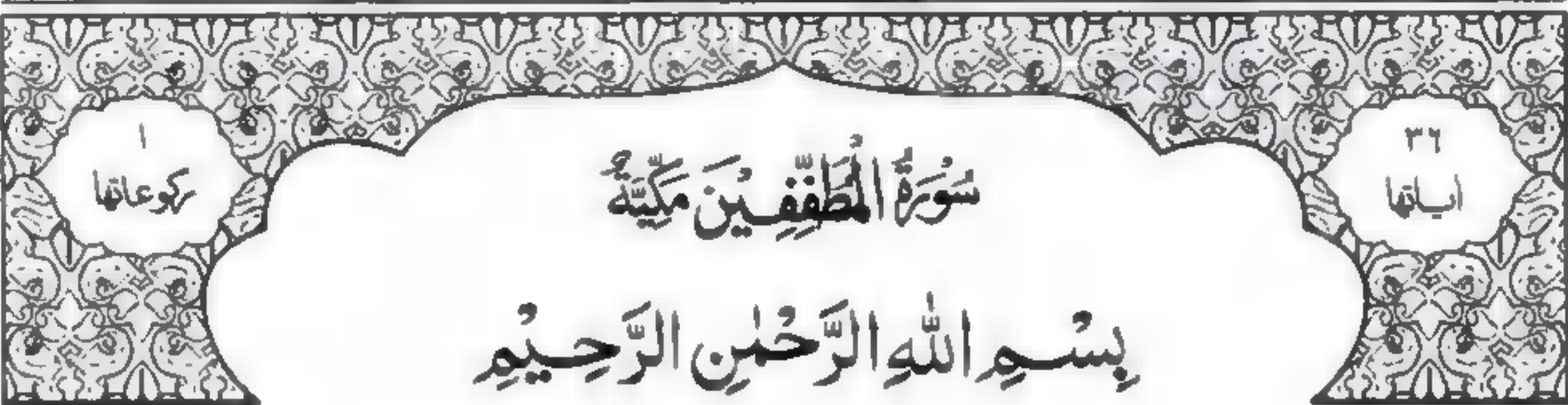
---

۳۶ آیاتھا — سُوْرَۃُ الْمُطَفِّفِیْنَ مَکِّیَّۃٌ — ۱ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝۵ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۶ كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ ۝۷ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں[1] کے لیے۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے[2] ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن[3] یہ اُٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب کہ سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

ہرگز نہیں[4]، یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے[5]۔ اور تمھیں کیا معلوم

۱- اصل میں لفظ مُطَفِّفِیْنَ استعمال کیا گیا ہے جو تَطْفِیْف سے مشتق ہے۔ عَرَبی زبان میں طَفِیْف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا، بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ تاجر اُسے کیا اور کتنا گھاٹا دے گیا ہے۔

۲- قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمّت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ سورۂ اَنعام میں فرمایا: ”انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو، ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ کا مُکلّف نہیں ٹھیراتے۔“ (آیت ۱۵۲) سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ”جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو۔“ (آیت ۳۵) سورۂ رحمٰن میں تاکید کی گئی کہ ”تولنے میں زیادتی نہ کرو، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن کرو

مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ سکتۃ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ

کہ وہ قید خانے کا دفتر کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اُسے جب ہماری آیات سُنائی جاتی ہیں۶ تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ دراصل اِن لوگوں کے دلوں پر اِن کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۷۔ ہرگز نہیں، بالیقین اُس روز یہ اپنے رب کی دِید سے محروم رکھے جائیں گے۸، پھر یہ جہنّم میں جا پڑیں گے، پھر ان سے

اور ترازو میں گھاٹا نہ دو۔'' (آیات ۸-۹) قومِ شعیب پر جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا، وہ یہی تھا کہ اُس کے اندر ناپ تول میں کمی کرنے کا مرض عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور حضرت شعیبؑ کی پے در پے نصیحتوں کے باوجود یہ قوم اِس جرم سے باز نہ آتی تھی۔

۳- روزِ قیامت کو بڑا دن اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس میں تمام انسانوں اور جنّوں کا حساب خدا کی عدالت میں بیک وقت لیا جائے گا اور عذاب و ثواب کے اہم ترین فیصلے کیے جائیں گے۔

۴- یعنی اِن لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ دنیا میں اِن جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہ یونہی چھوٹ جائیں گے اور کبھی اِن کو اپنے خدا کے سامنے جواب دِہی کے لیے حاضر نہ ہونا پڑے گا۔

۵- اصل میں لفظ سِجِّیْن استعمال ہوا ہے جو سِجْن (جیل یا قید خانے) سے ماخوذ ہے، اور آگے اُس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں سزا کے مستحق لوگوں کے اعمال نامے درج کیے جا رہے ہیں۔

۶- یعنی وہ آیات جن میں روزِ جزا کی خبر دی گئی ہے۔

۷- یعنی جزا و سزا کو افسانہ قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن جس وجہ سے یہ لوگ اسے افسانہ کہتے ہیں

يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

ہرگز نہیں[9]، بے شک نیک آدمیوں کا نامۂ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔ اور تمھیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے، اُونچی مَسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر تم خوش حالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سر بند شراب پلائی جائے گی، جس پر مُشک کی مہر لگی ہوگی[10]۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے

وہ یہ ہے کہ جن گناہوں کا یہ ارتکاب کرتے رہے ہیں، ان کا زنگ اِن کے دلوں پر پوری طرح چڑھ گیا ہے، اس لیے جو بات سراسر معقول ہے وہ اِن کو افسانہ نظر آتی ہے۔ اِس زنگ کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو پورے دل پر وہ چھا جاتا ہے (مُسندِ احمد، ترمِذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جَریر، حاکم، ابنِ ابی حاتم، ابن حبان وغیرہ)

۸- یعنی دیدارِ الٰہی کا جو شرف نیک لوگوں کو نصیب ہوگا اس سے یہ لوگ محروم رہیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۷)

۹- یعنی اِن لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی جزا و سزا واقع ہونے والی نہیں ہے۔

۱۰- اصل الفاظ ہیں: خِتٰمُهٗ مِسْكٌ۔ اِس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جن برتنوں میں وہ شراب رکھی ہوگی، اُن پر مٹّی یا موم کے بجائے مُشک کی مُہر ہوگی۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ شراب کی ایک نفیس ترین

الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ ﴿۲۷﴾ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۙ یَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع

ہوں، وہ اِس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اُس شراب میں تسنیم[11] کی آمیزش ہوگی، یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مُقرّب لوگ شراب پییں گے۔

مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اُڑاتے تھے، جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر اُن کی طرف اشارے کرتے تھے، اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے،[12] اور جب انھیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں،[13] حالانکہ وہ اُن پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔[14] آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں، مَسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں، مل گیا نا کافروں کو اُن حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے۔[15] ع

قسم ہوگی جو نہروں میں بہنے والی شراب سے اشرف و اعلیٰ ہوگی اور اسے جنت کے خُدّام مُشک کی مُہر لگے ہوئے برتنوں میں لا کر اہلِ جنت کو پلائیں گے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شراب جب پینے والوں کے حلق سے اُترے گی تو آخر میں اُن کو مُشک کی خوشبو محسوس ہوگی۔ یہ کیفیت دنیا کی شرابوں کے بالکل برعکس ہے جن کی بوتل کھلتے ہی بُو کا ایک بھپکا ناک میں آتا ہے، پیتے ہوئے بھی ان کی بدبو محسوس ہوتی ہے، اور حلق سے جب وہ اُترتی ہے تو دماغ تک اس کی سڑانڈ پہنچ جاتی ہے، جس کی وجہ سے بدمزگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۱- تسنیم کے معنٰی بلندی کے ہیں، اور کسی چشمے کو تسنیم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلندی سے بہتا ہوا نیچے آ رہا ہو۔

۱۲- یعنی یہ سوچتے ہوئے پلٹتے تھے کہ آج تو مزا آ گیا، میں نے فلاں مسلمان کا مذاق اُڑا کر اور اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر خوب لُطف اٹھایا اور لوگوں میں بھی اس کی اچھی گت بنی۔

۱۳- یعنی اِن کی عقل ماری گئی ہے، اپنے آپ کو دنیا کے فائدوں اور لذّتوں سے صرف اس لیے محروم کر لیا ہے اور ہر طرح کے خطرات اور مصائب صرف اس لیے مول لے لیے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں آخرت اور جنت اور دوزخ کے چکر میں ڈال دیا ہے۔ جو کچھ حاضر ہے اُسے اِس موہوم اُمید پر چھوڑ رہے ہیں کہ موت کے بعد کسی جنّت کے ملنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اور جو تکلیفیں آج پہنچ رہی ہیں اِنھیں اِس خیالِ خام کی بنا پر انگیز کر رہے ہیں کہ دوسری دنیا میں کوئی جہنّم ہوگی جس کے عذاب سے اِنھیں ڈرایا گیا ہے۔

۱۴- اس مختصر سے فقرے میں اُن مذاق اڑانے والوں کو بڑی سبق آموز تنبیہ کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض وہ سب کچھ غلط ہے جس پر مسلمان ایمان لائے ہیں لیکن وہ تمھارا تو کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے حق سمجھا ہے اُس کے مطابق وہ اپنی جگہ خود ہی ایک خاص اخلاقی رَویّہ اختیار کر رہے ہیں۔ اب کیا خدا نے تمھیں کوئی فوج دار بنا کر بھیجا ہے کہ جو تمھیں نہیں چھیڑ رہا ہے اس کو تم چھیڑو، اور جو تمھیں کوئی تکلیف نہیں دے رہا ہے اسے تم خواہ مخواہ تکلیف دو؟

۱۵- اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے۔ چونکہ وہ کفار کارِ ثواب سمجھ کر مومنوں کو تنگ کرتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ آخرت میں مومن جنّت میں مزے سے بیٹھے ہوئے جہنم میں جلنے والے اِن کافروں کا حال دیکھیں گے اور اپنے دلوں میں کہیں گے کہ خوب ثواب اِنھیں اِن کے اعمال کا مل گیا۔

تفہیم القرآن

الانشقاق

(۸۴)

الاِنشِقاق

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْشَقَّتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنْشِقاق مصدر ہے جس کے معنٰی پھٹ جانے کے ہیں، اور اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزُول

یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اس کے مضمون کی داخلی شہادت یہ بتا رہی ہے کہ ابھی ظلم وستم کا دَور شروع نہیں ہوا تھا، البتہ قرآن کی دعوت کو مکہ میں برملا جُھٹلایا جارہا تھا اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور اُنھیں اپنے خدا کے سامنے جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا پڑے گا۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔

پہلی پانچ آیتوں میں نہ صرف قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے برحق ہونے کی دلیل بھی دے دی گئی ہے۔ اُس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس روز آسمان پھٹ جائے گا، زمین پھیلا کر ہموار میدان بنادی جائے گی، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے (یعنی مردہ انسانوں کے اجزائے بدن اور اُن کے اعمال کی شہادتیں) سب کو نکال کر وہ باہر پھینک دے گی، حتّٰی کہ اس کے اندر کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ آسمان و زمین کے لیے اُن کے رب کا حکم یہی ہوگا، اور چونکہ دونوں اُس کی مخلوق ہیں اس لیے وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے، اُن کے لیے حق یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کریں۔

اس کے بعد آیت ۶ سے ۱۹ تک بتایا گیا ہے کہ انسان کو خواہ اِس کا شُعور ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ اُس منزل کی طرف چار و ناچار چلا جارہا ہے جہاں اُسے اپنے رب کے آگے پیش ہونا ہے۔ پھر سب انسان دو حصوں میں بٹ جائیں گے: ایک، وہ جن کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ کسی سخت حساب فہمی کے بغیر معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے، وہ جن کا نامۂ اعمال پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ کسی طرح انھیں موت آجائے، مگر مرنے کے بجائے وہ جہنّم میں جھونک دیے جائیں گے۔ ان کا یہ انجام اس لیے ہوگا کہ وہ دنیا میں اِس غلط فہمی پر مگن رہے کہ کبھی خدا کے سامنے جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔ حالانکہ ان کا رب ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ

وہ ان اعمال کی باز پُرس سے چھوٹ جائیں۔ اُن کا دنیا کی زندگی سے آخرت کی جزا و سزا تک درجہ بدرجہ پہنچنا اُتنا ہی یقینی ہے جتنا سُورج ڈوبنے کے بعد شفق کا نمودار ہونا، دن کے بعد رات کا آنا اور اس میں انسان اور حیوانات کا اپنے اپنے بسیروں کی طرف پلٹنا، اور چاند کا ہِلال سے بڑھ کر ماہِ کامل بننا یقینی ہے۔

آخر میں اُن کفّار کو دردناک سزا کی خبر دے دی گئی ہے جو قرآن کو سُن کر خدا کے آگے جھکنے کے بجائے اُلٹی تکذیب کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کو بے حساب اجر کا مُژدہ سنا دیا گیا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں۔

---

۲۵ آیاتہا — سُوۡرَۃُ الۡاِنۡشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ — رکوعاتہا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡہَا وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے[1] گا، اور اُس کے لیے حق یہی ہے کہ (اپنے رب کا حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے[2] گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے[3] گی، اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اُس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے[4])۔ اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے[5]

۱- اصل میں اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کے لفظی معنی ہیں: "وہ اپنے رب کا حکم سُنے گا"۔ لیکن عَرَبی زبان میں محاورے کے طور پر اَذِنَ لَہٗ کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ اس نے حکم سُنا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے حکم سُن کر ایک تابعِ فرمان کی طرح اس کی تعمیل کی اور ذرا سرتابی نہ کی۔

۲- زمین کے پھیلا دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیے جائیں گے، اور زمین کی ساری اُونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورۂ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ "اُسے ایک چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تم کوئی بَل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔" (آیات ۱۰۶-۱۰۷) حاکم نے مُستدرک میں عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "قیامت کے روز زمین ایک دسترخوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی، پھر انسانوں کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔" اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس دن تمام انسانوں کو جو اوّل روزِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے عدالتِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے پورے کُرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے، تاکہ اس پر ساری نوعِ انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔

فَمُلٰقِيْهِ ﴿٦﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿٧﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿٨﴾ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿٩﴾ وَ اَمَّا مَنْ

اور اُس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا، اُس سے ہلکا حساب لیا جائے گا[۶] اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔[۷] رہا وہ شخص جس کا

۳- مطلب یہ ہے کہ جتنے مرے ہوئے انسان اس کے اندر پڑے ہوں گے سب کو نکال کر وہ باہر ڈال دے گی، اور اسی طرح اُن کے اعمال کی جو شہادتیں اُس کے اندر موجود ہوں گی وہ سب بھی پوری کی پوری باہر آ جائیں گی، کوئی چیز بھی اُس میں چھپی اور دبی ہوئی نہ رہ جائے گی۔

۴- یہ صراحت نہیں کی گئی کہ جب یہ اور یہ واقعات ہوں گے تو کیا ہوگا، کیونکہ بعد کا یہ مضمون اُس کو آپ سے آپ ظاہر کر دیتا ہے کہ اے انسان! تو اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہونے والا ہے، تیرا نامۂ اعمال تجھے دیا جانے والا ہے، اور جیسا تیرا نامۂ اعمال ہوگا اس کے مطابق تجھے جزا یا سزا ملنے والی ہے۔

۵- یعنی وہ ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ جو تو دنیا میں کر رہا ہے، اُس کے متعلق چاہے تو یہی سمجھتا رہے کہ یہ صرف دنیا کی زندگی تک ہے اور دنیوی اغراض کے لیے ہے، لیکن در حقیقت تو شعوری یا غیر شعوری طور پر جا رہا ہے اپنے رب ہی کی طرف، اور آخرِ کار وہیں تجھے پہنچ کر رہنا ہے۔

۶- یعنی اس سے سخت حساب فہمی نہ کی جائے گی۔ اُس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں فلاں کام تو نے کیوں کیے تھے اور تیرے پاس اُن کاموں کے لیے کیا عذر ہے۔ اُس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی بُرائیاں بھی اُس کے نامۂ اعمال میں موجود ضرور ہوں گی، مگر بس یہ دیکھ کر کہ بھلائیوں کا پلڑا برائیوں سے بھاری ہے، اس کے قصوروں سے درگزر کیا جائے گا اور اسے معاف کر دیا جائے گا۔ قرآنِ مجید میں بداعمال لوگوں سے سخت حساب فہمی کے لیے سُوْٓءَ الْحِسَابِ (بُری طرح حساب لینے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ (الرعد، آیت ۱۸) اور نیک لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہتر اعمال قبول کر لیں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔" (الْاَحقاف، آیت ۱۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی جو تشریح فرمائی ہے اُسے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، نَسائی، ابوداؤد، حاکم، ابنِ جَرِیر، عَبد بن حُمَید اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے مختلف الفاظ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "جس سے بھی حساب لیا گیا وہ مارا گیا۔" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ "جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا؟" حضورؐ نے جواب دیا: "وہ تو صرف اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس سے پوچھ گچھ کی گئی وہ مارا گیا۔" ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضورؐ کو نماز میں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ "خدایا! مجھ سے ہلکا حساب لے۔"

اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۴﴾ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ﴿۱۵﴾

معانقة ۱۷

نامۂ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا،[8] تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔[9] اُس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا، اُس کا رب اُس کے کرتوت دیکھ رہا تھا۔[10]

آپؐ نے جب سلام پھیرا تو میں نے اس کا مطلب پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: "ہلکے حساب سے مراد یہ ہے کہ بندے کے نامۂ اعمال کو دیکھا جائے گا اور اُس سے درگزر کیا جائے گا۔ اے عائشہؓ! اس روز جس سے حساب فہمی کی گئی وہ مارا گیا۔"

۷ – اپنے لوگوں سے مراد آدمی کے وہ اہل و عیال، رشتہ دار اور ساتھی ہیں جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے۔

۸ – سورۂ اَلْحَاقّہ میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور یہاں ارشاد ہوا ہے اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ غالباً اِس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ شخص اس بات سے تو پہلے ہی مایوس ہوگا کہ اُسے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا، کیونکہ اپنے کرتوتوں سے وہ خوب واقف ہوگا اور اسے یقین ہوگا کہ مجھے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملنے والا ہے۔ البتہ ساری خلقت کے سامنے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال لیتے ہوئے اُسے خِفّت محسوس ہوگی، اس لیے وہ اپنا ہاتھ پیچھے کرلے گا۔ مگر اِس تدبیر سے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنا کچّا چٹھا اپنے ہاتھ میں لینے سے بچ جائے۔ وہ تو بہرحال اسے پکڑایا ہی جائے گا، خواہ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر لے یا پیٹھ کے پیچھے چُھپالے۔

۹ – یعنی اُس کا حال خدا کے صالح بندوں سے مختلف تھا جن کے متعلق سورۂ طور (آیت ۲۶) میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے، یعنی ہر وقت اُنھیں یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں بال بچوں کی محبّت میں گرفتار ہو کر ہم اُن کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کرلیں۔ اِس کے برعکس اُس شخص کا حال یہ تھا کہ اپنے گھر میں وہ چَین کی بنسری بجا رہا تھا اور خوب بال بچوں کو عیش کرا رہا تھا، خواہ وہ کتنی ہی حرام خوریاں کرکے اور کتنے ہی لوگوں کے حق مار کر یہ سامانِ عیش فراہم کرے، اور اِس لطف و لذت کے لیے خدا کی باندھی ہوئی حدوں کو کتنا ہی پامال کرتا رہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

السجدۃ ۱۳

ع ۱ ۲۵

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب کہ وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔[11] پھر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن اِن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے؟[12] بلکہ یہ منکرین تو اُلٹا جھٹلاتے ہیں، حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامۂ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔[13] لہٰذا اِن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ع

۱۰- یعنی یہ خدا کے انصاف اور اس کی حکمت کے خلاف تھا کہ جو کرتوت وہ کر رہا تھا ان کو وہ نظر انداز کر دیتا اور اسے اپنے سامنے بلا کر کوئی باز پُرس اس سے نہ کرتا۔

۱۱- یعنی تمھیں ایک حالت پر نہیں رہنا ہے، بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدانِ حشر، پھر حساب و کتاب اور پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے: سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سُرخی، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اُس میں اُن بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہتے ہیں، اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدرِ کامل بننا۔ یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر کہیں ٹھیراؤ نہیں ہے، ایک مسلسل تغیُّر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے، لہٰذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ

معاملہ ختم ہو جائے گا۔

۱۲ - یعنی ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا اور یہ اُس کے آگے نہیں جھکتے۔ اِس مقام پر سجدہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ امام مالک، مسلم اور نَسائی نے حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے نماز میں یہ سورت پڑھ کر اِس مقام پر سجدہ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سجدہ کیا ہے۔ بخاری، مُسلم، ابوداؤد اور نَسائی نے ابورافع کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے عشا کی نماز میں یہ سورت پڑھی اور سجدہ کیا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور حضورؐ نے اس مقام پر سجدہ کیا ہے، اس لیے میں مرتے دم تک یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی اور ابنِ ماجہ وغیرہم نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اِس سورت میں اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں سجدہ کیا ہے۔

۱۳ - دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے سینوں میں کفر اور عناد اور عداوت حق اور بُرے ارادوں اور فاسد نیتوں کی جو گندگی انھوں نے بھر رکھی ہے، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تفہیم القرآن

البروج

(۸۵)

البُرُوج

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْبُرُوْجِ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس کا مضمون خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سورت مکۂ معظمہ کے اُس دَور میں نازل ہوئی ہے جب ظلم وستم پوری شدّت کے ساتھ برپا تھا اور کفارِ مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع کفار کو اُس ظلم وستم کے بُرے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے، اور اہلِ ایمان کو یہ تسلّی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اَصحابُ الاُخدود کا قصّہ سنایا گیا ہے جنھوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک پھینک کر جلا دیا تھا، اور اِس قصّے کے پیرایے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اَصحابُ الاُخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے، اسی طرح سردارانِ مکہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان لانے والوں نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کر لیا تھا اور ایمان سے پھرنا قبول نہیں کیا تھا، اُسی طرح اب بھی اہلِ ایمان کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہلِ ایمان اصرار کرتے ہیں، وہ سب پر غالب ہے، زمین وآسمان کی سلطنت کا مالک ہے، اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے، اور وہ دونوں گروہوں کے حال کو دیکھ رہا ہے، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف اُن کے کفر کی سزا جہنّم کی صورت میں ملے، بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے جَلنے کی شکل میں بھگتنی پڑے۔ اِسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے جنّت میں جائیں، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ پھر کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے، اگر تم اپنے جتھے کی طاقت کے زُعم میں مبتلا ہو تو تم سے بڑے جتھے فرعون اور ثمود کے پاس تھے، ان کے لشکروں کا جو انجام ہوا ہے، اس سے سبق حاصل کرو۔ خدا کی قدرت تم پر اِس طرح محیط ہے کہ اُس کے گھیرے سے تم نکل نہیں سکتے، اور قرآن، جس کی تکذیب پر تم تُلے ہوئے ہو، اُس کی ہر بات اَٹل ہے، وہ اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کا لکھا کسی کے بدلے نہیں بدل سکتا۔

۲۲ آیاتھا — سُورَۃُ الۡبُرُوۡجِ مَکِّیَّۃٌ — ۱ رکوعاتھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾ وَ الۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَ شَاهِدٍ وَّ مَشۡهُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾ اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ هُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾ وَ مَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ

قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی[1]، اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے[2]، اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی[3]، کہ مارے گئے گڑھے والے، (اُس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اُس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اُسے دیکھ رہے[4] تھے۔ اور اُن اہلِ ایمان سے اُن کی دشمنی اِس کے سوا کسی وجہ سے

۱- اصل الفاظ ہیں: ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ، یعنی بُرجوں والے آسمان کی۔ مفسرین میں سے بعض نے اس سے مراد قدیم علمِ ہیئت کے مطابق آسمان کے ۱۲ بُرج لیے ہیں۔ اور ابنِ عباسؓ، مجاہد، قتادہ، حَسَن بصری، ضحّاک اور سُدّی کے نزدیک اس سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور سیارے ہیں۔

۲- یعنی روزِ قیامت۔

۳- دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، مگر ہمارے نزدیک سلسلۂ کلام سے جو بات مناسبت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا، اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کو سب دیکھنے والے دیکھیں گے۔ یہ مجاہد، عِکرِمہ، ضحّاک، ابنِ نَجیح اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے۔

۴- گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو اُن میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر خدا کی لعنت پڑی اور وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہوگئے۔ اور اِس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے: ایک، بُرجوں والے آسمان کی۔ دوسرے، روزِ قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے، قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو اُن مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو قادرِ مُطلَق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور

سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے، اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔ دوسری چیز کی قسم اِس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں ان لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا، مگر وہ دن بہرحال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اس میں ہر مظلوم کی دادرسی اور ہر ظالم کی پکڑ ہو گی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے اُن بے بس اہلِ ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا، اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ اِن کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اِس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صُہَیبؓ رُومی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بُڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متأثر ہو کر ایمان لے آیا، حتّٰی کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے، تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہوا۔ آخرِکار لڑکے نے کہا کہ اگر تُو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمعِ عام میں بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار، میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اِس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مُصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اِس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصّے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا، اس کو آگ میں پھِکوا دیا۔ (احمد، مسلم، نَسائی، ترمذِی، ابنِ جَریر، عبدالرّزاق، ابنِ ابی شَیبَہ، طَبَرانی، عبد بن حُمَید)

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات اُستوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اُس شخص کو پھِکواتا چلا گیا جس نے اِسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اُسی وقت سے مجوسیوں میں مُحَرَّمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابن جریر)

تیسرا واقعہ ابنِ عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابِل والوں نے بنی اسرائیل کو دینِ موسیٰؑ

سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اُن لوگوں کو پھینک دیا جو اِس سے انکار کرتے تھے۔ (ابنِ جَرِیر، عَبْد بن حُمَید)

سب سے مشہور واقعہ نَجْران کا ہے جسے ابنِ ہِشام، طَبَری، ابنِ خَلْدُون اور صاحبِ مُعْجَمُ البُلْدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حِمْیَر (یمن) کا بادشاہ تُبّان اسعد ابوکَرِب ایک مرتبہ یَثْرِب گیا جہاں یہودیوں سے متأثّر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا اور بنی قُرَیْظَہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیانے پر یہودیّت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذُو نُواس اس کا جانشین ہوا اور اُس نے نَجْران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا، تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابنِ ہِشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نَجْران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نَجْران میں سے ایک شخص دَوس ذُو ثُعْلَبان بھاگ نکلا، اور ایک رِوایَت کی رُو سے اُس نے قیصرِ روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رُو سے حَبَش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اِس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑا فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال آخرِ کار حَبَش کی ۷۰ ہزار فوج اَرْیاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذو نُواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتا چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اُس زمانے میں عیسائی مِشنَری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اُسی کے قریب دَور میں ایک زاہد و مجاہد اور صاحبِ کشف و کرامت عیسائی سیّاح فَیمیون (Faymiyun) نامی نَجْران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی بُرائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سیّد، جو قبائلی شُیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمے دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگراں تھا۔ اور تیسرا اُسْقُف (بِشَپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ تُسَر، چمڑے اور اسلحے کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّۂ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اِسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وُجوہ سے بھی ذو نُواس نے اِس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سیّد حارِثہ کو جسے سُریانی مؤرخین Arethas لکھتے ہیں، قتل کیا، اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبُور کیا، پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ اُسْقُف پال (Paul) کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں

عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری، راہب سب کو پھکوا دیا۔ مجموعی طور پر بیس سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخرِکار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونُواس اور اُس کی حِمیَری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اِس کی تصدیق حِصنِ غُراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجودہ زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ کو ملا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدّد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اِس واقعے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے بعض عین زمانۂ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اِس واقعے کے ہم عصر ہیں: ایک پروکوپیوس۔ دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (Cosmos Indicopleustis) جو نجاشی ایلیسبوعان (Elesboan) کے حکم سے اُس زمانے میں بَطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر اَدُولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یُوحَنّس مَلالا (Johannes Malala) جس سے بعد کے متعدّد مؤرخین نے اِس واقعے کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحَنّس اِفسُوسی (Johannes of Ephesus) مُتَوفّٰی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخِ کَنِیسہ میں نصارائے نَجران کی تعذیب کا قصہ اِس واقعے کے معاصر راوی اُسقُف مار شمعون (Simeon) کے ایک خط سے نقل کیا ہے، جو اُس نے دَیرِ جَبَلَہ کے رئیس (Abbot von Gabula) کے نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے رِوایَت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیّت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بِطرِیق ڈایونیسیوس (Patriarch Dionysius) اور زَکَرِیا مدلّی (Zacharia of Mitylene) نے اپنی سُریانی تاریخوں میں بھی اس واقعے کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سَرُوجی کی کتاب دَربابِ نصارائے نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرُّہا (Edessa) کے اُسقُف پولَس (Pulus) نے نجران کے ہلاک شُدگان کا مرثیہ لکھا، جو اب بھی دستیاب ہے۔ سُریانی زبان کی تصنیف کتاب الحِمیَرِیّین کا انگریزی ترجمہ (Book of the Himyarites) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اُس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اِس قصّے کی تائید کرتے ہیں۔ فِلبی نے اپنے سفرنامے (Arabian Highlands) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اُمّ خَرَق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کُھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں، اور کعبۂ نجران جس جگہ واقع تھا، اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اَساقِفَہ عمامے باندھتے تھے اور اُس کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اِس کعبہ کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اِسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سیّد اور عاقب اور اُسقُف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مُباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر

اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۚ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ

آیۃ مصعتۃ ۱۲

نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے، جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔[۵]

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے، یقیناً اُن کے لیے جہنّم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔[۶] جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً اُن کے لیے جنت کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی۔

درحقیقت تمھارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے، محبّت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے، بزرگ و برتر ہے، اور جو کچھ

سورۂ آلِ عمران، آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۲۹ و حاشیہ ۵۵)

۵- ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنا پر وہی اس کا مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اور وہ لوگ ظالم ہیں جو اِس بات پر بگڑتے ہیں کہ کوئی اس پر ایمان لائے۔

۶- جہنّم کے عذاب سے الگ جلائے جانے کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے مظلوم لوگوں کو آگ کے گڑھے میں پھینک کر زندہ جلایا تھا۔ غالباً یہ جہنّم کی عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہوگی

لِّمَا يُرِيۡدُ ؕ‏ ﴿۱۶﴾ هَلۡ اَتٰٮكَ حَدِيۡثُ الۡجُـنُوۡدِۙ‏ ﴿۱۷﴾ فِرۡعَوۡنَ وَثَمُوۡدَ ؕ‏ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ تَكۡذِيۡبٍۙ‏ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنۡ وَّرَآٮِٕهِمۡ مُّحِيۡطٌ ۚ‏ ﴿۲۰﴾ بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ۙ‏ ﴿۲۱﴾ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾

ع ۱ ۲۲

چاہے کر ڈالنے والا ہے[7]۔ کیا تمھیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی[8]؟ مگر جنھوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ (اُن کے جھٹلانے سے اِس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے، اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے[9]۔ ع

جس میں وہ جلائے جائیں گے۔

۷- "بخشنے والا ہے" کہہ کر یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ کوئی اگر اپنے گناہوں سے باز آ کر توبہ کر لے تو اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتا ہے۔ "محبت کرنے والا" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو اپنی خَلق سے عداوت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کو مبتلائے عذاب کرے، بلکہ جس مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اُس سے وہ محبّت رکھتا ہے، اور سزا صرف اُس وقت دیتا ہے جب وہ سرکشی سے باز ہی نہ آئے۔ "مالکِ عرش" کہہ کر انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا فرماں روا وہی ہے، اُس سے سرکشی کرنے والا اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ "بزرگ و برتر" کہہ کر انسان کو اِس کمینہ پن پر متنبّہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسی ہستی کے مقابلے میں گستاخی کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔ اور آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے"، یعنی پوری کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ جس کام کا ارادہ کرے، اس میں وہ مانع و مزاحم ہو سکے۔

۸- رُوئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے طاقت ور جتھوں کے زُعم میں خدا کی زمین پر سرکشیاں کر رہے ہیں۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ تمھیں خبر بھی ہے کہ اِس سے پہلے جن لوگوں نے اپنے جتھوں کی طاقت کے بل پر یہی سرکشیاں کی تھیں، وہ کس انجام سے دوچار ہو چکے ہیں۔

۹- مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اَٹل ہے، خدا کی اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا، جو بات اس میں لکھ دی گئی ہے، وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے، تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

تفہیم القرآن

الطارق

(۸۶)

الطارق

نام پہلی ہی آیت کے لفظ الطَّارِق کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضمون کا اندازِ بیان مکۂ معظمہ کی ابتدائی سورتوں سے ملتا جلتا ہے، مگر یہ اُس زمانے کی نازل شدہ ہے جب کفارِ مکہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ہر طرح کی چالیں چل رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اِس میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جسے کفار کی کوئی چال اور تدبیر زک نہیں دے سکتی۔

سب سے پہلے آسمان کے تاروں کو اِس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔ پھر انسان کو خود اس کی اپنی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح نُطفے کی ایک بوند سے اُس کو وجود میں لایا گیا اور جیتا جاگتا انسان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو خدا اِس طرح اُسے وجود میں لایا ہے، وہ یقیناً اُس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور یہ دوبارہ پیدائش اِس غرض کے لیے ہوگی کہ انسان کے اُن تمام رازوں کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر دنیا میں پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ اُس وقت اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انسان نہ اپنے بل بُوتے پر بچ سکے گا اور نہ کوئی اُس کی مدد کو آسکے گا۔

خاتمۂ کلام پر ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش کا برسنا اور زمین سے درختوں اور فصلوں کا اُگنا کوئی کھیل نہیں بلکہ ایک سنجیدہ کام ہے، اُسی طرح قرآن میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، وہ بھی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں بلکہ پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ کفار اس غلط فہمی میں ہیں کہ اُن کی چالیں اِس قرآن کی دعوت کو زک دے دیں گی، مگر انھیں خبر نہیں ہے کہ اللہ بھی ایک تدبیر میں لگا ہوا ہے اور اس کی تدبیر کے آگے کفار کی چالیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ پھر ایک فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلّی اور دَر پردہ کفار کو یہ دھمکی دے کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ آپؐ ذرا صبر سے کام لیں اور کچھ مدت کفار کو اپنی سعی کر لینے دیں، زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اِن کی چالیں قرآن کو زک دیتی ہیں یا قرآن اُسی جگہ غالب آکر رہتا ہے جہاں یہ اُسے زک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۷ آیاتہا | رکوعاتہا ۱

سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اُوپر کوئی نگہبان نہ ہو[۱]۔ پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے[۲]۔

۱- نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے، جس کے وجود میں لانے سے ہر شے وجود میں آئی ہے، جس کے باقی رکھنے سے ہر شے باقی ہے، جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے، اور جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات بہم پہنچانے اور اُسے ایک مدّتِ مقرّرہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے ہر تارے اور سیارے کی قسم کھائی گئی ہے (النجم الثاقب کا لفظ اگرچہ لغت کے اعتبار سے واحد ہے، لیکن مراد اُس سے ایک ہی تارا نہیں بلکہ تاروں کی جنس ہے)۔ یہ قسم اِس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حدّ حساب تارے اور سیارے جو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، اِن میں سے ہر ایک کا وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جس نے اُسے بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلّق رکھ چھوڑا ہے، اور اس طرح اس کی حفاظت و نگہبانی کر رہا ہے کہ نہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے، نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دَوران میں وہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔

۲- عالَمِ بالا کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ خود ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کر لے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہونے والے اربوں جرثوموں میں سے ایک جرثومے، اور ماں کے اندر سے نکلنے والے بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کا انتخاب کر کے دونوں کو کسی وقت جوڑ دیتا ہے، اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ اُسے نشوونما دے کر اسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو، کون ہے جو رحمِ مادر ہی میں اس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں

خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿٦﴾ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴿٧﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿٨﴾ يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ﴿٩﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ

ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے[۳]۔ یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے[۴]۔ جس روز پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال[۵] ہوگی، اُس وقت

کا تناسُب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے اِتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا کجا، کہ وہ انھیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟

۳- اصل میں صُلب اور تَرائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور ترائب کے معنٰی ہیں: سینے کی ہڈیاں، یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادّۂ تولید انسان کے اُس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اُس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادّہ اُس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضائے رئیسہ اس کے مآخذ ہیں، اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ صُلب دماغ کا وہ حصّہ ہے جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلّق قائم ہوتا ہے۔ (نیز مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۴، صفحہ ۵۸۳)

۴- یعنی جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اِس بات کا کُھلا ہُوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کرے، اُس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثے کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثے کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ

قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿١٠﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿١٣﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔ قسم ہے بارش برسانے والے آسمان[۶] کی اور (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی، یہ ایک جچی تُلی بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے[۷]۔ یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں[۸] اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں[۹]۔ پس چھوڑ دو اے نبیؐ! اِن کافروں کو اِک ذرا کی ذرا اِن کے حال پر چھوڑ دو[۱۰]ع

پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اِتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسُب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثے کے طور پر ہو سکتا ہو، تو پھر کون سی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟

۵ – پوشیدہ اَسرار سے مراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملات بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دنیا کے سامنے آئے مگر اُن کے پیچھے جو نیتیں اور اغراض اور خواہشات کام کر رہی تھیں، اور ان کے جو باطنی محرّکات تھے، اُن کا حال لوگوں سے چھُپا رہ گیا۔ قیامت کے روز یہ سب کچھ کھُل کر سامنے آ جائے گا، اور جانچ پڑتال صرف اِسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اسی طرح یہ بات بھی ساری دنیا سے، حتّٰی کہ خود ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اس نے کیا، اُس کے کیا اثرات دنیا میں ہوئے، کہاں کہاں پہنچے، اور کتنی مدّت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کھُلے گا اور اِس کی پوری جانچ پڑتال ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا، اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کٹتی رہی اور کون کون اسے کاٹتا رہا۔

۶ – آسمان کے لیے ذَاتِ الرَّجْعِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَجع کے لُغوی معنٰی تو پلٹنے کے ہیں، مگر مجازاً عَرَبی زبان میں یہ لفظ بارش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی، بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلافِ موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش کو رَجع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اُٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر برستا ہے۔

۷– یعنی جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اُگلنا کوئی مذاق نہیں ہے، بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اُسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے، بلکہ ایک دوٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹل قولِ حق ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

۸– یعنی یہ کفار اِس قرآن کی دعوت کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ اپنی پھونکوں سے اِس چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں۔ ایک سے ایک جھوٹا الزام تراش کر اِس کے پیش کرنے والے نبی پر لگا رہے ہیں، تاکہ دنیا میں اُس کی بات چلنے نہ پائے اور کفر و جاہلیّت کی وہی تاریکی چھائی رہے جسے چھانٹنے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔

۹– یعنی میں یہ تدبیر کر رہا ہوں کہ ان کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے پائے، اور یہ آخرِ کار منہ کی کھا کر رہیں، اور وہ نور پھیل کر رہے جسے یہ بجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

۱۰– یعنی اِنھیں ذرا مُہلت دو کہ جو کچھ یہ کرنا چاہیں، کر دیکھیں۔ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ نتیجہ اِن کے سامنے خود آ جائے گا اور اِنھیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تدبیر کے مقابلے میں ان کی چالیں کتنی کارگر ہوئیں۔

تفہیم القرآن

الاعلیٰ

(۸۷)

الاعلیٰ

نام

پہلی ہی آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کے لفظ الْاَعْلَى کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اِس کے مضمون سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، اور آیت ۶ کے یہ الفاظ بھی کہ ”ہم تمھیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھُولو گے“ یہ بتاتے ہیں کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نُزولِ وحی کے وقت آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں اُس کے الفاظ بھول نہ جاؤں۔ اس آیت کے ساتھ اگر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴، اور سورۂ قیامہ کی آیات ۱۶-۱۹ کو ملا کر دیکھا جائے، اور تینوں آیتوں کے اندازِ بیان اور موقع و محل پر بھی غور کیا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اِس سورہ میں حضوؐر کو اطمینان دلایا گیا کہ آپؐ فکر نہ کریں، ہم یہ کلام آپؐ کو پڑھوا دیں گے اور آپؐ اِسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد، دوسرے موقع پر جب سورۂ قیامہ نازل ہو رہی تھی، حضوؐر بے اختیار الفاظِ وحی کو دُہرانے لگے۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ ”اے نبیؐ! اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں، اُس وقت تم اِس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اِس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔“ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقع پر حضوؐر کو پھر بتقاضائے بشریت اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ ۱۱۳ آیتیں جو متواتر نازل ہوئی ہیں، اِن میں سے کوئی چیز میرے حافظے سے نکل نہ جائے، اور آپؐ اُن کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر فرمایا گیا: ”اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک تمھاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔“ اِس کے بعد پھر کبھی اِس کی نوبت نہیں آئی کہ حضوؐر کو ایسا کوئی خطرہ لاحق ہوتا، کیونکہ اِن تین مقامات کے سوا کوئی چوتھا مقام قرآن میں ایسا نہیں ہے جہاں اِس معاملے کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہو۔

موضوع اور مضمون

اِس چھوٹی سی سورت کے تین موضوع ہیں: توحید، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات، اور آخرت۔

پہلی آیت میں توحید کی تعلیم کو اِس ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کی جائے، یعنی اُس کو کسی ایسے نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا

مخلوقات سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی فاسد عقائد پیدا ہوئے ہیں، اُن سب کی جڑ اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی نہ کوئی غلط تصور ہے، جس نے اُس ذات پاک کے لیے کسی غلط نام کی شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا عقیدے کی تصحیح کے لیے سب سے مقدّم یہ ہے کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کو صرف اُن اسمائے حُسنٰی ہی سے یاد کیا جائے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہیں۔

اِس کے بعد تین آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ تمھارا رب، جس کے نام کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اُس کا تناسُب قائم کیا، اُس کی تقدیر بنائی، اُسے وہ کام انجام دینے کی راہ بتائی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے اُس کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہے ہو کہ وہ زمین پر نباتات کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر انھیں خس و خاشاک بھی بنا دیتا ہے۔ کوئی ہستی نہ بَہار لانے پر قادر ہے، نہ خزاں کو آنے سے روک سکتی ہے۔

پھر دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپؐ اِس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ قرآن جو آپؐ پر نازل کیا جا رہا ہے، یہ لفظ بلفظ آپؐ کو یاد کیسے رہے گا۔ اس کو آپؐ کے حافظے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے، اور اس کا محفوظ رہنا آپؐ کے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم چاہیں تو اِسے بُھلا دیں۔

اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ کے سُپرد ہر ایک کو راہِ راست پر لے آنے کا کام نہیں کیا گیا ہے، بلکہ آپؐ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے، اور تبلیغ کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو اُسے نصیحت کی جائے، اور جو اُس کے لیے تیار نہ ہو اُس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ جس کے دل میں گمراہی کے انجامِ بد کا خوف ہوگا وہ حق بات کو سُن کر قبول کرلے گا، اور جو بدبخت اُسے سننے اور قبول کرنے سے گریز کرے گا وہ اپنا بُرا انجام خود دیکھ لے گا۔

آخر میں کلام کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ فلاح صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو عقائد، اَخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کریں، اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھیں۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں ساری فکر بس اِسی دنیا کے آرام و آسایش اور فائدوں اور لذّتوں کی ہے، حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف قرآن ہی میں نہیں بتائی جا رہی ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی انسان کو اِسی حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔

آیاتہا ۱۹ سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ؕ﴿۵﴾

(اے نبیؐ!) اپنے ربِّ برتر کے نام کی تسبیح کرو[1] جس نے پیدا کیا اور تناسُب قائم کیا[2]، جس نے تقدیر بنائی[3] پھر راہ دکھائی[4]، جس نے نباتات اُگائیں[5] پھر اُن کو سیاہ کُوڑا کرکٹ بنا دیا[6]۔

۱- لفظی ترجمہ ہوگا: ”اپنے ربِّ برتر کے نام کو پاک کرو۔“ اِس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور وہ سب ہی مراد ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کو اُن ناموں سے یاد کیا جائے جو اس کے لائق ہیں، اور ایسے نام اُس کی ذاتِ برتر کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جو اپنے معنیٰ اور مفہوم کے لحاظ سے اُس کے لیے موزوں نہیں ہیں، یا جن میں اُس کے لیے نَقص یا گستاخی یا شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہے، یا جن میں اُس کی ذات یا صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اِس غرض کے لیے محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو اس نے خود قرآنِ مجید میں بیان فرمائے ہیں، یا جو دوسری زبان میں اُن کا صحیح ترجمہ ہوں۔ (۲) اللہ کے لیے مخلوقات کے سے نام، یا مخلوقات کے لیے اللہ کے ناموں جیسے نام استعمال نہ کیے جائیں۔ اور اگر کچھ صفاتی نام ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ بندوں کے لیے بھی اُن کا استعمال جائز ہے، مثلاً رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر وغیرہ، تو ان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے کہ بندے کے لیے ان کا استعمال اُس طریقے پر نہ ہو جس طرح اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ (۳) اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جائے، کسی ایسے طریقے پر یا ایسی حالت میں نہ لیا جائے جو اس کے احترام کے منافی ہو، مثلاً ہنسی مذاق میں، یا بیت الخلا میں، یا کوئی گناہ کرتے ہوئے اس کا نام لینا، یا ایسے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا جو اُسے سن کر گستاخی پر اُتر آئیں، یا ایسی مجلسوں میں اُس کا نام لینا جہاں لوگ بے ہودگیوں میں مشغول ہوں اور اس کا ذکر سُن کر مذاق میں اُڑا دیں، یا ایسے موقع پر اُس کا نام پاک زبان پر لانا جہاں اندیشہ ہو کہ سننے والا اسے ناگواری کے ساتھ سُنے گا۔ امام مالکؒ کے حالات میں منقول ہے کہ جب کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا اور وہ اس وقت اُسے کچھ نہ دے سکتے تو عام لوگوں کی طرح ”اللہ دے گا“ نہ کہتے، بلکہ کسی اور طرح معذرت کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ سائل کو جب کچھ نہ دیا جائے اور اس سے معذرت کر دی جائے تو لامحالہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر میں اللہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسے ناگواری کے ساتھ سُنے۔

احادیث میں حضرت عُقبہ بن عامر جُہَنیؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی پڑھنے کا حکم اِسی آیت کی بنا پر دیا تھا، اور رُکوع میں سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَظِیۡمِ پڑھنے کا جو طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا، وہ سورۂ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ پر مبنی تھا۔ (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان، حاکم، ابن المُنذِر)

۲ – یعنی زمین سے آسمانوں تک کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اور جو چیز بھی پیدا کی، اُسے بالکل راست اور دُرست بنایا، اس کا توازُن اور تناسُب ٹھیک ٹھیک قائم کیا، اُس کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ اُس جیسی چیز کے لیے اُس سے بہتر صورت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ سجدہ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ۔ (آیت ۷) ''جس نے ہر چیز جو بنائی، خوب ہی بنائی۔'' اِس طرح دنیا کی تمام اشیا کا موزوں اور مُتناسِب پیدا ہونا خود اِس امر کی صریح علامت ہے کہ کوئی صانعِ حکیم اِن سب کا خالق ہے۔ کسی اتفاقی حادثے سے، یا بہت سے خالقوں کے عمل سے، کائنات کے اِن بے شمار اجزا کی تخلیق میں یہ سلیقہ، اور مجموعی طور پر ان سب اجزا کے اجتماع سے کائنات میں یہ حُسن و جمال پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

۳ – یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا ہے اور اُس کام کے لیے اُس کی مقدار کیا ہو، اُس کی شکل کیا ہو، اس کی صفات کیا ہوں، اس کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقا اور قیام اور فعل کے لیے کیا مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وہ وجود میں آئے، کب تک اپنے حصّے کا کام کرے اور کب کس طرح ختم ہو جائے۔ اِس پوری اسکیم کا مجموعی نام اُس کی ''تقدیر'' ہے، اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لیے اور مجموعی طور پر پوری کائنات کے لیے بنائی ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ تخلیق کسی پیشگی منصوبے کے بغیر کچھ یونہی اَلَل ٹَپ نہیں ہوگئی ہے، بلکہ اس کے لیے ایک پورا منصوبہ خالق کے پیشِ نظر تھا اور سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۳ – ۱۴۔ جلد سوم، الفُرقان، حاشیہ ۸۔ جلد پنجم، القمر، حاشیہ ۲۵۔ جلد ششم، عبس، حاشیہ ۱۲)

۴ – یعنی کسی چیز کو بھی محض پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ جو چیز بھی جس کام کے لیے پیدا کی، اُسے اُس کام کے انجام دینے کا طریقہ بتایا۔ بالفاظِ دیگر، وہ محض خالق ہی نہیں ہے، ہادی بھی ہے۔ اس نے یہ ذمّہ لیا ہے کہ جو چیز جس حیثیت میں اس نے پیدا کی ہے اس کو ویسی ہی ہدایت دے، جس کے وہ لائق ہے اور اُسی طریقے سے ہدایت دے جو اُس کے لیے موزوں ہے۔ ایک قسم کی ہدایت زمین اور چاند اور سورج اور تاروں اور سیاروں کے لیے ہے، جس پر وہ سب چل رہے ہیں اور اپنے حصّے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور قسم کی ہدایت پانی اور ہوا اور روشنی اور جمادات و معدنیات کے لیے ہے، جس کے مطابق وہ ٹھیک وہی خدمات بجا لا رہے ہیں جن کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت نباتات کے لیے ہے، جس کی پیروی میں وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں نکالتے اور پھیلاتے ہیں، اس کی تہوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، جہاں جہاں اللہ نے ان کے لیے غذا پیدا کی ہے، وہاں سے اس کو حاصل کرتے ہیں، تنے،

شاخیں، پتّیاں، پھل پھول لاتے ہیں، اور وہ کام پورا کرتے ہیں جو اُن میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت خشکی، تری اور ہوا کے حیوانات کی بے شمار انواع اور ان کے ہر فرد کے لیے ہے، جس کے حیرت انگیز مظاہر جانوروں کی زندگی اور اُن کے کاموں میں عَلانِیَہ نظر آتے ہیں، حتّٰی کہ ایک دَہریّہ بھی یہ ماننے پر مجبُور ہو جاتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کو کوئی ایسا الہامی علم حاصل ہے جو انسان کو اپنے حواس تو درکنار، اپنے آلات کے ذریعے سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر انسان کے لیے دو الگ الگ نوعیّتوں کی ہدایتیں ہیں جو اس کی دو الگ حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ایک وہ ہدایت جو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے، جس کی بدولت ہر بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، جس کے مطابق انسان کی آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، پھیپھڑے، گُردے، جگر، معدہ، آنتیں، اعصاب، رگیں اور شریانیں، سب اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں، بغیر اس کے کہ انسان کو اُس کا شُعور ہو، یا اس کے ارادے کا اِن اعضا کے کاموں میں کوئی دخل ہو۔ یہی ہدایت ہے جس کے تحت انسان کے اندر بچپن، بُلوغ، جوانی، کُہولت اور بڑھاپے کے وہ سب جسمانی اور ذہنی تغیُّرات ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس کے ارادے اور مرضی، بلکہ شعور کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ دوسری ہدایت انسان کی عقلی اور شعوری زندگی کے لیے ہے، جس کی نوعیّت غیر شُعوری زندگی کی ہدایت سے قطعاً مختلف ہے، کیونکہ اِس شعبۂ حیات میں انسان کی طرف ایک قسم کا اختیار منتقل کیا گیا ہے، جس کے لیے ہدایت کا وہ طریقہ موزوں نہیں ہے جو بے اختیارانہ زندگی کے لیے موزوں ہے۔ انسان اِس آخری قسم کی ہدایت سے منہ موڑنے کے لیے خواہ کتنی ہی حُجّت بازیاں کرے، لیکن یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے کہ جس خالق نے اِس ساری کائنات میں ہر چیز کے لیے اس کی ساخت اور حیثیت کے مطابق ہِدایت کا انتظام کیا ہے، اُس نے انسان کے لیے یہ تقدیر تو بنا دی ہوگی کہ وہ اس کی دنیا میں اپنے اختیار سے تصرُّفات کرے، مگر اس کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا کہ اس اختیار کے استعمال کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۹-۱۰-۱۴-۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۳۔ جلد پنجم، الرحمٰن، حواشی ۲-۳۔ جلد ششم، الدَّہر، حاشیہ ۵)

۵ - اصل میں لفظ مَرْعٰی استعمال ہوا ہے، جو جانوروں کے چارے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن سیاقِ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اُگتی ہیں۔

۶ - یعنی وہ صرف بہار ہی لانے والا نہیں ہے، خزاں بھی لانے والا ہے۔ تمھاری آنکھیں اس کی قدرت کے دونوں کرشمے دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ ایسی ہری بھری نباتات اگاتا ہے جن کی تازگی و شادابی دیکھ کر دل خوش ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف اُسی نباتات کو وہ زرد، خُشک اور سیاہ کر کے ایسا کُوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب خَس و خاشاک کی صورت میں بہا لے جاتے ہیں۔ اس لیے کسی کو بھی یہاں اِس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ دنیا میں صرف بہار ہی دیکھے گا، خزاں سے اس کو سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ یہی مضمون قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً مُلاحَظہ ہو: سورۂ یُونُس، آیت ۲۴۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ﴿٦﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴿٧﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿٨﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿٩﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿١٠﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿١١﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿١٣﴾

ہم تمھیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے[7] سوائے اُس کے جو اللہ چاہے[8]، وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اُس کو بھی[9]۔

اور ہم تمھیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو[10]۔ جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کر لے گا[11]، اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا[12]۔

سورۂ کہف، آیت ۴۵۔ سورۂ حدید، آیت ۲۰۔

۷ - حاکم نے حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص سے اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اِس خوف سے دُہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مُجاہِد اور کَلْبی کہتے ہیں کہ جبریلؑ وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دُہرانے لگتے تھے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپؐ خاموشی سے سنتے رہیں، ہم آپؐ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کو یاد ہو جائے گی، اس بات کا کوئی اندیشہ آپؐ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپؐ بھول جائیں گے۔ یہ تیسرا موقع ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے دو مواقع سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۴، اور سورۂ قیامہ، آیات ۱۶ تا ۱۹ میں گزر چکے ہیں۔ اِس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا، اُسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا، اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپؐ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں، یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنیٰ لفظ آپؐ کی زبانِ مبارک سے ادا ہو جائے۔

۸ - اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپؐ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بُھلا سکتا ہے۔

یہ وہی مضمون ہے جو دوسری جگہ قرآنِ مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (بنی اسرائیل:۸۶) ''اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعے سے تمھیں عطا کیا ہے۔'' دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپؐ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپؐ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مُستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اِس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اِس رِوایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبَیّ بن کَعبؓ نے پوچھا: کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، میں بھول گیا تھا۔

۹ – ویسے تو یہ الفاظ عام ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے، خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اِس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ جو قرآن کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جا رہے ہیں اِس کا بھی اللہ کو علم ہے، اور بھول جانے کے جس خوف کی بنا پر آپؐ ایسا کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ اس لیے آپؐ کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپؐ اسے بھولیں گے نہیں۔

۱۰ – عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے۔ پہلے فقرے کا مطلب انھوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمھیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے، اور دوسرے فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے اور بعد کے فقرے کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مُتَرَتّب ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبیؐ! ہم تبلیغِ دین کے معاملے میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمھارے لیے مُیَسَّر کیے دیتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمھیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اُس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پتا تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمھارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اُٹھا کر راہِ راست اختیار کرلیں۔ یہی لوگ تمھاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انھی کی تعلیم و تربیت پر تمھیں توجہ صَرف کرنا چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجرِبے سے تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ یہ قریب قریب وہی مضمون ہے جو سورۂ عَبَس میں دوسرے طریقے سے یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ ''جو شخص بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔'' (آیات ۵ تا ۱۲)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝١٤ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝١٥ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝١٧ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۝١٩

ع ۱۴

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی[13] اور اپنے رب کا نام یاد کیا[14] پھر نماز پڑھی[15]۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو[16]، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے[17]۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں[18]۔

۱۱ – یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہوگا، اُسی کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اُس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سنے گا جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور فلاح و سعادت کا راستہ بتا رہا ہو۔

۱۲ – یعنی نہ اُسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے، اور نہ جینے کی طرح جیے گا کہ زندگی کا کوئی لُطف اسے حاصل ہو۔ یہ سزا اُن لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصیحت کو قبول ہی نہ کریں اور مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریّت پر قائم رہیں۔ رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے بُرے اعمال کی بنا پر جہنّم میں ڈالے جائیں، تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں موت دے دے گا، پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لا کر ڈالی جائیں گی، اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو، اور اس پانی سے وہ اس طرح جی اُٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔ یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مُسلم میں حضرت ابوسعید خُدریؓ اور بزّار میں حضرت ابوہُریرہؓ کے حوالے سے منقول ہوا ہے۔

۱۳ – پاکیزگی سے مراد ہے کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، بُرے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور بُرے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا۔ فلاح سے مراد دنیوی خوش حالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے، خواہ دنیا کی خوش حالی اس کے ساتھ میسّر ہو یا نہ ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حاشیہ ۲۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۱-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴)

۱۴ – یاد سے مراد دل میں بھی اللہ کو یاد کرنا ہے اور زبان سے بھی اُس کا ذکر کرنا ہے۔ دونوں چیزیں ذکرِ الٰہی کی تعریف میں آتی ہیں۔

۱۵ – یعنی صرف یاد کر کے رہ نہیں گیا بلکہ نماز کی پابندی اختیار کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ جس خدا کو وہ اپنا

خدا مان رہا ہے، اس کی اطاعت کے لیے وہ عملاً تیار ہے اور اس کو ہمیشہ یاد کرتے رہنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ اِس آیت میں علَی الترتیب دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے: پہلے اللہ کو یاد کرنا، پھر نماز پڑھنا۔ اسی کے مطابق یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کی جائے۔ یہ منجملہ اُن شواہد کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے، اس کے تمام اجزا قرآنی اشارات پر مبنی ہیں۔ مگر اللہ کے رسولؐ کے سوا ان اشارات کو جمع کر کے کوئی شخص بھی نماز کی یہ ہیئت ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

۱۶- یعنی تم لوگوں کی ساری فکر بس دنیا اور اس کی راحت و آسایش اور اس کے فائدوں اور لذّتوں کے لیے ہے۔ یہاں جو کچھ حاصل ہو جائے، تم سمجھتے ہو کہ بس وہی اصل فائدہ ہے جو تمھیں حاصل ہو گیا؛ اور یہاں جس چیز سے محروم رہے، تمھارا خیال ہے کہ بس وہی اصل نقصان ہے جو تمھیں پہنچ گیا۔

۱۷- یعنی آخرت دو حیثیتوں سے دنیا کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے: ایک یہ کہ اس کی راحتیں اور لذّتیں دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہیں، اور دوسرے یہ کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی۔

۱۸- یہ دوسرا مقام ہے جہاں قرآن میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں کی تعلیم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نجم، رکوع ۳ میں ایک حوالہ گزر چکا ہے۔

تفہیم القرآن

الغاشیہ

(۸۸)

الغاشِیَہ

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ الغاشیۃ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

سورت کا پورا مضمون اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغِ عام شروع کر چکے تھے اور مکہ کے لوگ بالعموم اُسے سُن سُن کر نظر انداز کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون

اِس کے موضوع کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ زیادہ تر دو ہی باتیں لوگوں کے ذہن نشین کرنے پر مرکوز تھی۔ ایک توحید، دوسرے آخرت۔ اور اہلِ مکہ ان دونوں باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اِس پَس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب اس سورہ کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کیجیے۔

اس میں سب سے پہلے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے اچانک اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ تمھیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب سارے عالَم پر چھا جانے والی ایک آفت نازل ہوگی؟ اِس کے بعد فوراً ہی یہ تفصیل بیان کرنی شروع کر دی گئی ہے کہ اُس وقت سارے انسان دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر دو مختلف انجام دیکھیں گے۔ ایک، وہ جو جہنّم میں جائیں گے اور اُنھیں ایسے اور ایسے سخت عذاب جھیلنے ہوں گے۔ دوسرے، وہ جو عالی مقام جنت میں جائیں گے اور اُن کو ایسی اور ایسی نعمتیں میسّر ہوں گی۔

اس طرح لوگوں کو چونکانے کے بعد یکلخت مضمون تبدیل ہوتا ہے اور سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ، جو قرآن کی تعلیمِ توحید اور خبرِ آخرت کو سُن کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، اپنے سامنے کی اُن چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے ہر وقت انھیں سابقہ پیش آتا ہے؟ عرب کے صحرا میں جن اُونٹوں پر اِن کی ساری زندگی کا انحصار ہے، کبھی یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ کیسے ٹھیک انھی خصوصیات کے مطابق بن گئے جیسی خصوصیات کے جانور کی ضرورت اِن کی صحرائی زندگی کے لیے تھی؟ اپنے سفروں میں جب یہ چلتے ہیں تو انھیں یا آسمان نظر آتا ہے، یا پہاڑ، یا زمین۔ انھی تین چیزوں پر یہ غور کریں۔ اُوپر یہ آسمان کیسے چھا گیا؟ سامنے یہ پہاڑ کیسے کھڑے ہو گئے؟ نیچے یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مُطلق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ اگر یہ مانتے ہیں کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی

قدرت کے ساتھ ان چیزوں کو بنایا ہے، اور کوئی دوسرا ان کی تخلیق میں شریک نہیں ہے، تو اُسی کو اکیلا رب ماننے سے اِنھیں کیوں انکار ہے؟ اور اگر یہ مانتے ہیں کہ وہ خدا یہ سب کچھ پیدا کرنے پر قادر تھا، تو آخر کس معقول دلیل سے اِنھیں یہ ماننے میں تأمُّل ہے کہ وہی خدا قیامت لانے پر بھی قادر ہے؟ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے؟ جنت اور دوزخ بنانے پر بھی قادر ہے؟

اِس مختصر اور نہایت معقول اِستِدلال سے بات سمجھانے کے بعد کفار کی طرف سے رُخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کیا جاتا ہے اور آپؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، تم اِن پر جَبّار بنا کر تو مسلّط کیے نہیں گئے ہو کہ زبردستی اِن سے منوا کر ہی چھوڑو۔ تمھارا کام نصیحت کرنا ہے، سو تم نصیحت کیے جاؤ۔ آخرِکار اِنھیں آنا ہمارے ہی پاس ہے۔ اُس وقت ہم اِن سے پورا پورا حساب لے لیں گے اور نہ ماننے والوں کو بھاری سزا دیں گے۔

---

٢٦ ایاتہا | ۱ رکوعاتہا

سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ﴿۱﴾ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ خَاشِعَةٌ ﴿۲﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً ﴿۴﴾ تُسْقٰى مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ ﴿۵﴾ لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ﴿۶﴾ لَّا یُسْمِنُ وَ لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ ﴿۷﴾ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ ﴿۹﴾

کیا تمھیں اُس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے؟[1] کچھ چہرے[2] اُس روز خوف زدہ ہوں گے، سخت مشقت کر رہے ہوں گے، تھکے جاتے ہوں گے، شدید آگ میں جُھلس رہے ہوں گے، کَھولتے ہوئے چشمے کا پانی انھیں پینے کو دیا جائے گا، خاردار سُوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا اُن کے لیے نہ ہوگا،[3] جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے۔ کچھ چہرے اُس روز بارونق ہوں گے، اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے،[4]

---

۱ – مراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اِس مقام پر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہاں بحیثیتِ مجموعی پورے عالمِ آخرت کا ذکر ہو رہا ہے، جو نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اُٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا و سزا پانے تک تمام مراحل پر حاوی ہے۔

۲ – چہروں کا لفظ یہاں اشخاص کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اُس کا چہرہ ہے جس سے اس کی شخصیت پہچانی جاتی ہے، اور انسان پر اچھی یا بُری جو کیفیات بھی گزرتی ہیں، ان کا اظہار اس کے چہرے سے ہی ہوتا ہے، اس لیے ''کچھ لوگ'' کہنے کے بجائے ''کچھ چہرے'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۳ – قرآنِ مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنّم کے لوگوں کو زَقُّوم کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے غِسْلِین (زخموں کے دھوون) کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا، اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انھیں خاردار سُوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہنّم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیے جائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زَقُّوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غِسْلِین ان کو ملے گا، اُس سے بھی

فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ﴿۱۰﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ؕ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۘ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾

وقف لازم

عالی مقام جنت میں ہوں گے، کوئی بے ہودہ بات وہاں نہ سُنیں گے[۵]، اُس میں چشمے رواں ہوں گے، اُس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی، ساغر رکھے ہوئے ہوں[۶] گے، گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔

(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی[۷]؟

بچنا چاہیں گے تو خار دار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے، غرض کوئی مرغوب غذا بہر حال انھیں نصیب نہ ہوگی۔

۴ – یعنی دنیا میں جو سعی و عمل کر کے وہ آئے ہوں گے، اُس کے بہترین نتائج آخرت میں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ انھیں اطمینان ہو جائے گا کہ دنیا میں ایمان اور صلاح و تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے انھوں نے نفس اور اس کی خواہشات کی جو قربانیاں کیں، فرائض کو ادا کرنے میں جو تکلیفیں اُٹھائیں، احکامِ الٰہی کی اطاعت میں جو زحمتیں برداشت کیں، معصیتوں سے بچنے کی کوشش میں جو نقصانات اٹھائے اور جن فائدوں اور لذّتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، یہ سب کچھ فی الواقع بڑے نفع کا سودا تھا۔

۵ – یہ وہی چیز ہے جس کو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ جنّت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الطُّور، حاشیہ ۱۸۔ الواقعہ، حاشیہ ۱۳۔ جلد ششم، النبا، حاشیہ ۲۱)

۶ – یعنی ساغر بھرے ہوئے ہر وقت اُن کے سامنے موجود ہوں گے۔ اِس کی حاجت ہی نہ ہوگی کہ وہ طلب کر کے انھیں منگوائیں۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ ٱللَّهُ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿۲۶﴾

اچھا تو (اے نبیؐ!) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۸۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ اِن لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر اِن کا حساب لینا ہمارے ہی ذمّہ ہے۔ع

۷ – یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے، تو کیا خود اپنے گرد و پیش کی دُنیا پر نظر ڈال کر انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آ سکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے، ان کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ ان کا وجود میں آنا تو ممکن ہے، کیونکہ یہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں، ان کے بارے میں وہ بے تکلّف یہ فیصلہ کر دے کہ اُن کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ اُونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خُصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا، جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سورج دن کو روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی، جس پر انسان رہتا اور بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مُطلَق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آیندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے، اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔

۸ – یعنی اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمھارے سپرد یہ کام تو نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بتا دو اور غلط راہ پر چلنے کے انجام سے خبردار کر دو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو۔

تفہیم القرآن

الفجر

(۸۹)

الفجر

نام

پہلے ہی لفظ وَالْفَجْرِ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اِس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکۂ معظّمہ میں اسلام قُبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی چکّی چلنی شروع ہو چکی تھی۔ اِسی بنا پر اہلِ مکہ کو عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون

اِس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اِثبات ہے، جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے۔ اِس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب وار اِستِدلال کیا گیا ہے اس کو اُسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ جس بات کا تم انکار کر رہے ہو، اُس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں اِن چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے، اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس باقاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور اِن کی قسم کھا کر یہ سوال اِس معنیٰ میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اِس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اِس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس خدا نے قائم کیا ہے، اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پُرس کرے؟

اِس کے بعد انسانی تاریخ سے اِستِدلال کرتے ہوئے بطورِ مثال عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گزر گئے اور زمین میں انھوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا اُن پر برس گیا۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی چَوپٹ راجا کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرماں روائے حکیم و دانا اِس پر حکمرانی کر رہا ہے، جس کی حکمت اور عدل کا یہ تقاضا خود اِس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے کہ عقل اور اخلاقی حِس دے کر جس مخلوق کو اس نے یہاں تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں اس کا

مُحاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عربِ جاہلیت کی حالت تو اُس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خُصوصیت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے: ایک، لوگوں کا مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حُصول یا فُقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دیے بیٹھے تھے، اور اِس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رَوِیّہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس رَوِش پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے، لوگوں کا یہ طرزِ عمل کہ یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس مپرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، جس کا بس چلتا ہے مُردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حق داروں کو دھتا بتا دیتا ہے، اور مال کی حرص لوگوں کو ایک ایسی نہ بجھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے، ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اِس تنقید سے مقصود لوگوں کو اِس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرزِ عمل ہے، اُن کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو۔

پھر کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہوگا اور ضرور ہوگا، اور وہ اُس روز ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں وہ بات آ جائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ منکر انسان ہاتھ ملتا رہ جائے گا کہ کاش! میں نے دنیا میں اِس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اُسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی۔ البتہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہوگا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاؑ پیش کر رہے تھے، خدا اُن سے راضی ہوگا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے، انھیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔

---

۳۰ آیاتھا

۱ رکوعاتھا

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ هَلْ فِي ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ ۗ﴿۵﴾

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جُفت اور طاق کی، اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ کیا اِس میں کسی صاحبِ عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟[۱]

۱- اِن آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے، حتّٰی کہ ”جُفت اور طاق“ کے بارے میں تو ۳۶ اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات میں اِن کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ اور بعد کے مفسرین میں سے کوئی بھی آپؐ کی تفسیر کے بعد خود اِن آیات کے معنیٰ متعین کرنے کی جرأت کرتا۔

اندازِ بیان پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے کوئی بحث چل رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات پیش فرما رہے تھے اور منکرین اُس کا انکار کر رہے تھے۔ اس پر حضورؐ کے قول کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قسم ہے فُلاں اور فُلاں چیزوں کی۔ مطلب یہ تھا کہ ان چیزوں کی قسم، جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں، وہ برحق ہے۔ پھر بات کو اِس سوال پر ختم کر دیا گیا کہ کیا کسی صاحبِ عقل کے لیے اِس میں کوئی قسم ہے؟ یعنی کیا اِس حق بات پر شہادت دینے کے لیے اِس کے بعد کسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا یہ قسم اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک ہوش مند انسان اُس بات کو مان لے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ بحث تھی کیا جس پر اِن چار چیزوں کی قسم کھائی گئی۔ اِس کے لیے ہمیں اُس پورے مضمون پر غور کرنا ہوگا جو بعد کی آیتوں میں ”تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا“ سے شروع ہو کر سورت کے آخر تک چلتا ہے۔ اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بحث جزا و سزا کے بارے میں تھی، جس کو ماننے سے اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اُس کا قائل کرنے کے لیے مسلسل تبلیغ و تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر، اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اِس بات کو باور کرنے کے لیے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحبِ عقل آدمی کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو؟

اِن قسموں کا یہ موقع و محل متعیّن ہو جانے کے بعد لامحالہ ہمیں اِن میں سے ہر ایک کے وہ معنیٰ لینے ہوں گے جو

بعد کے مضمون پر دلالت کرتے ہوں۔ سب سے پہلے فرمایا: ''فجر کی قسم''۔ فجر پَو پھٹنے کو کہتے ہیں، یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا: ''دس راتوں کی قسم''۔ سلسلۂ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخُن کی شکل سے شروع ہوکر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصّہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصّہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ''جُفت اور طاق کی قسم''۔ جُفت اُس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے، جیسے ۲-۴-۶-۸، اور طاق اُس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا، جیسے ۱-۳-۵-۷۔ عُمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے یا تنہا۔ لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے، اس لیے سلسلۂ مضمون کی مناسبت سے جُفت اور طاق کا مطلب تغیُّرِ ایام ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیُّر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے۔ آخر میں فرمایا: ''رات کی قسم جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو''۔ یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، خاتمے پر آ لگی ہو اور پَو پھٹنے والی ہو۔

اب اِن چاروں چیزوں پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیے جن کی قَسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک ربِّ قدیر اس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے، بے تُکا، بے مقصد، بے حکمت، بے مَصلَحت نہیں کر رہا ہے، بلکہ اُس کے ہر کام میں صریحاً ایک حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے۔ اُس کی دنیا میں تم یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکایک سورج نصف النّہار پر آ کھڑا ہوا۔ یا ایک روز چاند ہِلال کی شکل میں طلوع ہو اور دوسرے روز چودھویں رات کا پورا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر ٹھیر کر رہ جائے۔ یا تغیُّرِ ایام کا سرے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی تاریخوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کون سا مہینا ہے، اس کی کون سی تاریخ ہے، کس تاریخ سے اُس کا کون سا کام شروع اور کب ختم ہونا ہے، گرمی کے موسم کی تاریخیں کون سی ہیں اور برسات یا سردی کے موسم کی تاریخیں کون سی۔ کائنات کی دوسری بے شمار چیزوں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب و روز کی اِس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اِس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادرِ مُطلَق کا قائم کیا ہوا ہے، اور اِس کے قیام سے اُس مخلوق کی بے شمار مَصلَحتیں وابستہ ہیں جسے اُس نے اِس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و دانا اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے تو وہ دو حماقتوں میں سے کسی ایک حماقت میں لامحالہ مبتلا ہے: یا تو وہ اُس کی قدرت کا منکر ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کائنات کو

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِیْ

تم[۲] نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عادِ اِرَم کے ساتھ[۳]، جن کے

ایسے بے نظیر نظم کے ساتھ پیدا کر دینے پر تو قادر ہے، مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اُسے جزا و سزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا وہ اس کی حکمت و دانائی کا منکر ہے اور اس کے بارے میں یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اُس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا، مگر وہ نہ تو اُس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے اختیارات سے کام کیا لیا، اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا نہ بُرے کام کی سزا۔ اِن دونوں باتوں میں جس بات کا بھی کوئی شخص قائل ہے، وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔

۲ - جزا و سزا پر شب و روز کے نظام سے اِستدلال کرنے کے بعد اب اُس کے ایک یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم اِس کو چلا رہا ہے، اور اُس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانونِ فطرت سمجھتے ہو، بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کارفرما ہے، جس کا لازمی تقاضا مُکافاتِ عمل اور جزا اور سزا ہے۔ اِس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اِس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں، جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور خدا کی جزا و سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخرِکار فاسد و مُفسد بن کر رہیں، اور جو قوم بھی اِس راستے پر چلی اُس پر کائنات کے رب نے آخرِکار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے: ایک، یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوا ہے، اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے، جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، اُن سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اُس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اُن پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت اُن سب کی بازپُرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔ (قرآنِ مجید میں آخرت پر یہ تاریخی اور اخلاقی اِستدلال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ یونس، حاشیہ ۱۲۔ ہود، حواشی ۵۷-۱۰۵-۱۱۵۔ ابراہیم، حاشیہ ۹۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۸۶-۸۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سَبا، حاشیہ ۲۵۔ صٓ، حواشی ۲۹-۳۰۔ المومن، حاشیہ ۸۰۔ الدُّخان، حواشی ۳۳-۳۴۔ الجاثیہ، حواشی ۲۷-۲۸۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۷۔ الذاریات، حاشیہ ۲۱)

لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝١٠ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝١١ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝١٢ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝١٣ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝١٤

مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی[4]؟ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں[5]؟ اور میخوں والے فرعونؑ[6] کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخرِ کار تمھارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب گھات لگائے ہوئے ہے[7]۔

۳- عادِ اِرَم سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے قرآنِ مجید اور تاریخِ عرب میں عادِ اُولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى (آیت ۵۰) ''اور یہ کہ اُس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کیا''، یعنی اُس قوم عاد کو جس کی طرف حضرت ہودؑ بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں تاریخِ عرب اِس قوم کے اُن لوگوں کو، جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھُولے تھے، عادِ اُخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ قدیم قوم عاد کو عادِ اِرَم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اِرَم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اِسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں، جن میں سے ایک ثمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (Aramaeans) ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (Aramaic) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لیے ذَاتِ الْعِمَادِ (اُونچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اُونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انھی نے شروع کیا تھا۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ان کی اِس خصوصیت کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہودؑ نے ان سے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ ''یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو، گویا تمھیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔'' (الشُّعراء، آیات ۱۲۸-۱۲۹)

۴- یعنی وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے، اپنی قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اُس وقت دنیا میں اُن کی ٹکر کی نہ تھی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے: وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ''تم کو جسمانی ساخت میں خوب تومند کیا۔'' (الاعراف، آیت ۶۹) فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؕ۝۱۵ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ۚ۝۱۶

مگر[۸] انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا[۹]۔

فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ ”رہے عاد، تو انھوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور کہنے لگے: کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟“ (حٰم السجدہ، آیت ۱۵) وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ”اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا، جبّار بن کر ڈالا۔“ (الشعراء، آیت ۱۳۰)

۵ – وادی سے مراد وادی القُریٰ ہے، جہاں اِس قوم نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر عمارتیں بنائی تھیں، اور غالباً تاریخ میں وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اِس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷-۵۹۔ الحجر، حاشیہ ۴۵۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۹۵-۹۹ مع تصاویر)

۶ – فرعون کے لیے ذِی الْاَوْتَادِ (میخوں والا) کے الفاظ اِس سے پہلے سورۂ صٓ، آیت ۱۲ میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اِس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب فوجوں والا ہو، کیونکہ انھی کی بدولت اُس کی سلطنت اِس طرح جمی ہوئی تھی جیسے خیمہ میخوں کے ذریعے سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَہرامِ مصر کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو، کیونکہ وہ فَراعِنہ کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر جمے کھڑے ہیں۔

۷ – ظالموں اور مفسدوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہونے کے الفاظ تمثیلی استعارے کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اِس غرض کے لیے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ زد پر آئے، اُسی وقت اُس پر حملہ کر دے۔ وہ جس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے، اُسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اُس کی خبر لینے کے لیے کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ انجام سے غافل، بے فکری کے ساتھ وہ اُس مقام سے گزرتا ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اُن ظالموں کی ہے جو دنیا میں فساد کا طوفان برپا کیے رکھتے ہیں۔ اُنھیں اِس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ خدا بھی کوئی ہے جو اُن کی حرکات کو دیکھ رہا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

ہرگز نہیں،[۱۰] بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے،[۱۱] اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے،[۱۲] اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو،[۱۳] اور مال کی محبّت میں بُری طرح گرفتار ہو۔[۱۴]

وہ پوری بے خوفی کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ شرارتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ حد آجاتی ہے جس سے آگے اللہ تعالیٰ انھیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا، اُسی وقت اُن پر اچانک اس کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

۸ – اب لوگوں کی عام اخلاقی حالت پر تنقید کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ رَوِیّہ جن انسانوں نے اختیار کر رکھا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اُن سے کبھی باز پُرس نہ ہو، اور اِس بات کو عقل و اخلاق کا تقاضا کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ کر کے جب انسان دنیا سے رخصت ہو جائے تو اسے کسی جزا اور سزا سے سابقہ پیش نہ آئے۔

۹ – یعنی یہ ہے انسان کا مادہ پرستانہ نظریۂ حیات۔ اِسی دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ چیز ملے تو پھول جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور یہ نہ ملے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار اُس کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا ملنا یا نہ ملنا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت، جسے وہ نہیں سمجھتا، یہ ہے کہ اللہ نے جس کو دنیا میں جو کچھ بھی دیا ہے، آزمائش کے لیے دیا ہے۔ دولت اور طاقت دی ہے تو امتحان کے لیے دی ہے کہ وہ اُسے پا کر شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ مفلس اور تنگ حال بنایا ہے تو اس میں بھی اُس کا امتحان ہے کہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے، یا اخلاق و دیانت کی ہر حد کو پھاند جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے خدا کو کوسنے لگتا ہے۔

۱۰ – یعنی یہ عزت اور ذلت کا معیار ہرگز نہیں ہے۔ تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اخلاق کی بھلائی اور بُرائی کے بجائے تم نے اِسے معیارِ عزت و ذلت بنا رکھا ہے۔

۱۱ – یعنی جب تک اُس کا باپ زندہ رہتا ہے، اُس کے ساتھ تمھارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے، اور جب اُس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسایے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار، چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

۱۲ – یعنی تمھارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿٢٤﴾ فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾

ہرگز نہیں[15]، جب زمین پے درپے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنادی جائے گی، اور تمھارا رب جلوہ فرما ہوگا[16] اِس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور جہنّم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کی سمجھ میں آئے گا، اور اُس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل[17]؟ وہ کہے گا کہ کاش! میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

دوسرے کو اُس کا انتظام کرنے پر اکسائیں۔

۱۳ – عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف اُن مَردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اِس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا، وہ بلا تأمُّل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور اُن سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بُوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیّت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمان داری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں، خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

۱۴ – یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمھیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو، اسے حاصل کرنے میں تمھیں کوئی تأمُّل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے، تمھاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

۱۵ – یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ تم دنیا میں جیتے جی یہ سب کچھ کرتے رہو اور اِس کی باز پُرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزا و سزا کا انکار کر کے تم نے زندگی کا یہ ہنجار اختیار کر رکھا ہے، وہ کوئی اَنہونی اور خیالی بات نہیں ہے، بلکہ وہ پیش آنی ہے اور اُس وقت آنی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾ ع

(دوسری طرف ارشاد ہوگا:) اے نفسِ مطمئن[18]! چل اپنے رب کی طرف[19]، اِس حال میں کہ تُو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہوجا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہوجا میری جنّت میں۔ ع

۱۶- اصل الفاظ ہیں: جَآءَ رَبُّكَ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: ''تیرا رب آئے گا''۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اس کو ایک تمثیلی اندازِ بیان ہی سمجھنا ہوگا، جس سے یہ تصوّر دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی و قہاری کے آثار اُس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں اور اَعیانِ سلطنت کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے بنفسِ نفیس خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔

۱۷- اصل الفاظ ہیں: يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى۔ اِس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: ایک، یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرکے آیا ہے اور اُس پر نادم ہوگا، مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو ہوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاءؑ نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غَلَطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ۔

۱۸- نفسِ مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاءؑ کے لائے ہوئے دینِ حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے ملا اُسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اُس سے بادلِ ناخواستہ نہیں بلکہ اِس یقین کے ساتھ رُک گیا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے، جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی، بے دریغ اسے پیش کردیا، جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اِس راہ میں سابقہ درپیش ہوا، انھیں پورے سُکونِ قلب کے ساتھ برداشت کیا، اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آرہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اُسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اِس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دینِ حق کی پیروی نے اُسے اِن گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اِسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرحِ صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (الانعام، آیت ۱۲۵)

۱۹ – یہ بات اُس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اُٹھ کر میدانِ حشر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی، اور جب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اس وقت بھی کہی جائے گی۔ ہر مرحلے پر اُسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہا ہے۔

تفہیم القرآن

البلد

(۹۰)

البَلَد

نام پہلی ہی آیت لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ کے لفظ "البلد" کو اِس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اس کا مضمون اور اندازِ بیان مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں کا سا ہے، مگر ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتا دیتا ہے کہ اس کے نُزول کا زمانہ وہ تھا جب کفارِ مکہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر تُل گئے تھے اور آپؐ کے خلاف ہر ظلم و زیادتی کو انھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون اِس سورہ میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے، اور یہ قرآن کا کمالِ ایجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اِس چھوٹی سی سورت کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں، اُن کو دیکھنے اور اُن پر چلنے کے وسائل بھی اُسے فراہم کر دیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے، یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے بُرے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہرِ مکہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے مصائب اور پوری اولادِ آدم کی حالت کو اِس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدایش ہی مَشقّت کی حالت میں ہوئی ہے۔ اِس مضمون کو اگر سورۂ نجم کی آیت ۳۹ لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کارگاہِ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مَشقّت پر ہے۔

اِس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دُور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اُوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اُس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصوُّرات میں سے ایک چیز کو بطورِ مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بڑائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبریائی کی نمایش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے، وہ خود بھی اپنی اِن شاہ خرچیوں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں،

حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے، وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اُس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی، بلکہ نفس کو خوب لذّت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے، جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی بہ نسبت کھڈ میں لُڑھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمایش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال یتیموں اور مسکینوں کی مدد پر خرچ کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خَلق پر رحم کھانے والا ہو۔ اِس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

---

۲۰ آیاتہا — سُوْرَۃُ الْبَلَدِ مَکِّیَّۃٌ — رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۝۴ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْہِ اَحَدٌ ۝۵ یَقُوْلُ اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶

نہیں[1]، میں قسم کھاتا ہوں اِس شہر کی[2] اور حال یہ ہے کہ (اَے نبیؐ!) اِس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے[3]، اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی[4]، درحقیقت ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا ہے[5]۔ کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا؟[6] کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اُڑا دیا[7]۔

---

۱ — اِس سے پہلے ہم سورۂ قیامہ، حاشیہ ۱ میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کلام کا آغاز ''نہیں'' سے کرنا اور پھر قسم کھا کر آگے کی بات شروع کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگ کوئی غلط بات کہہ رہے تھے جس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ نہیں، بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ میں فُلاں فُلاں چیزوں کی قسم کھاتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بات کیا تھی جس کی تردید میں یہ کلام نازل ہوا، تو اُس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ کفارِ مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرزِ زندگی پر چل رہے ہیں، اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ ہمارے اِس طرزِ زندگی کو غلط ٹھیرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ اِس پر کبھی ہم سے باز پُرس ہوگی اور ہمیں جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲ — یعنی شہرِ مکہ کی۔ اِس مقام پر یہ بات کھولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اِس شہر کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔ اہلِ مکہ اپنے شہر کا پس منظر خود جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی میں سُنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو یہاں لا کر بے سہارا چھوڑا، کس طرح یہاں ایک گھر بنا کر ایسی حالت میں حج کی مُنادی کی جب کہ دُور دُور تک کوئی اُس مُنادی کا سننے والا نہ تھا، اور پھر کس طرح یہ شہر آخرِ کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صدہا برس تک عرب کی سرزمینِ بے آئین میں اِس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا۔

۳ — اصل الفاظ ہیں: اَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ۔ اِس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ آپؐ اِس شہر میں مقیم ہیں اور آپؐ کے مقیم ہونے سے اِس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر

حرم ہے، مگر ایک وقت آئے گا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپؐ کے لیے حلال ہوجائے گا۔ تیسرے یہ کہ اِس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور درختوں تک کو کاٹنا اہلِ عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسّر ہے، لیکن حال یہ ہوگیا ہے کہ اے نبیؐ! تمھیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں، تمھیں ستانا اور تمھارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجایش ہے، لیکن جب ہم آگے کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دو معنی اُس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور تیسرا مفہوم ہی اُس سے میل کھاتا ہے۔

۴ – چونکہ مطلقاً باپ اور اُس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دُنیا میں پائے گئے ہیں، اب پائے جاتے ہیں اور آیندہ پائے جائیں گے۔

۵ – یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اُوپر مذکور ہوئیں۔ انسان کے مَشقّت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چَین کی بنسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُس کے لیے یہ دنیا محنت اور مَشقّت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اِس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہرِ مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی، تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اِس شہرِ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتّٰی کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔ اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نُطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اِس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف، مَشقّت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے ہو، وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اِس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مرجائے یا اس کا اِسقاط ہوجائے۔ زَچگی کے وقت اُس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اِتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سِسک سِسک کر مرجاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیّرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیّر بھی اگر غلط سَمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اِس اندیشے سے اُس کو چَین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہوجائے۔ وہ اگر فاتحِ عالَم بھی ہے تو کسی وقت اِس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غَل و غَش چَین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے، کیونکہ انسان پیدا ہی مَشقّت میں کیا گیا ہے۔

۶ – یعنی کیا یہ انسان جو اِن حالات میں گھرا ہوا ہے، اِس غَرّے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے،

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا

کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اُس کو نہیں دیکھا؟[۸] کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو

کوئی بالاتر اقتدار اُس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اِس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کی تقدیر پر کسی اور کی فرماں روائی قائم ہے، جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طُغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بُوتا رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پلٹا بڑے سے بڑے با اقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ عُروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اِس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی کا اس پر بس نہیں چل سکتا؟

۷- اَنۡفَقۡتُ مَالًا لُّبَدًا ''میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا'' نہیں کہا بلکہ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا کہا، جس کے لفظی معنیٰ ہیں: ''میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا''، یعنی لُٹا دیا، یا اُڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اُس نے خرچ کیا، وہ اُس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہیچ تھا کہ اس کے لُٹا دینے یا اُڑا دینے کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اُڑا دینا تھا کس مد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مُترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا۔ جُوے میں ڈھیروں دولت ہار دینا۔ جُوا جیت جانے پر اُونٹ پر اُونٹ کاٹنا اور خوب یار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور اِذنِ عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے، آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کُھلا لنگر جاری رکھنا کہ دُور دُور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فُلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنھیں جاہلیت میں آدمی کی فیّاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انھی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے۔ انھی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔

۸- یعنی کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اِس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخُر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا

وَّ شَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ هَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ۖ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ يَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ؕ ثُمَّ

ہونٹ نہیں دیے؟[9] اور دونوں نمایاں راستے اُسے (نہیں) دکھا دیے؟[10] مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمّت نہ کی۔[11] اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چُھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔[12] پھر (اِس کے ساتھ یہ کہ)

اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اس سے دھوکا کھا جائے گا؟

۹- مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اُسے علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے؟ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنھیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتا دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفسِ ناطقہ ہے، جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

۱۰- یعنی ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دَہر میں فرمائی گئی ہے کہ ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں، اور اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا'' (آیات ۲-۳) تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الدہر، حواشی ۳ تا ۵۔

۱۱- اصل الفاظ ہیں: فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ۔ اِقتحام کے معنیٰ ہیں: اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقّت طلب کام میں ڈالنا۔ اور عقبہ اُس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اُسے دکھائے، ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے، مگر مشقّت طلب اور دشوار گزار ہے۔ اُس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے، اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اُترتا ہے، مگر اس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیے تھے، اِس نے اُن میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کر لیا، اور اُس مشقّت طلب راستے

کو چھوڑ دیا جو بلندی کی طرف جانے والا ہے۔

۱۴- اُوپر چونکہ اُس کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمایش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مَصْرَف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذّت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑائے۔ اِسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدّت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ ان کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شان دار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اِسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

اِن آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً: فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضورؐ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ایک حضرت ابوہُرَیرہؓ کی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عُضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عُضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرمگاہ کے بدلے میں شرمگاہ۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، نَسائی) حضرت علیؓ بن حسینؓ (امام زَین العابدینؒ) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مَرجانہ سے پوچھا: کیا تم نے ابوہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر امام زین العابدینؒ نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اُسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مُسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شَعْبیؒ نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدّم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضورؐ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: الساعی علی الارملة والمسکین کالساعی فی سبیل اللّٰہ واحسبهٗ قال کالقائم لا یفتر و کالصائم لا یفطر۔ ”بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ (اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ) مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے، اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ

كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾

آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے [۱۳] اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی۔ [۱۴]

نہ چھوڑے۔" (بخاری و مسلم)

یتامیٰ کے بارے میں تو حضورؐ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہلؓ بن سعد کی رِوایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اِس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپؐ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اُٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔" (بخاری) حضرت ابو ہریرہؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو، اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بُرا سلوک ہو رہا ہو۔" (ابنِ ماجہ، بخاری فی الادب المُفرَد) حضرت ابو اُمامہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: "جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا، اُس بچے کے ہر بال کے بدلے، جس پر اس شخص کا ہاتھ گزرا، اُس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا، وہ اور میں جنّت میں اِس طرح ہوں گے۔ اور یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں۔" (مُسندِ احمد، ترمِذی) ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکارِ رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا: "جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا، اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کردی، اِلّا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔" (شرح السُّنّہ) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا۔" (مُسندِ احمد)

۱۳ – یعنی اِن اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل، عملِ صالح ہے اور نہ اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اِس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابلِ قدر اور ذریعۂ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورۂ نساء میں فرمایا: "جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔" (آیت ۱۲۴) سورۂ نحل میں فرمایا: "جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو اُن کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔" (آیت ۹۷) سورۂ مومن میں فرمایا: "اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔" (آیت ۴۰) قرآنِ پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عملِ صالح کے اجر اور اس کی جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں لازماً اُس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو کہیں بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔

اِس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ ایمان لایا" بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ اُن لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے۔" اِس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا اُن دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں، تاکہ اِس سے اہلِ ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ وجود میں آئے، اور اجتماعی طور پر اُن بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا، اور اُن بُرائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔

۱۴- یہ مومن معاشرے کی دو اہم خصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔

جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اِس سے پہلے بارہا اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے، اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے، اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم، اور دنیا بھر کے شیاطینِ جن و اِنس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتّٰی کہ راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اِس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اِس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اُس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

رہا رحم، تو اہلِ ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ ایک سنگ دل، بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا، بلکہ انسانیت کے لیے رحیم و شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غم خوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے، اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اُس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء:۱۰۶)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اَخلاقی صفت کو اپنی اُمّت میں فروغ دینے کی کوشش فرمائی ہے، وہ یہی رحم کی صفت ہے۔ مثال کے طور پر آپؐ کے حسبِ ذیل ارشادات مُلاحظہ ہوں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت جَرِیرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرحمُ اللّٰہ من لا یرحمُ النّاسَ۔ (بخاری، مسلم)

اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ بن العاص کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الراحمون یرحمھم الرحمٰن۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ (ابوداؤد، تِرْمِذِی)

رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حضرت ابوسعیدؓ خُدرِی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من لا یرحم لا یرحم۔ (بخاری فی الادب المُفرَد)

جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس منّا من لم یرحم صغیرنا ولم یُوقِّر کبیرنا۔ (تِرْمِذِی)

وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے۔

ابوداؤد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف حق کبیرنا فلیس منّا۔

جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

لا تُنزعُ الرّحمۃُ الّا من شقیٍّ۔ (مُسندِ احمد، تِرْمِذِی)

بدبخت آدمی کے دل ہی سے رحم سلب کرلیا جاتا ہے۔

حضرت عِیاضؓ بن حِمار کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: تین قسم کے آدمی جنّتی ہیں۔ ان میں سے ایک:

رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قربٰی ومسلم۔ (مسلم)

وہ شخص ہے جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور رقیق القلب ہو۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تری المؤمنین و تراحمھم و توادھم و تعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکٰی عضوًا تداعٰی لہ سائر الجسد بالسَّھَر والحمٰی۔

تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبّت اور ہمدردی کے معاملے میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عُضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

ع ۱۵

یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں[۱۵]، ان پر آگ چھائی ہوئی[۱۶] ہوگی۔ ع

(بخاری و مسلم) بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدّ بعضه بعضًا۔ (بخاری و مسلم)

مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصّہ دوسرے حصّے کو مضبوط کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

المسلم اخوا المسلم لا يظلمه ولا يُسلمه ومن كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته ومن فرّج عن مسلم كُرْبةً فرّج الله عنه كربةً من كُرُبات يوم القيامة ومن ستر مسلمًا ستره الله يوم القيامة۔ (بخاری و مسلم)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوگا، اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا، اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی عیب پوشی کرے گا۔

اِن ارشادات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو ایمان لانے کے بعد اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل ہونے کی جو ہدایت قرآنِ مجید کی اِس آیت میں دی گئی ہے، اُس سے کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔

۱۵ – دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح ہم سورۂ واقعہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۵-۶۔

۱۶ – یعنی آگ اِس طرح اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی کہ اُس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

تفہیم القرآن

الشّمس

(۹۱)

الشّمس

نام پہلے ہی لفظ الشَّمس کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول مضمون اور اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت بھی مکۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے، مگر اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا اور اُن لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے یہ سورت دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصّہ سورت کے آغاز سے شروع ہو کر آیت ۱۰ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصّہ آیت ۱۱ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصّے میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں: ایک یہ کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں، اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں۔ یہ دونوں نہ اپنی شکل میں یکساں ہیں اور نہ ان کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو جسم، حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر دنیا میں بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے سے اُس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، بھلے اور بُرے کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس اُتار دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اِس پر ہے کہ اس کے اندر تمیز، ارادے اور فیصلے کی جو قوتیں اللہ نے رکھ دی ہیں، ان کو استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں سے کس کو اُبھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ اگر وہ اچھے رجحانات کو اُبھارے اور بُرے رُجحانات سے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر وہ نفس کی اچھائی کو دبائے اور برائی کو اُبھارے تو نامراد ہوگا۔

دوسرے حصّے میں قومِ ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے، وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر و شر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُس فطری الہام کی مدد کے لیے

انبیا علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی، تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ایسے ہی ایک نبی، حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے، مگر وہ اپنے نفس کی بُرائی میں غرق ہو کر اتنی سرکش ہو گئی تھی کہ اُس نے اُن کو جھٹلا دیا، اور اُس کا منہ مانگا معجزہ جب اُنھوں نے ایک اونٹنی کی شکل میں پیش کیا تو اُن کی تنبیہ کے باوجود اُس قوم کے ایک شریر ترین آدمی نے ساری قوم کی خواہش اور طلب کے مطابق اسے بھی قتل کر دیا۔ اِس کا نتیجہ آخرِ کار یہ ہوا کہ پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔

ثمود کا یہ قصّہ پیش کرتے ہوئے پوری سورت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے قومِ قُریش! اگر تم ثمود کی طرح اپنے نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاؤ گے تو وہی انجام دیکھو گے جو ثمود نے دیکھا ہے۔ مکہ میں اُس وقت حالات وہی موجود تھے جو صالح علیہ السلام کے مقابلے میں قومِ ثمود کے اشرار نے پیدا کر رکھے تھے۔ اس لیے اُن حالات میں یہ قصّہ سنا دینا بجائے خود اہلِ مکہ کو یہ سمجھا دینے کے لیے کافی تھا کہ ثمود کی یہ تاریخی نظیر اُن پر کس طرح چسپاں ہو رہی ہے۔

۱۵ آیاتہا

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ

رکوعاتہا ۱
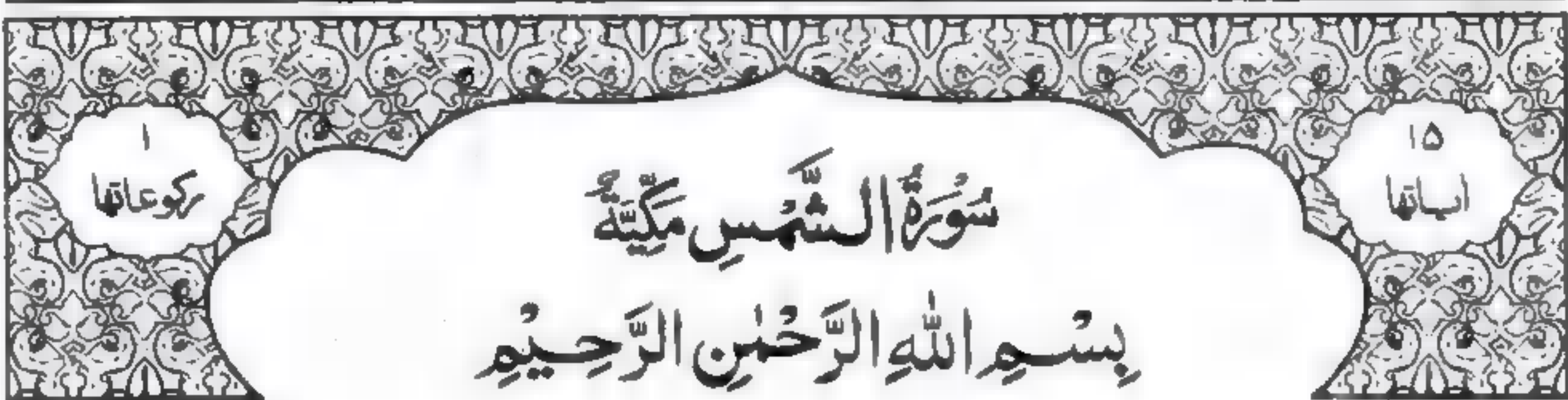
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۝ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝ وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۝

سورج اور اُس کی دھوپ کی قسم[1]، اور چاند کی قسم جب کہ وہ اُس کے پیچھے آتا ہے، اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے[2]، اور آسمان کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے قائم کیا[3]،

۱- اصل میں لفظ ضُحٰی استعمال کیا گیا ہے جو سورج کی روشنی اور اس کی حرارت، دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ عَرَبی زبان میں اس کے معروف معنٰی چاشت کے وقت کے ہیں جب کہ سورج طُلوع ہونے کے بعد خاصا بلند ہوجاتا ہے۔ لیکن جب سورج چڑھتا ہے تو صرف روشنی ہی نہیں دیتا بلکہ گرمی بھی دیتا ہے، اس لیے ضُحٰی کا لفظ جب سورج کی طرف منسوب ہوتو اس کا پورا مفہوم اُس کی روشنی، یا اُس کی بدولت نکلنے والے دن کے بجائے اُس کی دھوپ ہی سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

۲- یعنی رات کی آمد پر سورج چھپ جاتا ہے اور اُس کی روشنی رات بھر غائب رہتی ہے۔ اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ رات سورج کو ڈھانک لیتی ہے، کیونکہ رات کی اصل حقیقت سورج کا اُفُق سے نیچے اتر جانا ہے، جس کی وجہ سے اُس کی روشنی زمین کے اُس حصے تک نہیں پہنچ سکتی جہاں رات طاری ہوگئی ہو۔

۳- یعنی چھت کی طرح اُسے زمین پر اُٹھا کھڑا کیا۔ اِس آیت اور اس کے بعد کی دو آیتوں میں مَا کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی مَا بَنٰىهَا، اور مَا طَحٰىهَا اور مَا سَوّٰىهَا۔ اِس لفظِ مَا کو مفسرین کے ایک گروہ نے مصدری معنوں میں لیا ہے اور وہ اِن آیتوں کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ آسمان اور اس کے قائم کیے جانے کی قَسم، زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قَسم، اور نفس اور اس کے ہموار کیے جانے کی قَسم۔ لیکن یہ معنٰی اس لیے درست نہیں ہیں کہ ان تین فقروں کے بعد یہ فقرہ کہ "پھر اُس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی" اِس سلسلۂ کلام کے ساتھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ دوسرے مفسرین نے یہاں مَا کو مَنْ یا الَّذِی کے معنٰی میں لیا ہے، اور وہ اِن فقروں کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جس نے آسمان کو قائم کیا، جس نے زمین کو بچھایا، اور جس نے نفس کو ہموار کیا۔ یہی دوسرا مطلب ہمارے نزدیک صحیح ہے، اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ مَا عربی زبان میں بے جان اشیا اور بے عقل مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن میں اِس کی

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝٦ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝٩ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝١٠

اور زمین کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے بچھایا، اور نفسِ انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا[۴] پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی،[۵] یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا۔[۶]

بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ مَا کو مَنْ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً: وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں)۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (پس عورتوں میں سے جو تمھیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو)۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرو)۔

۴ – ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اور اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اُس کو دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسُب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ اِستدلال و اِستنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ، قوتِ ارادی اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اُسے پیدائشی گناہ گار اور جبلّی بدمَعاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خِلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ یہی بات ہے جسے سورۂ رُوم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، "قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔" (آیت ۳۰) اور اِسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ "کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہو، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح و سالم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم ان میں کسی کا کان کٹا ہوا پاتے ہو؟" (بخاری و مسلم) یعنی یہ مشرکین ہیں جو بعد میں اپنے اَوہامِ جاہلیّت کی بنا پر جانوروں کے کان کاٹتے ہیں، ورنہ خدا کسی جانور کو ماں کے پیٹ سے کٹے ہوئے کان لے کر پیدا نہیں کرتا۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف (صحیح الفطرت) پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آ کر ان کو ان کے دین (یعنی ان کے فطری دین) سے گمراہ کر دیا، اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، اور ان کو حکم دیا کہ میرے ساتھ اُن کو شریک کریں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔" (مُسندِ احمد۔ مسلم نے بھی اِس سے ملتے جُلتے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد نقل کیا ہے)۔

۵ – اِلہام کا لفظ لَھْم سے ہے جس کے معنیٰ نگلنے کے ہیں۔ لَھَمَ الشَّیْءَ وَالْتَھَمَہٗ کے معنیٰ ہیں: فلاں شخص نے اس چیز کو نگل لیا۔ اور اَلْھَمْتُہُ الشَّیْءَ کے معنیٰ ہیں: میں نے فُلاں چیز اس کو نگلوا دی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اِسی بنیادی مفہُوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصوُّر یا کسی خیال کو غیر شعُوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز بُرائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فُجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (بُرائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت اِن سے آشنا ہے اور خالق نے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔ یہی بات سورۂ بَلَد میں فرمائی گئی ہے کہ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ ''اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے۔'' (آیت ۱۰) اِسی کو سورۂ دہر میں یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ ''ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا، خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر۔'' (آیت ۳) اور اسی بات کو سورۂ قیامہ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفسِ لَوَّامہ (ضمیر) موجود ہے، جو بُرائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے۔ (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ (آیات ۱۴-۱۵)

اِس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اُس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ ''جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی۔'' (آیت ۵۰) مثلاً: حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے، جس کی بنا پر مچھلی کو آپ سے آپ تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتّا بنانا اور بیے کو گھونسلا تیار کرنا آ جاتا ہے۔ انسان کو بھی اُس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی عُلوم دیے گئے ہیں۔ انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے اور اِس حیثیت سے جو الہامی علم اُس کو دیا گیا ہے اُس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دُودھ چُوسنا ہے، جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ اُس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔ اِس حیثیت سے خدا نے انسان کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اُس کو الہامی رہنمائی دی ہے، جس کی بدولت وہ پے در پے اِکتشافات اور ایجادات کر کے تمدّن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ اِن ایجادات و اکتشافات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ یکایک کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آ گئی اور اُس کی بدولت اُس نے کسی چیز کا اکتشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی۔ ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ

وہ ایک اخلاقی وجود ہے، اور اِس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے، جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر وشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے، اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور بُرائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔ اِس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب وتمدُّن میں پایا جانا اِس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے، اور مزید برآں یہ اِس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالقِ حکیم و دانا نے اِسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، کیونکہ جن اجزا سے انسان مرکّب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادّی نظام چل رہا ہے، اُن کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔

٦ – یہ ہے وہ بات جس پر اُن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جو اُوپر کی آیات میں مذکور ہوئی ہیں۔ اب غور کیجیے کہ وہ چیزیں اِس پر کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے، اُن کی شہادت میں وہ سامنے کی چند ایسی نمایاں ترین چیزوں کو پیش کرتا ہے جو ہر آدمی کو اپنے گردوپیش کی دنیا میں، یا خود اپنے وجود میں نظر آتی ہیں۔ اِسی قاعدے کے مطابق یہاں دو دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے، جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں، اس لیے اُن کے آثار اور نتائج بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ لازماً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف سورج ہے اور دوسری طرف چاند۔ سورج کی روشنی نہایت تیز ہے اور اس میں گرمی بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں چاند اپنی کوئی روشنی نہیں رکھتا۔ سورج کی موجودگی میں وہ آسمان پر موجود بھی ہو تو بے نور ہوتا ہے۔ وہ اُس وقت چمکتا ہے جب سورج چھپ جائے، اور اُس وقت بھی اس کی روشنی نہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن بنا دے، نہ اُس میں کوئی گرمی ہوتی ہے کہ وہ کام کر سکے جو سورج کی گرمی کرتی ہے۔ لیکن اُس کے اپنے کچھ اثرات ہیں جو سورج کے اثرات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک طرف دن ہے اور دوسری طرف رات۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کے اثرات اور نتائج باہم اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی اُن کو یکساں نہیں کہہ سکتا، حتّٰی کہ ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ رات ہوئی تو کیا اور دن ہوا تو کیا، کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح ایک طرف آسمان ہے جسے خالق نے بلند اُٹھایا ہے، اور دوسری طرف زمین ہے جسے پیدا کرنے والے نے آسمان کے نیچے فرش کی طرح بچھا دیا ہے۔ دونوں اگرچہ ایک ہی کائنات اور اس کے نظام اور اس کی مصلحتوں کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن دونوں کے کام اور ان کے اثرات ونتائج میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اِن آفاقی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد خود انسان کے اپنے نفس کو لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسے اعضا اور حواس اور ذہنی قوتوں کے متناسب امتزاج سے ہموار کر کے خالق نے اس کے اندر بھلائی اور بُرائی، دونوں کے میلانات، رُجحانات اور محرکات رکھ دیے ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور الہامی طور پر اسے اِن دونوں کا فرق سمجھا دیا گیا ہے کہ ایک فجور ہے، اور وہ بُری چیز ہے، اور دوسرا تقویٰ ہے، اور وہ اچھی چیز۔ اب اگر سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے اثرات اور نتائج ایک دوسرے سے لازماً مختلف ہیں، تو نفس کا فجور اور تقویٰ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یکساں کیسے ہوسکتے ہیں۔

انسان خود اِس دنیا میں بھی نیکی اور بدی کو یکساں نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا۔ خواہ اس نے اپنے بنائے ہوئے فلسفوں کی رُو سے خیر و شر کے کچھ بھی معیار تجویز کر لیے ہوں، بہر حال جس چیز کو بھی وہ نیکی سمجھتا ہے اس کے متعلق وہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ قابلِ قدر ہے، تعریف اور صلے اور انعام کی مستحق ہے۔ بخلاف اِس کے جس چیز کو بھی وہ بدی سمجھتا ہے، اس کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ مذمّت اور سزا کی مستحق ہے۔ لیکن اصل فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اُس خالق کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کا فجور اور تقویٰ اُس پر الہام کیا ہے۔ فجور وہی ہے جو خالق کے نزدیک فجور ہے، اور تقویٰ وہی ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ ہے۔ اور خالق کے ہاں اِن دونوں کے دو الگ نتائج ہیں۔ ایک کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے وہ فلاح پائے، اور دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو دبا دے وہ نامراد ہو۔

تزکیہ کے معنیٰ ہیں: پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا۔ سیاق و سباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے، اس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے، وہ فلاح پائے گا۔ اس کے مقابلے میں دَسّٰھَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مصدر تَدْسِیَہ ہے۔ تَدْسِیَہ کے معنیٰ دبانے، چھُپانے، اِغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق و سباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رُجحانات کو اُبھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے اُن کو دبا دے، اُس کو بہکا کر بُرائی کے رجحانات کی طرف لے جائے، اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اِس طرح چھُپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھُپ جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّى اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّى اللّٰهُ نَفْسَهٗ، یعنی فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا۔ لیکن یہ تفسیر، اوّل تو زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرزِ بیان کے خلاف ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہی بات کہنی مقصود ہوتی تو وہ یوں فرماتا کہ قَدْ اَفْلَحَتْ مَنْ زَكّٰهَا اللّٰهُ وَقَدْ خَابَتْ مَنْ دَسّٰهَا اللّٰهُ (فلاح پا گیا وہ نفس جس کو اللہ نے پاک کر دیا، اور نامراد ہو گیا وہ نفس جس کو اللہ نے دبا دیا)۔ دوسرے، یہ تفسیر اِسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، ”فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔“ (آیت ۱۴) سورۂ عَبَس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى، ”اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔“ اِن دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اِس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ مثلاً: سورۂ دَہر میں فرمایا: ”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نُطفے سے پیدا کیا، تاکہ اس کی آزمائش کریں، اِسی لیے اُسے ہم نے سمیع و بصیر بنایا۔“ (آیت ۲) اور سورۂ مُلک میں فرمایا: ”جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تمھیں آزمائے، کون تم میں بہتر عمل کرنے والا ہے۔“ (آیت ۲) اب یہ ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے ہی بے معنیٰ ہو جاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔ اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو قَتادہ، عِکرِمہ، مجاہد اور سعید بن جُبَیر نے بیان کی ہے کہ زَكّٰهَا اور دَسّٰهَا کا فاعل بندہ ہے، نہ کہ خدا۔ رہی وہ حدیث جو ابنِ ابی حاتم نے

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۵

ثمودؔ نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اُس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بِھر کر اُٹھا تو اللہ کے رسول نے اُن لوگوں سے کہا کہ خبردار! اللہ کی اُونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اُس کے پانی پینے (میں مانع نہ ہونا)۔ مگر انھوں نے اُس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اُونٹنی کو مار ڈالا۔[۱۰]

عن جُوَیبِر بن سعید عن الضَّحَّاک عن ابنِ عباسؓ کی سند سے نقل کی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اَفْلَحَتْ نَفْسٌ زَکّٰهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ (فلاح پا گیا وہ نفس جس کو اللہ عزّوجلّ نے پاک کر دیا)، تو یہ ارشاد درحقیقت حضورؐ سے ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں جُوَیبِر متروک الحدیث ہے اور ابنِ عباسؓ سے ضَحّاک کی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ البتہ وہ حدیث صحیح ہے جو امام احمد، مُسلِم، نَسائی اور ابنِ ابی شَیبَہ نے حضرت زَیدؓ بن اَرقَم سے روایت کی ہے کہ حضورؐ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اللّٰھمّ اٰتِ نفسی تقواھا وزکّھا انتَ خیر من زکاھا، انت ولیُّھا ومولاھا۔" خدایا! میرے نفس کو اُس کا تقویٰ عطا کر اور اس کو پاکیزہ کر، تو ہی وہ بہتر ہستی ہے جو اس کو پاکیزہ کرے، تو ہی اُس کا سرپرست اور مولیٰ ہے۔" اِسی سے مِلتے جُلتے الفاظ میں حضورؐ کی یہ دعا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے طَبَرانی، ابنِ مَردُوْیہ اور ابن المُنذِر نے اور حضرت عائشہؓ سے امام احمدؒ نے نقل کی ہے۔ اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ بندہ تو صرف تقویٰ اور تزکیہ کی خواہش اور طلب ہی کر سکتا ہے، رہا اس کا نصیب ہو جانا، تو وہ بہرحال اللہ ہی کی توفیق پر منحصر ہے۔ اور یہی حال تدسِیَہ کا بھی ہے کہ اللہ زبردستی کسی کے نفس کو نہیں دباتا، مگر جب بندہ اُس پر تُل جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے تقویٰ اور تزکیہ کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور اُسے چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے نفس کو جس گندگی کے ڈھیر میں دبانا چاہے، دبا دے۔

۷ – اُوپر کی آیات میں جن باتوں کو اُصولاً بیان کیا گیا ہے اب انھی کی وضاحت ایک تاریخی نظیر سے کی جا رہی ہے۔ یہ کس بات کی نظیر ہے اور اُوپر کے بیان سے اس کا کیا تعلق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کے دوسرے بیانات کی روشنی میں اُن دو بنیادی حقیقتوں پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے جو آیات ۷ تا ۱۰ میں بیان کی گئی ہیں۔

اوّلاً، ان میں فرمایا گیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ایک ہموار و مستقیم فطرت پر پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ اُس پر الہام کر دیا۔ قرآن اِس حقیقت کو بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ فجور و تقویٰ کا یہ الہامی علم اِس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر شخص خود ہی اُس سے تفصیلی ہدایت حاصل کر لے، بلکہ اِس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے انبیا علیہم السلام کو مفصّل ہدایت دی، جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ فجور کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے جن سے بچنا چاہیے، اور تقویٰ کس چیز کا نام ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان وحی کے ذریعے سے آنے والی اِس واضح ہدایت کو قبول نہ کرے تو وہ نہ فجور سے بچ سکتا ہے نہ تقویٰ کا راستہ پا سکتا ہے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵

آخرِ کار اُن کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا، اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی بُرے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔[۱۱]

ثانیاً، اِن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جزا اور سزا وہ لازمی نتائج ہیں جو فجور اور تقویٰ میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مُترتّب ہوتے ہیں۔ نفس کو فجور سے پاک کرنے اور تقویٰ سے ترقی دینے کا نتیجہ فلاح ہے، اور اس کے اچھے رجحانات کو دبا کر فجور میں غرق کر دینے کا نتیجہ نامُرادی اور ہلاکت و بربادی۔

اسی بات کو سمجھانے کے لیے ایک تاریخی نظیر پیش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے ثمود کی قوم کو بطورِ نمونہ لیا گیا ہے، کیونکہ پچھلی تباہ شدہ قوموں میں سے جس قوم کا علاقہ اہلِ مکہ سے قریب ترین تھا وہ یہی تھی۔ شمالی حجاز میں اس کے تاریخی آثار موجود تھے، جن سے اہلِ مکہ شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں ہمیشہ گزرتے رہتے تھے، اور جاہلیت کے اشعار میں جس طرح اس قوم کا ذکر کثرت سے آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب میں اس کی تباہی کا چرچا عام تھا۔

۸ - یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھُٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے، اور اس جھُٹلانے کی وجہ اُن کی یہ سرکشی تھی کہ وہ اُس فجور کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے جس میں وہ مبتلا ہو چلے تھے، اور اُس تقویٰ کو قبول کرنا انھیں گوارا نہ تھا جس کی طرف حضرت صالحؑ انھیں دعوت دے رہے تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۶۔ ہود، آیات ۶۱-۶۲۔ الشعراء، آیات ۱۴۱ تا ۱۵۳۔ النمل، آیات ۴۵ تا ۴۹۔ القمر، آیات ۲۳ تا ۲۵۔

۹ - قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ کو چیلنج دیا تھا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔ اس پر حضرت صالحؑ نے ایک اُونٹنی کو معجزے کے طور پر ان کے سامنے حاضر کر دیا اور اُن سے کہا کہ یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، یہ زمین میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی، ایک دن سارا پانی اس کے لیے مخصوص ہوگا اور دوسرا دن تم سب کے لیے اور تمھارے جانوروں کے لیے رہے گا، اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو کہ تم پر سخت عذاب نازل ہو جائے گا۔ اِس پر وہ کچھ مدّت تک ڈرتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے اُس سب سے زیادہ شریر اور سرکش سردار کو پکارا کہ اس اُونٹنی کا قصہ تمام کر دے، اور وہ اس کام کا ذمہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ (الاعراف، آیت ۷۳۔ الشعراء، آیات ۱۵۴ تا ۱۵۶۔ القمر، آیت ۲۹)

۱۰ - سورۂ اعراف میں ہے کہ اُونٹنی کو مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ سے کہا: اب لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (آیت ۷۷)، اور سورۂ ہُود میں ہے کہ حضرت صالحؑ نے اُن سے کہا: تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کر لو، اِس کے بعد عذاب آ جائے گا، اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی۔ (آیت ۶۵)

۱۱ - یعنی اللہ دنیا کے بادشاہوں اور یہاں کی حکومتوں کے فرماں رواؤں کی طرح نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اِس اِقدام کے نتائج کیا ہوں گے۔ اُس کا اقتدار سب سے بالاتر ہے۔ اُسے اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ ثمود کی حامی کوئی ایسی طاقت ہے جو اس سے بدلہ لینے کے لیے آئے گی۔

تفہیم القرآن

الّیل

(۹۲)

الّیل

نام پہلے ہی لفظ وَ الّیْلِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اس کا مضمون سورۂ شمس سے اِس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے جسے سورۂ شمس میں ایک طریقے سے سمجھایا گیا ہے اور اِس سورہ میں دوسرے طریقے سے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے یہ سورت دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ آغاز سے آیت ۱۱ تک ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۲ سے آخر تک۔

پہلے حصّے میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد، اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی و عمل بھی کر رہے ہیں، وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اُسی طرح مختلف ہیں جس طرح دن رات سے اور نر مادہ سے مختلف ہے۔ اِس کے بعد قرآن کی مختصر سورتوں کے عام اندازِ بیان کے مطابق تین اخلاقی خُصوصیات ایک نوعیت کی، اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی و عمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لے کر بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں، جنھیں سُن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات کس طرزِ زندگی کی نمایندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی خصوصیات اُس کے برعکس کس دوسرے طرزِ زندگی کی علامات ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے چھوٹے چھوٹے خوب صورت بچے تُلے فقروں میں بیان کیے گئے ہیں کہ سنتے ہی آدمی کے دل میں اُتر جائیں اور زبان پر چڑھ جائیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے، خدا ترسی و پرہیزگاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے۔ دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بُخل کرے، خدا کی رضا اور ناراضی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھُٹلا دے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرزِ عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں ہیں، بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں، اسی قدر اِن کے نتائج بھی متضاد ہیں۔ پہلے طرزِ عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دے گا، یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور بدی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور دوسرے طرزِ عمل کو جو بھی اختیار کرے گا،

اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے بِکٹ اور سخت راستے کو سہل کر دے گا، یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔ اِس بیان کو ایک نہایت مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال جس کے پیچھے آدمی جان دیے دیتا ہے، آخر قبر میں تو اُس کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، مرنے کے بعد یہ اُس کے کس کام آئے گا؟

دوسرے حصّے میں بھی اِسی اختصار کے ساتھ تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ نے دنیا کی اِس امتحان گاہ میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُس نے یہ بتا دینا اپنے ذمّے لیا ہے کہ زندگی کے مختلف راستوں میں سے سیدھا راستہ کون سا ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اپنا رسول اور اپنی کتاب بھیج کر اُس نے اپنی یہ ذمہ داری ادا کر دی ہے، کیونکہ رسولؐ اور قرآن، دونوں ہدایت دینے کے لیے سب کے سامنے موجود تھے۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ دنیا مانگو گے تو وہ بھی اسی سے ملے گی، اور آخرت مانگو گے تو اس کا دینے والا بھی وہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمھارا اپنا کام ہے کہ تم اُس سے کیا مانگتے ہو۔ تیسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو بد بخت اُس بھلائی کو جھٹلائے گا جسے رسول اور کتاب کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، اور اُس سے منہ پھیرے گا، اُس کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار ہے۔ اور جو خدا ترس آدمی پوری بے غرضی کے ساتھ محض اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر اپنا مال راہِ خیر میں صَرف کرے گا، اس کا رب اُس سے راضی ہوگا اور اسے اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

آیاتہا ۲۱ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾

قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے، اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو، اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں[۱]۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا[۲]، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں[۳] گے۔

۱— یہ وہ بات ہے جس پر رات اور دن اور نر و مادہ کی پیدائش کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات اور دن، اور نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر دو کے آثار و نتائج باہم متضاد ہیں، اسی طرح تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوششیں صَرف کر رہے ہو، وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور اپنے نتائج کے اعتبار سے متضاد ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ یہ تمام مختلف کوششیں دو بڑی اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں۔

۲— یہ انسانی مَساعی کی ایک قسم ہے جس میں تین چیزیں شمار کی گئی ہیں، اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کُھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ بھی اللہ نے اُسے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، اور خلقِ خدا کی مدد کرنے میں صَرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور وہ اخلاق، اعمال، معاشرت، معیشت، غرض اپنی زندگی کے ہر شُعبے میں اُن کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ عقیدے میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریّت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے۔ اور اخلاق و اعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی سے بھلائیوں کا صدور محض بے شُعوری کے ساتھ کسی متعیّن نظام کے بغیر نہ ہو رہا ہو، بلکہ وہ خیر و صلاح کے اُس نظام کو صحیح تسلیم کرے جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، جو بھلائیوں کو اُن کی تمام اشکال

اور صورتوں کے ساتھ ایک نظم میں منسلک کرتا ہے، جس کا جامع نام شریعتِ الٰہیہ ہے۔

۳- یہ ہے مَساعی کی اِس قسم کا نتیجہ۔ آسان راستے سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے، جو اُس خالق کی مرضی کے مطابق ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے، جس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑکر نہیں چلنا پڑتا، جس میں انسان اپنے جسم و جان اور عقل وذہن کی قوتوں پر زبردستی کر کے اُن سے وہ کام نہیں لیتا جس کے لیے یہ طاقتیں اُس کو نہیں بخشی گئی ہیں، بلکہ وہ کام لیتا ہے جس کے لیے درحقیقت یہ اُس کو بخشی گئی ہیں، جس میں انسان کو ہر طرف اُس جنگ، مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری ہوئی زندگی میں پیش آتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے میں ہر قدم پر اس کو صلح وآشتی اور قدر ومنزلت میسّر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خَلقِ خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم، فِسق و فجور اور بدکرداری سے پاک ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راست باز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی، بدعہدی اور بے وفائی نہ کرے، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کی سیرت وکردار پر انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے، اُس کی طرف دل کھنچتے ہیں، نگاہوں میں اُس کی عزت قائم ہو جاتی ہے، اس کا اپنا قلب وضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی کسی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ نحل میں فرمائی گئی ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ ”جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، اسے ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔“ (آیت ۹۷) اور اسی بات کو سورۂ مریم میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ ”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔“ (آیت ۹۶) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سُرور ہی سُرور اور راحت ہی راحت ہے۔ اِس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ اَبَدی اور لازوال ہیں۔

اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اُسے اِس راستے پر چلنے کے لیے سہولت دیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ بھلائی کی تصدیق کر کے یہ فیصلہ کر لے گا کہ یہی راستہ میرے لائق ہے اور برائی کا راستہ میرے لائق نہیں ہے، اور جب وہ عملاً مالی ایثار اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ اُس کی یہ تصدیق سچّی ہے، تو اللہ تعالیٰ اِس راستے پر چلنا اُس کے لیے سہل کر دے گا۔ اُس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔ مالِ حرام اُس کے سامنے آئے گا تو وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ نفع کا سودا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہوگا کہ یہ آگ کا انگارا ہے جسے وہ ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ بدکاری کے مواقع اس کے سامنے آئیں گے تو وہ انھیں لطف اور لذّت حاصل کرنے کے مواقع سمجھ کر ان کی طرف نہیں لپکے گا، بلکہ جہنّم کے دروازے سمجھ کر اُن سے دُور بھاگے گا۔ نماز اُس پر گراں نہ ہوگی بلکہ اُسے چین نہیں پڑے گا جب تک وقت آنے پر وہ اس کو ادا نہ کر لے۔ زکوٰۃ دیتے ہوئے اس کا دل نہیں دُکھے گا، بلکہ اپنا مال اُسے

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾

اور جس نے بُخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا[۴]، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں[۵] گے۔ اور اُس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے[۶]؟

ناپاک محسوس ہوگا جب تک وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال نہ دے۔ غرض ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو اِس راستے پر چلنے کی توفیق وتائید ملے گی، حالات کو اُس کے لیے سازگار بنایا جائے گا، اور اُس کی مدد کی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس سے پہلے سورۂ بَلَد میں اِسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے، اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ اِن دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے، جس پر چڑھنے کے لیے اُسے اپنے نفس کی خواہشوں سے، اپنے دنیا پرست اہل وعیال سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے، اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر ایک اِس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کر کے اُس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے اور اپنا مال راہِ خدا میں دے کر اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کر کے عملاً اِس عزم کو پختہ کر لیتا ہے تو اِس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لُڑھکنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

۴ - یہ انسانی مَساعی کی دوسری قسم ہے جو اپنے ہر جُز میں پہلی قسم کے ہر جُز سے مختلف ہے۔ بُخل سے مراد محض وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اُس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیا جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اُوپر خرچ کرتا ہے نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اِس جگہ بُخل سے مراد راہِ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صَرف نہ کرنا ہے، اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش وآرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال لُٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام ونمود، حُکّام رسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادّی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ ودَو اور محنت وکوشش کا مقصود بنالے اور خدا سے بالکل مُستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جُھٹلانا، تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے، اس لیے اس کی تشریح کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھلائی کی تصدیق کا مطلب ہم واضح کر چکے ہیں۔

۵ - اِس راستے کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اِس پر چلنے والا اگرچہ مادّی فائدوں اور دنیوی لذّتوں اور ظاہری کامیابیوں

کے لالچ میں اس کی طرف جاتا ہے، لیکن اِس میں ہر وقت اپنی فطرت سے، اپنے ضمیر سے، خالقِ کائنات کے بنائے ہوئے قوانین سے، اور اپنے گردوپیش کے معاشرے سے اُس کی جنگ برپا رہتی ہے۔ صداقت، دیانت، امانت، شرافت اور عفت و عصمت کی اخلاقی حدوں کو توڑ کر جب وہ ہر طریقے سے اپنی اغراض اور خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس کی ذات سے خلقِ خدا کو بھلائی کے بجائے برائی ہی پہنچتی ہے، اور جب وہ دوسروں کے حقوق اور ان کی عزتوں پر دست درازیاں کرتا ہے، تو اپنی نگاہ میں وہ خود ذلیل وخوار ہوتا ہے اور جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اُس سے بھی قدم قدم پر لڑ کر اُسے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کمزور ہو تو اِس رَوِش کی بدولت اُسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں، اور اگر وہ مال دار، طاقت ور اور بااثر ہو، تو چاہے دنیا اُس کے زور کے آگے دب جائے، لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی، عزت اور محبّت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا، حتّٰی کہ اس کے شریکِ کار بھی اُس کو ایک خبیث آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف افراد ہی تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ور قومیں بھی جب اخلاق کے حدود پھاند کر اپنی طاقت اور دولت کے زُعم میں بدکرداری کا رَوِیّہ اختیار کرتی ہیں، تو ایک طرف باہر کی دنیا اُن کی دشمن ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف خود اُن کا اپنا معاشرہ جرائم، خودکشی، نشہ بازی، امراضِ خبیثہ، خاندانی زندگی کی تباہی، نوجوان نسلوں کی بدراہی، طبقاتی کشمکش، اور ظلم و جَور کی روز افزوں وبا سے دوچار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بامِ عُروج سے گرتی ہیں تو دنیا کی تاریخ میں اپنے لیے لعنت اور پھٹکار کے سوا کوئی مقام چھوڑ کر نہیں جاتیں۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے، اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی، بُرائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جائیں گے، اُسی کے اسباب اور وسائل اس کے لیے فراہم کر دیے جائیں گے، بدی کرنا اس کے لیے آسان ہوگا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے دوسری جگہ قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصوُّر کرتے ہی اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے) جیسے اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔" (الانعام، آیت ۱۲۵) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے: "بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر فرماں بردار بندوں کے لیے نہیں۔" (البقرہ، آیت ۴۶) اور منافقین کے متعلق فرمایا: "وہ نماز کی طرف آتے بھی ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے بھی ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔" (التوبہ، آیت ۵۴) اور یہ کہ "ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اُسے اپنے اُوپر زبردستی کی چٹّی سمجھتے ہیں۔" (التوبہ، آیت ۹۸)

۶ــ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ایک روز اُسے بہرحال مرنا ہے اور وہ سب کچھ دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے جسے اُس نے یہاں اپنے عیش کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگر اپنی آخرت کے لیے کچھ کما کر وہ ساتھ نہ لے گیا تو یہ مال اس کے کس کام آئے گا؟ قبر میں تو وہ کوئی کوٹھی، کوئی موٹر، کوئی جائداد اور کوئی جمع پونجی لے کر نہیں جائے گا۔

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿١٣﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿١٤﴾ لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾

ع ۲۱

بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمّے ہے[7]، اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں[8]۔ پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اُس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جُھٹلایا اور مُنہ پھیرا۔ اور اُس سے دُور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے[9]۔ اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے[10]۔ اور ضرور وہ (اُس سے) خوش ہوگا[11]۔ ع

۷ – یعنی انسان کا خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اِس بات کا ذمّہ لیا ہے کہ اُس کو دنیا میں بے خبر نہ چھوڑے، بلکہ اسے یہ بتادے کہ راہِ راست کون سی ہے اور غلط راہیں کون سی، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، حلال کیا ہے اور حرام کیا، کون سی رَوِش اختیار کر کے وہ فرماں بردار بندہ بنے گا اور کون سا رویّہ اختیار کر کے بندۂ نافرمان بن جائے گا۔ یہی بات ہے جسے سورۂ نحل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ۔ (آیت ۹) ”اور اللہ ہی کے ذمے ہے سیدھا راستہ بتانا، جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔“ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹)

۸ – اس ارشاد کے کئی مفہوم ہیں اور وہ سب صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا سے آخرت تک تم کہیں بھی ہماری گرفت سے باہر نہیں ہو، کیونکہ دونوں جہانوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری ملکیّت دنیا اور آخرت دونوں پر بہرحال قائم ہے، خواہ تم ہماری بتائی ہوئی راہ پر چلو یا نہ چلو۔ گمراہی اختیار کرو گے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑو گے، اپنا ہی نقصان کر لو گے، اور راہِ راست اختیار کرو گے تو ہمیں کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے، خود ہی اس کا نفع اٹھاؤ گے۔ تمھاری نافرمانی سے ہماری مِلک میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی، اور تمھاری فرماں برداری سے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرے یہ کہ دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ دنیا چاہو گے

تو وہ بھی ہم ہی سے تمھیں ملے گی، اور آخرت کی بھلائی چاہو گے تو اُس کا دینا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۵ میں فرمائی گئی ہے کہ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ ''جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں سے دیں گے۔'' اور اسی کو سورۂ شوریٰ، آیت ۲۰ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔ ''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔'' (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۳۷)

۹- اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نہایت شَقی کے سوا کوئی آگ میں نہ جائے گا اور نہایت مُتّقی کے سوا کوئی اس سے نہ بچے گا۔ بلکہ یہاں مقصود دو انتہائی متضاد کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر کے ان کا انتہائی متضاد انجام بیان کرنا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو جُھٹلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیر لے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر، صرف اس لیے اپنا مال راہِ خدا میں صَرف کرے کہ وہ اللہ کے ہاں پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے۔ یہ دونوں کردار اُس وقت مکہ کے معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے۔ اس لیے کسی کا نام لیے بغیر لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جہنّم کی آگ میں دوسرے کردار والا نہیں بلکہ پہلے کردار والا ہی جُھلسے گا، اور اُس آگ سے پہلے کردار والا نہیں بلکہ دوسرے کردار والا ہی دُور رکھا جائے گا۔

۱۰- یہ اُس پرہیزگار آدمی کے خُلوص کی مزید توضیح ہے کہ وہ اپنا مال جن لوگوں پر صَرف کرتا ہے، اُن کا کوئی احسان پہلے سے اُس پر نہ تھا کہ وہ اُس کا بدلہ چُکانے کے لیے، یا آیندہ اُن سے مزید فائدہ اُٹھانے کے لیے اُن کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور اُن کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے رَبِّ برتر کی رضاجوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اُس پر کوئی احسان تھا، نہ آیندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ اِس کی بہترین مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہے کہ مکّۂ معظّمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قُبول کیا تھا اور اِس قصور میں جن کے مالک اُن پر بے تحاشا ظلم توڑ رہے تھے، اُن کو خرید خرید کر وہ آزاد کر دیتے تھے تاکہ وہ اُن کے ظلم سے بچ جائیں۔ ابنِ جَریر اور ابنِ عَساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زُبیر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح اِن غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیا خرچ کرتے دیکھ کر اُن کے والد نے اُن سے کہا کہ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیا خرچ کرتے تو وہ تمھارے لیے قوتِ بازو بنتے۔ اس پر حضرت ابوبکر نے اُن سے کہا: ای ابہ انما ارید ما عند اللہ، ''ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔''

۱۱- اس آیت کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ ضرور اللہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ عنقریب اللہ اس شخص کو اِتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

تفہیم القرآن

الضُّحیٰ

(۹۳)

الضُّحیٰ

نام پہلے ہی لفظ وَالضُّحٰی کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ مکّۂ معظمہ کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ رِوایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدّت تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا تھا، جس سے حضوؐر سخت پریشان ہو گئے تھے اور بار بار آپؐ کو یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ کسی ناراضی کی بنا پر نہیں روکا گیا تھا، بلکہ اس میں وہی مَصْلَحت کارفرما تھی جو روزِ روشن کے بعد رات کا سکون طاری کرنے میں کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی تیز روشنی اگر آپؐ پر برابر پڑتی رہتی تو آپؐ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکتے، اس لیے بیچ میں وقفہ دیا گیا، تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ یہ کیفیت حضوؐر پر نبوت کے ابتدائی دَور میں گزرتی تھی، جب کہ ابھی آپؐ کو وحی کے نزول کی شدّت برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی، اِس بنا پر بیچ بیچ میں وقفہ دینا ضروری ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ مُدَّثِّر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اور سورۂ مُزّمّل، حاشیہ ۵ میں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کا کس قدر شدید بار آپؐ کے اعصاب پر پڑتا تھا۔ بعد میں جب حضوؐر کے اندر اس بار کو برداشت کرنے کا تحمّل پیدا ہو گیا تو طویل وقفے دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپؐ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دَور میں جن شدید مشکلات سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپؐ پر اپنی عطا و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپؐ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی اُن صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت کہیں دُور دُور بھی اِس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے،

اُسے اتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمھیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہوگئی کہ ہم نے تمھیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہوگئے ہیں۔ ہم تو تمھارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمھاری پرورش اور خبرگیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمھیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمھیں مال دار بنایا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمھارے شاملِ حال ہے۔ اس مقام پر سورۂ طٰہٰ، آیات ۳۷ تا ۴۲ کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون جیسے جبّار کے مقابلے میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی پریشانی دُور کرنے کے لیے انھیں بتایا ہے کہ کس طرح تمھاری پیدائش کے وقت سے ہماری مہربانیاں تمھارے شاملِ حال رہی ہیں، اس لیے تم اطمینان رکھو کہ اس خوفناک مہم میں تم اکیلے نہ ہوگے بلکہ ہمارا فضل تمھارے ساتھ ہوگا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ جو احسانات ہم نے تم پر کیے ہیں، ان کے جواب میں خلقِ خدا کے ساتھ تمھارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اور ہماری نعمتوں کا شکر تمھیں کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

---

۱۱ اٰیاتہا
۱ رکوعاتہا

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الضُّحٰى ۝۱ وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى ۝۳ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵

قسم ہے روزِ روشن کی[1] اور رات کی جب کہ وہ سُکون کے ساتھ طاری ہو جائے[2] (اے نبیؐ!) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔[3] اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے،[4] اور عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔[5]

۱ – یہاں لفظ ضُحٰی رات کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے اِس سے مراد روزِ روشن ہے۔ اِس کی نظیر سورۂ اَعراف کی یہ آیات ہیں: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ۝ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۷-۹۸) ”کیا بستیوں کے لوگ اِس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آ جائے، جب کہ وہ سو رہے ہوں؟ اور کیا بستیوں کے لوگ اِس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دہاڑے آ جائے، جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟“ اِن آیات میں بھی چونکہ ضُحٰی کا لفظ رات کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، اس لیے اس سے مراد چاشت کا وقت نہیں بلکہ دن ہے۔

۲ – اصل میں رات کے لیے لفظ سَجٰی استعمال ہوا ہے، جس میں صرف تاریکی چھا جانے ہی کا نہیں بلکہ سکوت اور سکون طاری ہو جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ رات کی اِس صفت کا اُس مضمون سے گہرا تعلق ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۳ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا تھا۔ مختلف روایات میں یہ مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابنِ جُریج نے ۱۲ روز، کَلْبی نے ۱۵ روز، ابنِ عباسؓ نے ۲۵ روز، سُدِّی اور مُقاتِل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہرحال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِس پر سخت غمگین ہو گئے تھے اور مخالفین بھی آپؐ کو طعنے دینے لگے تھے، کیونکہ حضورؐ پر جو نئی سورت نازل ہوتی تھی اسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپؐ نے کوئی نئی وحی لوگوں کو نہیں سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُندُب بن عبداللہ البَجَلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ (ابنِ جریر، طَبَرانی، عبد بن حُمَید، سعید بن منصور، ابنِ مَرْدُوْیَہ) دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل نے، جو حضورؐ کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضورؐ کے مکان سے متّصل تھا، آپؐ سے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا

ہے۔" عَوْفی اور ابنِ جَرِیر نے ابنِ عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریلؑ کی آمد رُک جانے سے حضورؐ پریشان ہوگئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہوگیا ہے اور اس نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ قَتَادَہ اور ضَحّاک کی مُرسَل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اِس صورتِ حال میں حضورؐ کے شدید رنج وغم کا حال بھی متعدّد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ محبوب کی طرف سے بظاہر عَدَمِ التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعۂ طاقت سے بظاہر محرومی جو اس جاں گُسل کش مکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اُس پر مزید دشمنوں کی شَماتت، یہ ساری چیزیں مل جُل کر لامحالہ حضورؐ کے لیے سخت پریشانی کی مُوجب ہو رہی ہوں گی اور آپؐ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہوگیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہوگیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اِس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

اِسی کیفیّت میں یہ سورت حضورؐ کو تسلّی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ اِس میں دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قَسَم کھا کر حضورؐ سے فرمایا گیا کہ تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑ دیا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ اِس بات پر ان دونوں چیزوں کی قَسَم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت اُن سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مَصْلَحَت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اُسی طرح تم پر کبھی وحی بھیجنا اور کبھی اُس کو روک لینا بھی حکمت و مَصْلَحَت کی بنا پر ہے، اِس کا کوئی تعلق اِس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے، اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مناسبت اِس مضمون سے اِس قَسَم کی یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے، اس لیے ایک وقتِ خاص تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے، اُسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمھارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اس لیے وقتاً فوقتاً فَتْرَة (نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے) کا ایک زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے مَصلَحت کی بنا پر رکھا ہے، تاکہ وحی کے نزول سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمھیں سکون حاصل ہو جائے۔ گویا آفتابِ وحی کا طُلوع بمنزلۂ روزِ روشن ہے اور زمانۂ فَتْرَة بمنزلۂ سکونِ شب۔

۴- یہ خوش خبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جب کہ چند مٹھی بھر آدمی آپؐ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپؐ کی مخالف تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے، اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹمٹما رہی تھی اور اسے بُجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپؐ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپؐ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپؐ کی قوت، آپؐ کی عزت وشوکت اور آپؐ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپؐ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، اِس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپؐ کو ملے گا، وہ اُس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷

کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟[۶] اور تمھیں ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔[۷]

دنیا میں آپؐ کو حاصل ہوگا۔ طَبَرانی نے اَوسط میں اور بَیہقی نے دلائل میں ابنِ عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمّت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اِس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمھارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔''

۵ - یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمھارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اِس طرح پورا ہوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحرِ احمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہوگیا، عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہوگئی، جو طاقت بھی اِس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے وہ پورا ملک گونج اُٹھا جس میں مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دَم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جُھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخّر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہوگیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اِس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اِس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اِس طاقت کے ساتھ اُٹھی کہ ایشیا، افریقا اور یورپ کے ایک بڑے حصّے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصوّر بھی کوئی نہیں کرسکتا۔ (نیز دیکھو، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۲)

۶ - یعنی تمھیں چھوڑ دینے اور تم سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اُس وقت سے تم پر مہربان ہیں جب تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔ حضورؐ ابھی بطنِ مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپؐ کے والدِ ماجد کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے آپؐ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپؐ کو بے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ آپؐ کی پرورش کرتی رہیں۔ ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو ۸ سال کی عمر تک آپؐ کے جدِّ امجد نے آپؐ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپؐ سے غیر معمولی محبّت تھی بلکہ اُن کو آپؐ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ اُن کا بھی انتقال ہوگیا تو آپؐ کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپؐ کی کفالت اپنے ذمّے لی اور آپؐ کے ساتھ ایسی محبّت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کرسکتا، حتّٰی کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپؐ کی دشمن ہوگئی تھی، اس وقت دس سال تک وہی آپؐ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔

۷ - اصل میں لفظ ضَآلًّا استعمال ہوا ہے، جو ضلالت سے ہے۔ عَرَبی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنٰی گمراہی کے ہیں۔ دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران کھڑا ہو کہ

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱ ع

ع ۱۸

اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔[8] لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو،[9] اور سائل کو نہ جھڑکو،[10] اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔[11] ع

مختلف راستے جو سامنے ہیں اِن میں سے کدھر جاؤں۔ ایک اور معنی کھوئے ہوئے کے ہیں، چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں: ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ، پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ اُس درخت کو بھی عربی میں ضَالّہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔ غفلت کے لیے بھی ضلال کا لفظ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ خود قرآنِ مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ (طٰہٰ: ۵۲) ''میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے۔'' اِن مختلف معنوں میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے، کیونکہ بچپن سے قبلِ نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں، ان میں کہیں اِس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپؐ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں، یا جاہلیت کے جو اعمال، رُسوم اور طور طریقے آپؐ کی قوم میں پائے جاتے تھے اُن میں سے کسی میں آپؐ مُلَوَّث ہوئے ہوں۔ اس لیے لامحالہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا۔ البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں۔ نبوت سے پہلے حضورؐ، اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کے قائل تو ضرور تھے، اور آپؐ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائلِ اخلاق سے آراستہ بھی تھی، لیکن آپؐ کو دینِ حق اور اس کے اُصول اور احکام کا علم نہ تھا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ، آیت ۵۲) ''تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی تمھیں کوئی خبر تھی۔'' یہ معنی بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ حضورؐ ایک جاہلی معاشرے میں گُم ہو کر رہ گئے تھے اور ایک ہادی و رہبر ہونے کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہو رہی تھی۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جاہلیّت کے صحرا میں آپؐ ایک اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے، جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کر دینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آ رہی تھی۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپؐ کو عطا کی تھیں، وہ جاہلیّت کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو رہی تھیں۔ ضلال کو غفلت کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے، یعنی آپؐ اُن حقائق اور عُلوم سے غافل تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو آگاہ فرمایا۔ یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف: ۳) ''اور اگرچہ تم اِس سے پہلے اِن باتوں سے غافل تھے۔'' (نیز مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۲۸۲، اور الشعراء، آیت ۲۰)

۸ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپؐ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اُونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔

اس طرح آپؐ کی زندگی کی ابتدا اِفلاس کی حالت میں ہوئی تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ قُریش کی سب سے زیادہ مال دار خاتون، حضرت خَدِیجہؓ نے پہلے تجارت میں آپؐ کو اپنے ساتھ شریک کیا، اس کے بعد انھوں نے آپؐ سے شادی کر لی اور ان کے تمام تجارتی کاروبار کو آپؐ نے سنبھال لیا۔ اس طرح آپؐ نہ صرف یہ کہ مال دار ہو گئے، بلکہ آپؐ کی مال داری اِس نوعیت کی نہ تھی کہ محض بیوی کے مال پر آپؐ کا انحصار ہو۔ ان کی تجارت کو فروغ دینے میں آپؐ کی اپنی محنت و قابلیت کا بڑا حصّہ تھا۔

۹- یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو، اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمھاری دستگیری کی، اس لیے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ تمھارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

۱۰- اِس کے دو معنیٰ ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنیٰ میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی مدد کر سکتے ہو تو کر دو، نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دو، مگر بہر حال اُسے جھڑکو نہیں۔ اِس معنیٰ کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم نادار تھے، پھر اُس نے تمھیں مال دار کر دیا۔" اور اگر سائل کو پوچھنے والے، یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنیٰ میں لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو، اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے یا اپنے ذہن کی اُلجھن پیش کرے، بہر حال شفقت کے ساتھ اُسے جواب دو اور علم کا زُعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اُسے جھڑک کر دُور نہ بھگا دو۔ اِس معنیٰ کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم ناواقفِ راہ تھے، پھر اُس نے تمھیں ہدایت بخشی۔" حضرت ابو الدَّرداءؓ، حَسَن بصریؒ، سُفیانؒ ثَوری اور بعض دوسرے بزرگوں نے اِسی دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ترتیبِ کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے جواب میں آتا ہے۔

۱۱- نعمت کا لفظ عام ہے، جس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ پاک کو عطا فرمائی تھیں، اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اُس نے اپنے اُن وعدوں کے مطابق آپؐ کو عطا کیں جو اِس سورہ میں اُس نے کیے تھے اور جن کو اُس نے بدرجۂ اَتَم پورا کیا۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبیؐ! ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے، اُس کا ذکر اور اُس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ نعمتوں کے ذکر و اظہار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک خاص صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اِس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں، یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہیں، ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمتِ نبوّت کا اظہار اِس طریقے سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمتِ قرآن کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ اُس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمتِ ہدایت کا اظہار اِس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور تُرشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں دستگیری کا جو احسان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ یتیموں کے ساتھ ویسے ہی احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مال دار بنا دینے کا جو احسان اللہ نے کیا، اس کا اظہار یہی صورت چاہتا ہے کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ غرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر سے فقرے میں اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

تفہیم القرآن

الم نشرح

(۹۴)

اَلَم نَشْرَحْ

نام پہلے ہی فقرے کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کا مضمون سورۂ ضُحیٰ سے اس قدر ملتا جُلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے اور ایک جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مکّۂ معظمہ میں والضُّحیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا مقصد و مُدّعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ نبوّت سے پہلے حضورؐ کو کبھی اُن حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جن کا سامنا نبوّت کے بعد دعوتِ اسلامی کا آغاز کرتے ہی یکایک آپؐ کو کرنا پڑا۔ یہ خود آپؐ کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم تھا، جس کا کوئی اندازہ آپؐ کو قبلِ نبوت کی زندگی میں نہ تھا۔ اسلام کی تبلیغ آپؐ نے کیا شروع کی کہ دیکھتے دیکھتے وہی معاشرہ آپؐ کا دشمن ہوگیا جس میں آپؐ پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہی رشتہ دار، دوست، اہلِ قبیلہ اور اہلِ محلّہ آپؐ کو گالیاں دینے لگے جو پہلے آپؐ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مکہ میں کوئی آپؐ کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ راہ چلتے آپؐ پر آوازے کسے جانے لگے۔ قدم قدم پر آپؐ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ آپؐ کو اِن حالات، بلکہ اِن سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی، لیکن ابتدائی زمانہ آپؐ کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ اِسی بنا پر آپؐ کو تسلی دینے کے لیے پہلے سورۂ ضُحیٰ نازل کی گئی اور پھر اِس سورت کا نزول ہوا۔

اِس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپؐ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپؐ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں، جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں۔ ایک، شرحِ صدر کی نعمت۔ دوسری، یہ نعمت کہ آپؐ کے اُوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو نبوت سے پہلے آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ تیسری، رفعِ ذکر کی نعمت، جو آپؐ سے بڑھ کر تو درکنار، آپؐ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔ آگے چل کر ہم نے اپنے حواشی میں وضاحت کر دی ہے کہ اِن تینوں نعمتوں سے مراد کیا ہے اور یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

اِس کے بعد ربِّ کائنات اپنے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور، جس سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، کوئی بہت لمبا دَور نہیں ہے، بلکہ اِس تنگی کے ساتھ ہی ساتھ

فراخی کا دَور بھی لگا چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ ضُحیٰ میں اس طرح فرمائی گئی تھی کہ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہو گا اور عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپؐ کا دل خوش ہو جائے گا۔

آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ابتدائی دَور کی اِن سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپؐ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہو گی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپؐ فارغ ہوں تو عبادت کی مشقّت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لَو لگائیں۔ یہ وہی ہدایت ہے جو زیادہ تفصیل کے ساتھ حضوؐر کو سورۂ مُزّمّل، آیات ۱ تا ۹ میں دی گئی ہے۔

آیاتہا ۸ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ﴿۷﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾ ع

(اے نبیؐ!) کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا[1]؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمھاری کمر توڑے ڈال رہا تھا[2]۔ اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا[3]۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے[4]۔ لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقّت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو[5]۔ ع

۱- اِس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دَور میں آپؐ کو پیش آ رہی تھیں۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کر کے تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبیؐ! کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآنِ مجید میں جن مواقع پر آیا ہے، ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنیٰ ہیں:

(۱) سورۂ انعام، آیت ۱۲۵ میں فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، ''پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے''۔ اور سورۂ زُمَر، آیت ۲۲ میں فرمایا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ ''تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو، پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو......'' اِن دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردُّد سے پاک ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اُصولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن، اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

(۲) سورۂ شُعَراء، آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصبِ عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انھوں نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّكَذِّبُوۡنِ ؕ وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ، ''میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے''۔ اور سورۂ طٰہٰ، آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ۙ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۙ، ''میرے رب! میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔'' یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوّت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تنِ تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکّر لینے کی آدمی کو ہمّت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تامُّل نہ ہو، اور نبوّت کی عظیم ذمّہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنٰی مراد ہیں۔ پہلے معنٰی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حَنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارُم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)، لیکن آپؐ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپؐ سخت ذہنی خَلجان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس خَلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپؐ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے اِس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اُولُوا العزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اس منصبِ عظیم کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیّت رکھتی تھی۔ آپؐ اِس قابل ہو گئے کہ جاہلیّت میں مُستغرِق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اَکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہراً کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر، اسلام کے عَلَم بردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں، اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپؐ کو اپنے مَوقِف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرحِ صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپؐ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اِس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں۔

بعض مفسّرین نے شرحِ صدر کو شَقِّ صدر کے معنٰی میں لیا ہے اور اس آیت کو اس معجزۂ شَقِّ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شَقِّ صدر کے معنٰی

میں نہیں لیا جاسکتا۔ علامۂ آلوسی رُوح المعانی میں فرماتے ہیں کہ **حمل الشرح فی الاٰیۃ علٰی شق الصدر ضعیف عند المحققین۔** ’’محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شَقِّ صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے۔‘‘

۲– مفسرین میں سے بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوّت سے پہلے ایّامِ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ قصور ایسے ہوگئے تھے جن کی فکر آپؐ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطمئن کر دیا کہ آپ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنیٰ لینا سخت غلطی ہے۔ اوّل تو لفظ وِزْر کے معنیٰ لازماً گناہ ہی کے نہیں ہیں، بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بُرے معنیٰ میں لیا جائے۔ دوسرے حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کو مخاطب کر کے یہ کہلوایا گیا کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ** ’’میں اِس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔‘‘ (یونس، آیت ۱۶) اور حضورؐ اِس کردار کے انسان بھی نہ تھے کہ لوگوں سے چھُپ کر آپؐ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ! اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اُس سے ناواقف نہ ہوسکتا تھا کہ جو شخص کوئی چھُپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوئے ہوتا، اُس سے خلقِ خدا کے سامنے برملا وہ بات کہوا تا جو سورۂ یونس کی مذکورۂ بالا آیت میں اس نے کہلوائی ہے۔ پس درحقیقت اِس آیت میں وِزْر کے صحیح معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں، اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حسّاس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اَوہام و رُسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پِس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے، اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ کُڑھتے تھے، مگر اِس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہوگیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہِ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قُفل کھولا جاسکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپؐ پوری طرح مطمئن ہوگئے کہ اِس ذریعے سے آپؐ نہ صرف عرب، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔

۳– یہ بات اُس زمانے میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فردِ فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہرِ مکہ تک محدود ہیں، اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقے سے اس کو پورا کیا۔ سب سے پہلے آپؐ کے رفعِ ذِکر کا کام اُس نے خود آپؐ کے دشمنوں سے لیا۔ کفارِ مکہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار

کیے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر، جب تمام عرب سے لوگ کھنچ کھنچ کر اُن کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانے میں کفّار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ بیٹے، بھائی بھائی، اور شوہر اور بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے، اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ اُن سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں مکہ آتے تھے۔ اِس طرح اگرچہ وہ حضورؐ کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپؐ کا نام پہنچ گیا اور مکہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اُس کے ”جادو“ سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے ”جادو“ کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفارِ مکہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا، لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اِس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سنا اور انھیں پتا چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپؐ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر مختلف ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتّٰی کہ ہجرت کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا، جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیّبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مُساوات، مال داروں کی فیّاضی، غریبوں کی خبرگیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخّر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعے سے حضورؐ کے اِس بڑھتے ہوئے اثر کو مٹانے کی کوشش کی، مگر آپؐ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حُدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ ۱۰ سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپؐ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صدا سے گونج اُٹھا۔ پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافتِ راشدہ کے دور سے ہوا جب آپؐ کا نامِ مبارک تمام رُوئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے، اور اِن شاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآوازِ بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپؐ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے

کوئی دن، اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب رُوئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضوؐر کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کُھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دَور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اُس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفعِ ذکر اِس شان سے اور اِتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ حدیث میں حضرت ابوسعید خُدرِیؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا: میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمھارا رفعِ ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا: اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمھارا بھی ذکر کیا جائے گا۔'' (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، مُسنَدِ ابو یَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ حِبّان، ابنِ مَردُوْیَہ، ابونُعَیم) بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بحرف پوری ہوئی۔

۴ – اس بات کو دو مرتبہ دُہرایا گیا ہے تاکہ حضوؐر کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپؐ اِس وقت گزر رہے ہیں، یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی میں اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنیٰ میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دَور اِس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔

۵ – فارغ ہونے سے مراد اپنے مشاغل سے فارغ ہونا ہے، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے مشاغل ہوں، یا اسلام قُبول کرنے والوں کی تعلیم وتربیَت کے مشاغل، یا اپنے گھر بار اور دنیوی کاموں کے مشاغل۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی اور مشغولیّت نہ رہے تو اپنا فارغ وقت عبادت کی ریاضت ومَشقّت میں صَرف کرو اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

تفہیم القرآن

التّین

(۹۵)

التّین

نام

پہلے ہی لفظ التِّیْنِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

قَتَادَہؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے۔ ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ یہ مکّی ہے، اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور علما اسے مکی ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے مکی ہونے کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ اس میں شہرِ مکہ کے لیے هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (یہ پُر امن شہر) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا نزول مدینہ میں ہوا ہوتا تو مکہ کے لیے "یہ شہر" کہنا صحیح نہیں ہوسکتا تھا۔ علاوہ بریں سورت کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے بھی ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، کیونکہ اِس میں کوئی نشان اِس امر کا نہیں پایا جاتا کہ اس کے نُزول کے وقت کفر و اسلام کی کش مکش برپا ہو چکی تھی، اور اِس کے اندر مکی دَور کی ابتدائی سورتوں کا وہی اندازِ بیان پایا جاتا ہے جس میں نہایت مختصر اور دل نشین طریقے سے لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا ضروری اور سراسر معقول ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع ہے جزا و سزا کا اثبات۔ اِس غرض کے لیے سب سے پہلے جلیل القدر انبیاؑ کے مقاماتِ ظُہور کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اگرچہ اِس حقیقت کو دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً: کہیں فرمایا کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ (البقرہ ۳۰-۳۴، الانعام ۱۶۵، الاعراف ۱۱، الحجر ۲۸-۲۹، النمل ۶۲، صٓ ۷۱ تا ۷۳) کہیں فرمایا کہ انسان اس امانتِ الٰہی کا حامل ہوا ہے جسے اٹھانے کی طاقت زمین و آسمان اور پہاڑوں میں بھی نہ تھی۔ (الاحزاب: ۷۲) کہیں فرمایا کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی۔ (بنی اسرائیل: ۷۰) لیکن یہاں خاص طور پر انبیاؑ کے مقاماتِ ظُہور کی قسم کھا کر یہ فرمانا کہ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے، یہ معنٰی رکھتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اِتنی بہتر ساخت عطا کی گئی کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے، جس سے اُونچا منصب خدا کی کسی دوسری مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں: ایک، وہ جو اِس بہترین ساخت پر پیدا ہونے کے بعد بُرائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اُس انتہا کو پہنچ جاتے ہیں

جہاں اُن سے زیادہ نیچ کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی۔ دوسرے، وہ جو ایمان وعملِ صالح کا راستہ اختیار کر کے اِس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں، اور اُس مقامِ بلند پر قائم رہتے ہیں جو اُن کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نوعِ انسانی میں اِن دونوں قسموں کے لوگوں کا پایا جانا ایک ایسا امرِ واقعی ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کا مشاہدہ انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

آخر میں اِس امرِ واقعی سے یہ اِستدلال کیا گیا ہے کہ جب انسانوں میں یہ دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں تو پھر جزائے اعمال کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی اجر نہ ملے، اور انجامِ کار دونوں کا یکساں ہو، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کوئی انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت اور انسان کی عقلِ عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ، جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ انصاف نہیں کرے گا۔

---

۸ آیاتھا — رکوعاتھا ۱

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ﴿۲﴾ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ﴿۳﴾

قسم ہے انجیر اور زیتون کی[1] اور طورِ سینا[2] اور اِس پُرامن شہر (مکہ) کی،

۱- اِس کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ حَسَن بصری، عِکْرِمَہ، عطا بن ابی رَباح، جابر بن زید، مُجاہد اور ابراہیم نَخَعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں، اور زیتون بھی یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ابنِ ابی حاتم اور حاکم نے ایک قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِس کی تائید میں نقل کیا ہے۔ اور جن مفسّرین نے اِس تفسیر کو قبول کیا ہے، انھوں نے انجیر اور زیتون کے خواص اور فوائد بیان کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِنھی خوبیوں کی وجہ سے اِن دونوں پھلوں کی قسم کھائی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ایک عام عَرَبی داں تین اور زیتون کے الفاظ سُن کر وہی معنیٰ لے گا جو عربی زبان میں معروف ہیں۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنیٰ لینے میں مانع ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طورِ سینا اور شہرِ مکہ کی قسم کھائی گئی ہے، اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے اِن چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اُس پر طورِ سینا اور شہرِ مکہ تو دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ دو پھل اُس پر دلالت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں جہاں بھی کسی چیز کی قسم کھائی ہے، اُس کی عظمت یا اس کے مَنافِع کی بنا پر نہیں کھائی، بلکہ ہر قسم اُس مضمون پر دلالت کرتی ہے جو قسم کھانے کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اِن دونوں پھلوں کے خواص کو وجہِ قسم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بعض دوسرے مفسرین نے تین اور زیتون سے مراد بعض مقامات لیے ہیں۔ کَعْب اَحبار، قَتَادَہ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ تین سے مراد دِمَشق ہے اور زیتون سے مراد بیت المَقْدِس۔ ابنِ عباسؓ کا ایک قول ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے یہ نقل کیا ہے کہ تین سے مراد حضرت نوحؑ کی وہ مسجد ہے جو انھوں نے جُودی پہاڑ پر بنائی تھی، اور زیتون سے مراد بیت المَقْدِس ہے۔ لیکن وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ کے الفاظ سُن کر یہ معنیٰ ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے، اور نہ یہ بات قرآن کے مخاطب اہلِ عرب میں معروف تھی کہ تین اور زیتون اِن مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریقہ اہلِ عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو، اُس علاقے کو وہ بسا اوقات اُس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اِس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب منابتِ تین و زیتون، یعنی اِن پھلوں کی پیداوار کا علاقہ ہوسکتا ہے، اور وہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے، کیونکہ اُس زمانے کے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۟ؗ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۟ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا[۳]، پھر اُسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا[۴]، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے

اہلِ عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ ابنِ تیمیّہ، ابن القیم، زمخشری اور آلوسی رحمہم اللہ نے اِسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اور ابنِ جریر نے بھی اگرچہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے، مگر اِس کے ساتھ یہ بات تسلیم کی ہے کہ تین و زیتون سے مراد اِن پھلوں کی پیداوار کا علاقہ بھی ہو سکتا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر نے بھی اس تفسیر کو قابلِ لحاظ سمجھا ہے۔

۲- اصل میں طُوْرِ سِیْنِیْنَ فرمایا گیا ہے۔ سینین جزیرہ نمائے سینا کا دوسرا نام ہے۔ اس کو سِینا یا سِینا بھی کہتے ہیں اور سِینین بھی۔ خود قرآن میں ایک جگہ طُوْرِ سَیْنَآءَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اب چونکہ وہ علاقہ، جس میں کوہِ طور واقع ہے، سینا ہی کے نام سے مشہور ہے، اس لیے ہم نے ترجمے میں اس کا یہی مشہور نام درج کیا ہے۔

۳- یہ ہے وہ بات جس پر انجیر و زیتون کے علاقے یعنی شام و فلسطین اور کوہِ طور اور مکہ کے پُر امن شہر کی قسم کھائی گئی ہے۔ انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی دوسری جان دار مخلوق کو نہیں دیا گیا، اور اُسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔ پھر چونکہ نوعِ انسانی کے اِس فضل و کمال کا سب سے زیادہ بلند نمونہ انبیا علیہم السلام ہیں اور کسی مخلوق کے لیے اِس سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُسے منصبِ نبوّت عطا کرنے کے لیے منتخب فرمائے، اس لیے انسان کے اَحْسَنِ تَقْوِیْم پر ہونے کی شہادت میں اُن مقامات کی قسم کھائی گئی ہے جو خدا کے پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں۔ شام و فلسطین کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بکثرت انبیاؑ مبعوث ہوئے۔ کوہِ طور وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی۔ رہا مکہ معظمہ، تو اس کی بنا ہی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں پڑی، انھی کی بدولت وہ عرب کا مقدس ترین مرکزی شہر بنا، حضرت ابراہیمؑ ہی نے یہ دُعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، ''اے میرے رب! اِس کو ایک پُر امن شہر بنا'' (البقرہ:۱۲۶) اور اسی دعا کی یہ برکت تھی کہ عرب میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدامنی کے درمیان صرف یہی ایک شہر ڈھائی ہزار سال سے امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ پس کلام کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے نوعِ انسانی کو ایسی بہترین ساخت پر بنایا کہ اس میں نبوت جیسے عظیم مرتبے کے حامل انسان پیدا ہوئے۔

۴- مفسرین نے بالعموم اس کے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ ہم نے اُسے اَرْذَلُ الْعُمُر، یعنی بڑھاپے کی ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اُسے جہنم کے

أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٦﴾ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ﴿٧﴾ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ﴿٨﴾

ع ۱ ۸ ۲۰

کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ پس (اے نبیؐ!) اِس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملے میں تم کو جھٹلا سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ ع

سب سے نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔ لیکن یہ دونوں معنیٰ اُس مقصودِ کلام کے لیے دلیل نہیں بن سکتے جسے ثابت کرنے کے لیے یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ سورت کا مقصود جزا و سزا کے برحق ہونے پر استدلال کرنا ہے۔ اِس پر نہ یہ بات دلالت کرتی ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ بڑھاپے کی انتہائی کمزور حالت کو پہنچا دیے جاتے ہیں، اور نہ یہی بات دلالت کرتی ہے کہ انسانوں کا ایک گروہ جہنّم میں ڈالا جائے گا۔ پہلی بات اس لیے جزا و سزا کی دلیل نہیں بن سکتی کہ بُڑھاپے کی حالت اچھے اور بُرے، دونوں قسم کے لوگوں پر طاری ہوتی ہے، اور کسی کا اس حالت کو پہنچنا کوئی سزا نہیں ہے جو اُسے اُس کے اعمال پر دی جاتی ہو۔ رہی دوسری بات، تو وہ آخرت میں پیش آنے والا معاملہ ہے۔ اُسے اُن لوگوں کے سامنے دلیل کے طور پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے جنھیں آخرت ہی کی جزا و سزا کا قائل کرنے کے لیے یہ سارا اِستدلال کیا جا رہا ہے؟ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد جب انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اُسے گراوٹ کی اُس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اُس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہو جاتے ہیں، وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف اِسی ایک بات کو لے لیجیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام لے کر توپ، بندوق، ٹینک، ہوائی جہاز، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے، تاکہ آن کی آن میں پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیّت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصوّر بھی کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اِس انتہا کو پہنچتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے، ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، باپوں اور بھائیوں اور شوہروں

کے سامنے اُن کے گھر کی عورتوں کی عِصمت لُوٹتے ہیں، بچوں کو اُن کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں، انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسان کی اِس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کرسکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ اُن میں سے جس کی طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو اَرْذَلُ المخلوقات ثابت کردیتا ہے۔ حتّٰی کہ مذہب، جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اِتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے، اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے، جن سے زِنا کا ارتکاب کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ دیوتا اور معبُود کا درجہ دیتا ہے، ان کی طرف اس کی دیو مالا میں ایسے ایسے گندے قصّے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسان کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں۔

۵ – جن مفسرین نے اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ سے مراد بڑھاپے کی وہ حالت لی ہے جس میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، وہ اِس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "مگر جن لوگوں نے اپنی جوانی اور تندرستی کی حالت میں ایمان لا کر نیک اعمال کیے ہوں، اُن کے لیے بڑھاپے کی اِس حالت میں بھی وہی نیکیاں لکھی جائیں گی اور انھی کے مطابق وہ اجر پائیں گے۔ اُن کے اجر میں اِس بنا پر کوئی کمی نہ کی جائے گی کہ عمر کے اِس دَور میں اُن سے وہ نیکیاں صادر نہیں ہوئیں۔" اور جو مفسرین اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کی طرف پھیرے جانے کا مطلب جہنّم کے ادنیٰ ترین درجے میں پھینک دیا جانا لیتے ہیں، ان کے نزدیک اِس آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ "ایمان لا کر عملِ صالح کرنے والے لوگ اِس سے مُستثنیٰ ہیں، وہ اس درجے کی طرف نہیں پھیرے جائیں گے، بلکہ اُن کو وہ اجر ملے گا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔" لیکن یہ دونوں معنیٰ اُس اِستِدلال سے مناسبت نہیں رکھتے جو جزا و سزا کے برحق ہونے پر اِس سورت میں کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسانی معاشرے میں یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اخلاقی پستی میں گرنے والے لوگ گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچ ہو جاتے ہیں، اُسی طرح یہ بھی ہر زمانے کا عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت اور رسالت پر ایمان لائے اور جنھوں نے اپنی زندگی عملِ صالح کے سانچے میں ڈھال لی، وہ اِس پستی میں گرنے سے بچ گئے اور اُسی اَحْسَنِ تقویم پر قائم رہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا تھا، اس لیے وہ اجرِ غیرِ ممنون کے مستحق ہیں، یعنی ایسے اجر کے جو نہ اُن کے استحقاق سے کم دیا جائے گا اور نہ اُس کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا۔

٦ – دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "پس (اے انسان!) اِس کے بعد کیا چیز تجھے جزا و سزا کو جُھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے۔" دونوں صورتوں میں مدّعا ایک ہی رہتا ہے۔ یعنی جب یہ بات عَلانیۃً انسانی معاشرے میں نظر آتی ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کی ہوئی نوعِ انسانی میں سے ایک گروہ اخلاقی پستی میں گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچ ہو جاتا ہے، اور دوسرا گروہ ایمان و عملِ صالح اختیار کر کے اِس گراوٹ سے بچا رہتا ہے اور اُسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کے پیدا کیے جانے سے مطلوب تھی، تو اِس کے بعد جزا و سزا کو کیسے جُھٹلایا جاسکتا ہے؟ کیا عقل

یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو؟ کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ نہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں گرنے والوں کو کوئی سزا دی جائے اور نہ اُس سے بچ کر پاکیزہ زندگی اختیار کرنے والوں کو کوئی جزا؟ یہی بات دوسرے مقامات پر قرآن میں اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۟ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ ''کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟'' (القلم: ۳۵ - ۳۶) اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ''کیا برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اُنھیں اُن لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے؟ دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔'' (الجاثیہ:۲۱)

۷- یعنی جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے بھی تم یہ چاہتے ہو اور یہی توقع رکھتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو صلہ و انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اگر تم اس کو سب سے بڑا حاکم مانتے ہو تو کیا اس کے بارے میں تمھارا یہ خیال ہے کہ وہ کوئی انصاف نہ کرے گا؟ کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ بُرے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا؟ کیا اس کی دنیا میں بدترین افعال کرنے والے اور بہترین کام کرنے والے، دونوں مر کر خاک ہو جائیں گے، اور کسی کو نہ بداعمالیوں کی سزا ملے گی نہ حُسنِ عمل کی جزا؟

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن المُنذِر، بیہقی، حاکم اور ابن مَرْدُوْیَہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی سورۂ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ پڑھے اور اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ پر پہنچے تو کہے: بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ (ہاں، اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں)۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضورؐ جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبْحٰنَكَ فَبَلٰی۔

تفہیم القرآن

العلق

(۹۶)

العَلَق

نام

دوسری آیت کے لفظ عَلَق کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اِس سورت کے دو حصّے ہیں: پہلا حصّہ اِقْرَاْ سے شروع ہو کر پانچویں آیت کے الفاظ مَالَمْ یَعْلَمْ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصّہ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی سے شروع ہو کر آخر سورت تک چلتا ہے۔ پہلے حصّے کے متعلق علمائے اُمت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اِس معاملے میں حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جسے امام احمد، بخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدِد سندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے، اور اس میں حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر آغازِ وحی کا پورا قصّہ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشعریؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیات جو حضوؐر پر نازل ہوئیں وہ یہی تھیں۔ دوسرا حصّہ بعد میں اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپؐ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کوشش کی۔

آغازِ وحی

محدثین نے آغازِ وحی کا قصّہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انھوں نے حضرت عُروَہ بن زُبیر سے، اور انھوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچّے (اور بعض رِوایات میں ہے، اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے، وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپؐ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے (حضرت عائشہؓ نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہریؒ نے تَعَبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپؐ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپؐ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپؐ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جب کہ آپؐ غارِ حرا میں تھے، یکایک آپؐ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آ کر آپؐ سے کہا: "پڑھو"۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے کہا: "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ

میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھو''۔ میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھو''۔ میں نے پھر کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا)، یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا: ''مجھے اُڑھاوَ، مجھے اُڑھاوَ۔'' چنانچہ آپؐ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپؐ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے خدیجہؓ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' پھر سارا قصّہ آپؐ نے اُن کو سنایا اور کہا: ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہوجایئے، خدا کی قسم! آپؐ کو خدا کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں (ایک رِوایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔'' پھر وہ حضوؐر کو ساتھ لے کر وَرَقَہ بن نَوْفَل کے پاس گئیں جو اُن کے چچازاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیّت میں عیسائی ہوگئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا: ''بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیے۔'' وَرَقَہ نے حضورؐ سے کہا: ''بھتیجے! تم کو کیا نظر آیا؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقَہ نے کہا: ''یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش! میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی جوان ہوتا۔ کاش! میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' وَرَقَہ نے کہا: ''ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپؐ کی پُرزور مدد کروں گا۔'' مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وَرَقَہ کا انتقال ہوگیا۔

یہ قصّہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اِس چیز کا طالب یا مُتوقّع ہونا تو درکنار، آپؐ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپؐ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نُزول اور فرشتے کا اِس طرح سامنے آنا آپؐ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا، جس کا پہلا تأثُّر آپؐ کے اُوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اِتنے بڑے ایک حادثے کے پیش آنے سے فطری طور پر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے،

مگر اُن میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپؐ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں، کیونکہ آپؐ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصّے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوّت سے پہلے آپؐ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپؐ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سِن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعے کے وقت اُن کی عمر ۵۵ سال تھی، اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے اِس طویل اِزْدِواجی زندگی میں آپؐ کو اِتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تأمّل انھوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپؐ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح وَرَقَہ بن نَوْفَل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپؐ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اِسے کوئی وَسْوَسَہ نہیں سمجھا، بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپؐ اِتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپؐ کا نبوّت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

دوسرے حصّے کی شانِ نزول

اِس سورہ کا دوسرا حصّہ اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں اسلامی طریقے پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپؐ کو ڈرا دھمکا کر اِس سے روکنا چاہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اِس کے کہ حضورؐ اسلام کی عَلانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپؐ نے حَرَم میں اُس طریقے پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھائی تھی، اور یہی وہ چیز تھی جس سے قُریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپؐ کسی نئے دین کے پَیرو ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگ تو اِسے حیرت ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابوجہل کی رگِ جاہلیت اِس پر پھڑک اٹھی اور اس نے آپؐ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اِس طریقے پر حرم میں عبادت نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ سے مروی ہیں جن میں ابوجہل کی اِن بیہودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا: ”کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹِکاتے ہیں؟“ لوگوں نے کہا: ”ہاں“۔ اس نے کہا: ”لات اور عُزّیٰ کی قسم! اگر میں نے ان کو اِس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔“ پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا، تاکہ آپؐ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا: "میرے اور اُن کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پَر تھے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اُس کے چیتھڑے اُڑا دیتے۔ (احمد، مسلم، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابونُعَیم اصفہانی، بَیہقی)

ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ ابوجہل نے کہا: "اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبے کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ عَلانیہ اُسے آ پکڑیں گے۔ (بخاری، ترْمِذی، نَسائی، ابن جَرِیر، عبدالرزاق، عَبد بن حُمَید، ابن المُنذِر، ابن مَرْدُوْیَہ)

ابنِ عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا: "اے محمدؐ! کیا میں نے تم کو اِس سے منع نہیں کیا تھا؟" اور اس نے آپؐ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اِس پر اُس نے کہا: "اے محمدؐ، تم کس بَل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم! اِس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔" (احمد، ترْمِذی، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیبَہ، ابن المُنذِر، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

انھی واقعات پر اِس سورہ کا وہ حصّہ نازل ہوا جو كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى سے شروع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اِس حصّے کا مقام وہی ہونا چاہیے تھا جو قرآن کی اِس سورت میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد اسلام کا اوّلین اظہار حضورؐ نے نماز ہی سے کیا تھا، اور کفار سے آپؐ کی مُڈبھیڑ کا آغاز بھی اِسی واقعے سے ہوا تھا۔

---

۱۹ آیاتہا — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵

پڑھو[۱] (اے نبیؐ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ[۲] جس نے پیدا کیا[۳]، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی[۴]۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا[۵]، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا[۶]۔

۱- جیسا کہ ہم نے دیباچے میں بیان کیا ہے، فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے اور انھیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا جاؤں آپؐ اُسی طرح پڑھتے جائیں، تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

۲- یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظِ دیگر، بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اِس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ کا رب کون ہے، بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

۳- مُطلقاً ''پیدا کیا'' فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ کس کو پیدا کیا۔ اِس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اُس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

۴- کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اُس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اُسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق جمع ہے عَلَقَہ کی، جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رُونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷)

۵- یعنی یہ اُس کا انتہائی کرم ہے کہ اِس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اُس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا، بلکہ اُس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا، جو

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؕ﴿۸﴾ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا

ہرگز نہیں[۶]، انسان سرکشی کرتا ہے اِس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے[۷] (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے[۸]۔ تم نے دیکھا اُس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ

بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقّی اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقا اور تحفُّظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اُسے نَشو ونُما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے عُلوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

۶ – یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اُسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے، وہ اُس پر کُھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ’’اور لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے۔‘‘ (البقرہ: ۲۵۵) جن جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا، بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اُسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپؐ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپؐ سے براہِ راست مخاطب ہے، اس کی طرف سے آپؐ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپؐ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اِس کے ایک مدت بعد سورۂ مُدَّثِّر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپؐ کو بتایا گیا کہ نبوّت پر مامور ہونے کے بعد اب آپؐ کو کام کیا کرنا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد ششم، المدّثّر، دیباچہ)

۷ – یعنی ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ جس خدائے کریم نے انسان پر اتنا بڑا کرم فرمایا ہے اس کے مقابلے میں وہ جہالت برت کر وہ رَوِیّہ اختیار کرے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۸ – یعنی یہ دیکھ کر کہ مال، دولت، عزّت وجاہ اور جو کچھ بھی دنیا میں وہ چاہتا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے، شکر گزار ہونے کے بجائے وہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور حدِ بندگی سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔

۹ – یعنی خواہ کچھ بھی اس نے دنیا میں حاصل کر لیا ہو، جس کے بل پر وہ تمرّد اور سرکشی کر رہا ہے، آخر کار اسے جانا تو تیرے رب ہی کے پاس ہے۔ پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ اِس رَوِش کا انجام کیا ہوتا ہے۔

صَلّٰى ﴿١٠﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَى الۡهُدٰٓى ﴿١١﴾ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰى ﴿١٢﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٣﴾ اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿١٤﴾ كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾

وہ نماز پڑھتا ہو؟[10] تمھارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور مُنہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟[11] ہرگز نہیں،[12] اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے، اُس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔[13]

۱۰- بندے سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اِس طریقے سے حضوؐر کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا (بنی اسرائیل:۱) ”پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف۔“ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ (الکہف:۱) ”تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔“ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰهِ يَدۡعُوۡهُ كَادُوۡا يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِ لِبَدًا (الجنّ:۱۹) ”اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اُس طریقے کا ذکر قرآنِ مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبیؐ تم اِس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہٰذا یہ اِس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔

۱۱- بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اُس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھی اُس شخص کی حرکت جو خدا کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہِ راست پر ہو، یا لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور بُرے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو، اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اُس سے منہ موڑتا ہو، تو اس کی یہ حرکت کیسی ہے؟ کیا یہ شخص یہ رَوش اختیار کر سکتا تھا اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بھی دیکھ رہا ہے جو نیکی کا کام کرتا ہے اور اِس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلانے اور اُس سے رُوگردانی کرنے میں لگا ہوا ہے؟ ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا خود اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی دادرسی کرے گا۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾

ع ۱۹ السجدۃ

وہ بُلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو،[۱۴] ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بُلالیں گے۔[۱۵] ہرگز نہیں، اُس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قُرب حاصل کرو۔[۱۶] ع

۱۲- یعنی یہ شخص جو دھمکی دیتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھیں گے تو وہ ان کی گردن کو پاؤں سے دبا دے گا، یہ ہرگز ایسا نہ کر سکے گا۔

۱۳- پیشانی سے مراد یہاں پیشانی والا شخص ہے۔

۱۴- جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں بیان کیا ہے، ابوجہل کے دھمکی دینے پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جِھڑک دیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اے محمدؐ! تم کس بَل پر مجھے ڈراتے ہو؟ خدا کی قسم! اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بلالے اپنے حمایتیوں کو۔

۱۵- اصل میں زَبَانِیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قَتَادَہ کی تشریح کے مطابق کلامِ عرب میں پولیس کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور زَبَن کے اصل معنی دھکا دینے کے ہیں۔ بادشاہوں کے ہاں چوبدار بھی اِسی غرض کے لیے ہوتے تھے کہ جس پر بادشاہ ناراض ہو اُسے وہ دھکّے دے کر نکال دیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے حمایتیوں کو بُلالے، ہم اپنی پولیس، یعنی ملائکہ عذاب کو بُلالیں گے کہ وہ اِس کی اور اس کے حمایتیوں کی خبر لیں۔

۱۶- سجدہ کرنے سے مراد نماز ہے۔ یعنی اے نبیؐ! تم بے خوف اُسی طرح نماز پڑھتے رہو جس طرح پڑھتے رہے ہو، اور اس کے ذریعے سے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ”بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اُس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔“ اور مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت بھی آئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے تھے تو سجدۂ تلاوت ادا فرماتے تھے۔

تفہیم القرآن

القدر

(۹۷)

القَدر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقَدْر کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کے مکّی اور مَدَنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابوحَیّان نے البحر المحیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ علی بن احمد الواحدی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورت ہے جو مدینے میں نازل ہوئی۔ بخلاف اس کے الماوَردی کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مکّی ہے، اور یہی بات امام سُیوطی نے اِتقان میں لکھی ہے۔ ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عباسؓ، ابن الزُّبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورت کے مضمون پر غور کرنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کو مکہ ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ قرآنِ مجید کی ترتیب میں اِسے سورۂ عَلَق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتابِ پاک کے نزول کا آغاز سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا، اُسی کے متعلق اِس سورہ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ کس تقدیر ساز رات میں نازل ہوئی ہے، کیسی جلیل القدر کتاب ہے اور اس کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔

سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اِسے نازل کیا ہے۔ یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اِس کا نزول ہماری طرف سے شبِ قدر میں ہوا ہے۔ شبِ قدر کے دو معنی ہیں، اور دونوں ہی یہاں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ وہ رات ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں، یا بالفاظِ دیگر، یہ کوئی معمولی رات عام راتوں جیسی نہیں ہے، بلکہ یہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کی رات ہے۔ اِس میں اِس کتاب کا نزول محض ایک کتاب کا نزول نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو نہ صرف قریش، نہ صرف عرب، بلکہ دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا۔ یہی بات سورۂ دُخان میں بھی فرمائی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ دخان کا دیباچہ اور حاشیہ ۳) دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ بڑی قدر و منزلت اور عظمت و شرف رکھنے والی رات ہے، اور آگے اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اِس سے کفارِ مکہ کو گویا متنبّہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی نادانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اِس کتاب کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہو اور کوس رہے ہو کہ یہ کیا بلا ہم پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ جس رات کو

اِس کے نُزول کا فیصلہ صادر کیا گیا، وہ اِتنی خیر و برکت کی رات تھی کہ کبھی انسانی تاریخ کے ہزار مہینوں میں بھی انسان کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا تھا جو اِس رات میں کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سورۂ دُخان، آیت ۳ میں ایک دوسرے طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اُس سورہ کے دیباچے میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اِس رات کو فرشتے اور جبریلؑ اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر نازل ہوتے ہیں (جسے سورۂ دُخان، آیت ۴ میں اَمْرٍ حَکِیْمٍ کہا گیا ہے) اور وہ شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے، یعنی اس میں کسی شر کا دخل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے بالآخر بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں کوئی بُرائی مقصود نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو خیر کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ شر کے لیے۔

---

۵ آیاتھا سُوۡرَۃُ الۡقَدۡرِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾

ہم نے اِس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔[۱] اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے؟

۱- اصل الفاظ ہیں: اَنۡزَلۡنٰہُ، ’’ہم نے اِس کو نازل کیا ہے۔‘‘ لیکن بغیر اِس کے کہ پہلے قرآن کا کوئی ذکر ہو، اشارہ قرآن ہی کی طرف ہے، اس لیے کہ ’’نازل کرنا‘‘ خود بخود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔ اور قرآنِ مجید میں اس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اگر سیاقِ کلام یا اندازِ بیان سے ضمیر کا مَرجَع خود ظاہر ہو رہا ہو تو ضمیر ایسی حالت میں بھی استعمال کر لی جاتی ہے جب کہ اُس کے مَرجَع کا ذکر پہلے یا بعد میں کہیں نہ کیا گیا ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۹)

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے، اور سورۂ بَقَرہ میں ارشاد ہوا ہے: شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ، ’’رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔‘‘ (البقرہ:۱۸۵) اس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ خدا کا فرشتہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا، وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی۔ اِس رات کو یہاں شبِ قدر کہا گیا ہے اور سورۂ دُخان میں اِسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے: اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ، ’’ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔‘‘ (آیت ۳)

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اِس رات پورا قرآن حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، اور پھر واقعات اور حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے دوران میں جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ یہ مطلب ابنِ عباسؓ نے بیان کیا ہے۔ (ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، حاکم، ابنِ مَرۡدُوۡیَہ، بَیۡہَقی) دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اِس رات سے ہوئی۔ یہ امام شَعۡبِی کا قول ہے، اگرچہ اُن سے بھی دوسرا قول وہی منقول ہے جو ابنِ عباسؓ کا اُوپر گزرا ہے۔ (ابنِ جَرِیر) بہرحال دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کا سلسلہ اسی رات کو شروع ہوا اور یہی رات تھی جس میں سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات نازل کی گئیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتیں اللہ تعالیٰ اُسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ اسلامی کو کسی واقعہ یا معاملہ میں ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے اَزَل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر نوعِ انسانی کی پیدائش، اس میں انبیاءؑ کی بعثت، انبیاءؑ پر نازل کی جانے والی کتابوں، اور تمام

انبیاءؑ کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے اور آپؐ پر قرآن نازل کرنے کا پورا منصوبہ موجود تھا۔ شبِ قدر میں صرف یہ کام ہوا کہ اس منصوبے کے آخری حصے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اُس وقت اگر پورا قرآن حاملینِ وحی کے حوالے کر دیا گیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔

قدر کے معنیٰ بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سُپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید سورۂ دُخان کی یہ آیت کرتی ہے: فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ، ''اُس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔'' (آیت ۵) بخلاف اِس کے امام زُہریؒ کہتے ہیں کہ قدر کے معنیٰ عظمت و شرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اِس معنیٰ کی تائید اِسی سورت کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے کہ ''شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔''

اب رہا یہ سوال کہ یہ کون سی رات تھی، تو اس میں اتنا اختلاف ہُوا ہے کہ قریب قریب ۴۰ مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں۔ لیکن علمائے اُمّت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شبِ قدر ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اِس معاملے میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں، انھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایَت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا: وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے۔ (ابوداؤد طَیالِسی) دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے۔ (مُسندِ احمد)

حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے زِر بن حُبَیش نے شبِ قدر کے متعلق پوچھا تو انھوں نے حلفاً کہا اور اِستثنا نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذِی، نَسائی، ابنِ حِبّان)

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ (ابنِ ابی شَیبَہ)

حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری۔ (مُسندِ احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو، جب کہ مہینا ختم ہونے میں نو دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی۔ (بخاری) اکثر اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ نو دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ اِن تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔ (ترمذِی، نَسائی)

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

ع ۵/۲۲ معانقۃ ۱۸

شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔[۲] فرشتے اور رُوح[۳] اُس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں۔[۴] وہ رات سراسر سلامتی ہے طُلوعِ فجر تک۔[۵] ع

حضرت عائشہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی) حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تا زیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملے میں جو رِوایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں، اُن کی بنا پر علمائے سَلَف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شبِ قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعیّن اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شبِ قدر کی فضیلت سے فیض اُٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفانہ کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت مکۂ معظّمہ میں رات ہوتی ہے اُس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے میں دن ہوتا ہے، اس لیے اُن علاقوں کے لوگ تو کبھی شبِ قدر کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عَرَبی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی اِن تاریخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصّے میں ہو، اُس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شبِ قدر ہو سکتی ہے۔

۲- مفسرین نے بالعموم اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے افضل ہے جن میں شبِ قدر شمار نہ ہو۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من قام لیلۃ القدر ایماناً واحتساباً غفرلہ ما تقدم من ذنبہ، ”جو شخص شبِ قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لیے کھڑا رہا، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔“ اور مُسندِ احمد میں حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ”شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے، جو شخص ان کے اجر کی طلب میں عبادت کے لیے کھڑا رہا، اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے گا۔“ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی لیلۃ القدر خیر من العمل فی الف شھر (شبِ قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے)، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ ”شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔“ اور ہزار مہینوں سے مراد بھی گِنے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں ہیں، بلکہ اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بڑی کثیر تعداد کا تصوُّر دلانے کے لیے وہ ہزار کا لفظ بولتے تھے۔ اِس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِس ایک رات میں خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ

کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا۔

۳- روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کے فضل و شرف کی بنا پر ان کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے۔

۴- یعنی وہ بطورِ خود نہیں آتے بلکہ اپنے رب کے اِذن سے آتے ہیں۔ اور ہر حکم سے مراد وہی ہے جسے سورۂ دُخان، آیت ۴ میں اَمْرٍ حَكِيْمٍ (حکیمانہ کام) کہا گیا ہے۔

۵- یعنی شام سے صبح تک وہ پوری رات خیر ہی خیر ہے، ہر شر اور فتنے سے پاک۔

تفہیم القرآن

البیّنہ

(۹۸)

البیّنۃ

نام

پہلی آیت کے لفظ البَیِّنَۃُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اس کے بھی مکّی اور مَدَنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جُمہور کے نزدیک یہ مکی ہے، اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جُمہور کے نزدیک مدنی ہے۔ ابن الزُّبیر اور عطاء بن یَسار کا قول ہے کہ یہ مَدَنی ہے۔ ابنِ عباسؓ اور قَتَادَہؒ کے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے، دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ حضرت عائشہؓ اِسے مکی قرار دیتی ہیں۔ ابو حیّان صاحبِ بحر المحیط اور عبد المنعم ابن الفرس صاحبِ احکام القرآن اس کے مکی ہونے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک اِس کے مضمون کا تعلق ہے، اُس میں کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جو اِس کے مکی یا مَدَنی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

موضوع اور مضمون

قرآنِ مجید کی ترتیب میں اِس کو سورۂ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنیٰ خیز ہے۔ سورۂ عَلَق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی۔ اور اِس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتابِ پاک کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

سب سے پہلے رسول بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے، اُس سے اُن کا نکلنا اِس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیلِ روشن ہو، اور وہ لوگوں کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی اُن تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے پچھلی کُتُبِ آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے، اور بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل ہو۔

اِس کے بعد اہلِ کتاب کی گمراہیوں کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ اُن کے اِن مختلف راستوں میں بھٹکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، بلکہ وہ اِس کے بعد بھٹکے کہ راہِ راست کا بیانِ واضح اُن کے پاس آچکا تھا۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی گمراہیوں کے وہ خود ذمّہ دار ہیں، اور اب پھر اللہ کے اِس رسول کے ذریعے سے بیانِ واضح آجانے کے بعد بھی اگر وہ بھٹکتے ہی رہیں گے تو اُن کی ذمّہ داری اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

اِسی سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاؑ بھی آئے تھے، اور جو کتابیں بھی

بھیجی گئی تھیں، اُنھوں نے اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے، کسی اور کی عبادت و بندگی اور اطاعت و پرستش کو اس کے ساتھ شامل نہ کیا جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی ہمیشہ سے ایک صحیح دین رہا ہے۔ اِس سے بھی یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب نے اِس اصل دین سے ہٹ کر اپنے مذہبوں میں جن نئی نئی باتوں کا اضافہ کر لیا ہے وہ سب باطل ہیں، اور اللہ کا یہ رسول جو اَب آیا ہے، اُسی اصل دین کی طرف پلٹنے کی انھیں دعوت دے رہا ہے۔

آخر میں صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور مشرکین اس رسول کو ماننے سے انکار کریں گے، وہ بدترینِ خلائق ہیں، ان کی سزا ابدی جہنم ہے، اور جو لوگ ایمان لا کر عملِ صالح کا طریقہ اختیار کر لیں گے اور دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے، وہ بہترینِ خلائق ہیں، اُن کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

آیاتھا ۸ ركوعاتھا ۱

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ

اہلِ کتاب اور مشرکین[1] میں سے جو لوگ کافر تھے[2] (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے،

۱ – کفر میں مشترک ہونے کے باوجود ان دونوں گروہوں کو دو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس پہلے انبیاؑ کی لائی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب، خواہ تحریف شدہ شکل ہی میں سہی، موجود تھی اور وہ اُسے مانتے تھے۔ اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ قرآن مجید میں اگرچہ اہلِ کتاب کے شرک کا ذکر بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ کہتے ہیں، اللہ تین خداؤں میں کا ایک ہے۔ (المائدہ: ۷۳) وہ مسیحؑ ہی کو خدا کہتے ہیں۔ (المائدہ: ۱۷) وہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ (التوبہ: ۳۰) اور یہود کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ عُزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ (التوبہ: ۳۰) لیکن اس کے باوجود قرآن میں کہیں اُن کے لیے "مشرک" کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ ان کا ذکر اہلِ کتاب یا اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (جن کو کتاب دی گئی تھی)، یا یہود اور نصاریٰ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اصلِ دین توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اِس کے غیر اہلِ کتاب کے لیے "مُشرک" کا لفظ بطورِ اصطلاح استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اصلِ دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کے ماننے سے اُن کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق اِن دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح ہی میں نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا ہے اگر وہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور کو صحیح طریقے سے ذبح کریں، اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال۔

۲ – یہاں کفر اپنے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں کافرانہ رَوِیّے کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ مثلاً کوئی اِس معنیٰ میں کافر تھا کہ سرے سے اللہ ہی کو نہ مانتا تھا۔ کوئی اللہ کو مانتا تھا مگر اسے واحد معبُود نہ مانتا تھا، بلکہ خدا کی ذات، یا خدائی کی صفات و اختیارات میں کسی نہ کسی طور پر دوسروں کو شریک ٹھیرا کر اُن کی عبادت بھی کرتا تھا۔ کوئی اللہ کی وحدانیت بھی مانتا تھا مگر اس کے باوجود کسی نوعیت کا شرک بھی کرتا تھا۔ کوئی خدا کو مانتا تھا مگر اس کے نبیوں کو نہیں مانتا تھا اور اُس ہدایت کو قبول کرنے کا قائل نہ تھا جو انبیاؑ کے ذریعے سے آئی ہے۔ کوئی کسی نبی کو مانتا تھا اور کسی دوسرے نبی کا انکار کرتا تھا۔ کوئی آخرت کا منکر تھا۔ غرض مختلف قسم کے کفر تھے جن میں لوگ مبتلا تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے"، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ کفر میں مبتلا نہ تھے، بلکہ مطلب یہ ہے

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ﴿۴﴾ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ﴿۵﴾

جب تک کہ ان کے پاس دلیلِ روشن نہ آجائے[۲] (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول[۳] جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے[۵]، جن میں بالکل راست اور دُرست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اُن میں تفرِقہ برپا نہیں ہوا مگر اِس کے بعد کہ اُن کے پاس (راہِ راست کا) بیانِ واضح آچکا تھا[۶]۔ اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسُو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے[۷]۔

کہ کفر میں مبتلا ہونے والے دو گروہ تھے: ایک اہلِ کتاب، دوسرے مشرکین۔ یہاں مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے لیے ہے۔ جس طرح سورۂ حج، آیت ۳۰ میں فرمایا گیا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں کی گندگی سے بچو، نہ یہ کہ بتوں میں جو گندگی ہے اُس سے بچو۔ اسی طرح الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ کا مطلب بھی یہ ہے کہ کفر کرنے والے، جو اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے ہیں، نہ یہ کہ اِن دونوں گروہوں میں سے جو لوگ کفر کرنے والے ہیں۔

۲۔ یعنی اُن کے اِس حالتِ کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اِس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیلِ روشن آکر انھیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ حق ہونا سمجھائے اور راہِ راست کو واضح اور مُدلَّل طریقے سے ان کے سامنے پیش کردے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس دلیلِ روشن کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں تو ان کا اِس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی اُن میں سے جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اُس کی ذمّہ داری پھر انھی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ، ''سیدھا راستہ بتانا اللہ کے ذمّے ہے۔'' (آیت ۹) سورۂ لَیل میں فرمایا: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ''راستہ بتانا ہمارے ذمّے ہے۔'' (آیت ۱۲) اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ

اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ...... رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ’’(اے نبیؐ!) ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی...... ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ رہے۔‘‘ (النساء: ۱۶۴-۱۶۵) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ’’اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول حقیقت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آ گیا ہے، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ سو، لو اب تمھارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آ گیا۔‘‘ (المائدہ:۱۹)

۴- یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذات خود ایک دلیلِ روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپؐ کا اُمّی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپؐ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپؐ کا بالکل معقول عقائد، نہایت سُتھری عبادات، کمال درجے کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپؐ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپؐ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اُولُوا العزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کُھلی علامات تھیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔

۵- لغت کے اعتبار سے تو صحیفوں کے معنٰی ہیں: ’’لکھے ہوئے اوراق‘‘، لیکن قرآنِ مجید میں اصطلاحاً یہ لفظ انبیا علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور پاک صحیفوں سے مراد ہیں ایسے صحیفے جن میں کسی قسم کے باطل، کسی طرح کی گمراہی و ضلالت، اور کسی اخلاقی گندگی کی آمیزش نہ ہو۔ اِن الفاظ کی پوری اہمیّت اُس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان قرآنِ مجید کے مقابلے میں بائبل (اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کا بھی) مطالعہ کرتا ہے اور ان میں صحیح باتوں کے ساتھ ایسی باتیں لکھی ہوئی دیکھتا ہے جو حق و صداقت اور عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد جب آدمی قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی پاک اور مطہّر کتاب ہے۔

۶- یعنی اِس سے پہلے اہلِ کتاب جو مختلف گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے، اُس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالٰی نے اپنی طرف سے اُن کی رہنمائی کے لیے دلیلِ روشن بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، بلکہ یہ رَوِش انھوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آ جانے کے بعد اختیار کی تھی، اس لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر حجت تمام کی جا چکی تھی۔ اِسی طرح اب چونکہ اُن کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل نہیں رہی ہیں، اس لیے اللہ تعالٰی نے ایک دلیلِ روشن کی حیثیت سے اپنا ایک رسول بھیج کر اور اس کے ذریعے سے پاک صحیفے بالکل راست اور دُرست تعلیمات پر مشتمل پیش کر کے ان پر پھر حجت تمام کر دی ہے، تاکہ اس کے بعد بھی اگر وہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷ۭ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸ۧ

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے[۸] وہ یقیناً جہنّم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترینِ خلائق ہیں[۹]۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترینِ خلائق ہیں[۱۰]۔ اُن کی جزا اُن کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنّتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اُس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو[۱۱]۔ ؏

متفرّق رہیں تو اس کی ذمہ داری اُنھی پر ہو، اللہ کے مقابلے میں وہ کوئی حُجت پیش نہ کرسکیں۔ یہ بات قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۲۱۳ - ۲۵۳۔ آلِ عمران، ۱۹۔ المائدہ، ۴۴ تا ۵۰۔ یونُس، ۹۳۔ الشّوریٰ، ۱۳ تا ۱۵۔ الجاثیہ، ۱۶ تا ۱۸۔ اس کے ساتھ اگر وہ حواشی بھی پیشِ نظر رکھے جائیں جو تفہیم القرآن میں اِن آیات پر ہم نے لکھے ہیں تو بات سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔

۷ – یعنی جس دین کو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، اِسی دین کی تعلیم اہلِ کتاب کو اُن کے ہاں آنے والے انبیاؑ اور ان کے ہاں نازل ہونے والی کتابوں نے دی تھی، اور اُن عقائدِ باطلہ اور اعمالِ فاسدہ میں سے کسی چیز کا اُنھیں حکم نہیں دیا گیا تھا جنھیں اُنھوں نے بعد میں اختیار کر کے مختلف مذاہب بنا ڈالے۔ صحیح اور درست دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خالص اللہ کی بندگی کی جائے، اُس کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کی آمیزش نہ کی جائے، ہر طرف سے رُخ پھیر کر انسان صرف ایک اللہ کا پرستار اور تابعِ فرمان بن جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۹۔ یونُس، حواشی ۱۰۸-۱۰۹۔ جلد سوم، الروم، حواشی ۴۳ تا ۴۷۔ جلد چہارم، الزُّمَر، حواشی ۳-۴)

اس آیت میں دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کو بعض مفسرین نے دین الملّة القیمة یعنی ”راست رَو ملّت کا دین“ کے معنٰی میں لیا ہے، اور بعض اسے اضافتِ صفت الی الموصوف قرار دیتے ہیں اور قیمة کی ”ۃ“ کو علّامہ اور فہّامہ کی طرح مبالغے کی ”ۃ“ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے معنٰی وہی ہیں جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔

۸ – یہاں کفر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے اُس رسول کے آجانے کے بعد اُس کو نہیں مانا جس کا وجود خود ایک دلیلِ روشن ہے اور جو بالکل درست تحریروں پر مشتمل پاک صحیفے اُن کو پڑھ کر سنا رہا ہے، ان کا انجام وہ ہے جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔

۹ – یعنی خدا کی مخلوقات میں اُن سے بدتر کوئی مخلوق نہیں ہے، حتّٰی کہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں، کیونکہ جانور عقل اور اختیار نہیں رکھتے، اور یہ عقل اور اختیار رکھتے ہوئے حق سے منہ موڑتے ہیں۔

۱۰ – یعنی وہ خدا کی مخلوقات میں سب سے، حتّٰی کہ ملائکہ سے بھی افضل و اشرف ہیں، کیونکہ فرشتے نافرمانی کا اختیار ہی نہیں رکھتے، اور یہ اُس کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرتے ہیں۔

۱۱ – بالفاظِ دیگر، جو شخص خدا سے بے خوف اور اس کے مقابلے میں جری و بے باک بن کر نہیں رہا، بلکہ دنیا میں قدم قدم پر اِس بات سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ کہیں مجھ سے ایسا کوئی کام نہ ہو جائے جو خدا کے ہاں میری پکڑ کا موجب ہو، اس کے لیے خدا کے پاس یہ جزا ہے۔

تفہیم القرآن

الزِّلزَال

(۹۹)

الزلزال

نام پہلی ہی آیت کے لفظ زِلْزَالَهَا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابنِ مسعودؓ، عطا، جابر اور مجاہد کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے، اور ابنِ عباسؓ کا بھی ایک قول اس کی تائید کرتا ہے۔ بخلاف اِس کے قَتادہ اور مُقاتل کہتے ہیں کہ یہ مَدَنی ہے، اور ابنِ عباسؓ سے بھی دوسرا قول اِس کے مدنی ہونے کی تائید میں نقل ہوا ہے۔ اس کے مدنی ہونے پر حضرت ابوسعیدؓ خُدری کی اُس روایت سے اِستدلال کیا جاتا ہے جو ابنِ ابی حاتم نے اُن سے نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، تو میں نے عرض کیا: یا رسولَ اللہ! کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کیا: یہ بڑے بڑے گناہ؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں۔ میں نے عرض کیا: اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس پر میں نے کہا: پھر تو میں مارا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا: خوش ہو جاؤ اے ابوسعید! کیونکہ ہر نیکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ اِس حدیث سے اِس سورہ کے مدنی ہونے پر اِستدلال کی بِنا یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خُدری مدینہ کے رہنے والے تھے اور غزوۂ اُحُد کے بعد سن بُلوغ کو پہنچے۔ اس لیے اگر یہ سورت ان کی موجودگی میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ ان کے بیان سے ظاہر ہے، تو اسے مدنی ہونا چاہیے۔ لیکن صحابہؓ اور تابعینؒ کا جو طریقہ آیات اور سورتوں کی شانِ نزول کے بارے میں تھا، اس کی تشریح اس سے پہلے ہم سورۂ دہر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اس لیے کسی صحابی کا یہ کہنا کہ یہ آیت فُلاں موقع پر نازل ہوئی، اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس کا نزول اُسی وقت ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سورت سنی ہو، اُس وقت اِس کے آخری حصے سے خوف زدہ ہو کر انھوں نے حضورؐ سے وہ سوالات کیے ہوں جو اُوپر درج کیے گئے ہیں، اور اس واقعے کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہو کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضورؐ سے یہ عرض کیا۔ اگر یہ روایت سامنے نہ ہو تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ یہ مکی سورت ہے، بلکہ اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے تو اس کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ مکہ کے بھی اُس ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جب نہایت مختصر اور انتہائی دل نشین طریقے سے اسلام کے بنیادی عقائد لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون

اِس کا موضوع ہے موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں اُن سب اعمال کا پورا کچا چٹھا انسان کے سامنے آجانا جو اُس نے دنیا میں کیے تھے۔ سب سے پہلے تین مختصر فقروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور وہ انسان کے لیے کیسی حیران کُن ہوگی۔ پھر دو فقروں میں بتایا گیا ہے کہ یہی زمین جس پر رہ کر انسان نے بے فکری کے ساتھ ہر طرح کے اعمال کیے ہیں، اور جس کے متعلق کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ بے جان چیز کسی وقت اُس کے افعال کی گواہی دے گی، اُس روز اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے گی اور ایک ایک انسان کے متعلق یہ بیان کر دے گی کہ کس وقت کہاں اُس نے کیا کام کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اُس دن زمین کے گوشے گوشے سے انسان گروہ در گروہ اپنے مَرقدوں سے نکل نکل کر آئیں گے، تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں، اور اعمال کی یہ پیشی ایسی مکمل اور مفصل ہوگی کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو سامنے نہ آجائے۔

---

۸ آیاتھا — سورۃ الزلزال مدنیۃ — ۱ رکوعاتھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿١﴾ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿٢﴾ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿٣﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى

جب زمین اپنی پوری شدّت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے[1] گی، اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے[2] گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے[3]، اُس روز وہ اپنے (اُوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے[4] گی، کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم

۱ — اصل الفاظ ہیں: زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا۔ زلزلے کے معنی پے در پے زور زور سے حرکت کرنے کے ہیں۔ پس زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دے کر شدّت کے ساتھ ہلا ڈالا جائے گا۔ اور چونکہ زمین کو ہلانے کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اِس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ زمین کا کوئی مقام، یا کوئی حصہ، یا علاقہ نہیں بلکہ پوری کی پوری زمین ہلا ماری جائے گی۔ پھر اس زلزلے کی مزید شدّت کو ظاہر کرنے کے لیے زِلْزَالَهَا کا اُس پر اضافہ کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: ”اُس کا ہلایا جانا“۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو ایسا ہلایا جائے گا جیسا اُس جیسے عظیم کُرے کو ہلانے کا حق ہے، یا جو اُس کے ہلائے جانے کی انتہائی ممکن شدّت ہو سکتی ہے۔ بعض مفسّرین نے اِس زلزلے سے مراد وہ پہلا زلزلہ لیا ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہو گا یعنی جب ساری مخلوق ہلاک ہو جائے گی اور دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک اِس سے مراد وہ زلزلہ ہے جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گا، یعنی جب تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھیں گے۔ یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ بعد کا سارا مضمون اسی پر دلالت کرتا ہے۔

۲ — یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ اِنْشِقاق، آیت ۴ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ”اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی۔“ اِس کے کئی مطلب ہیں: ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے، اُن سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور بعد کا فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزا جمع ہو کر ازسرِ نَو اُسی شکل و صورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ ان کی

پہلی زندگی کے افعال واقوال اور حرکات وسکنات کی شہادتوں کا جو انبار اُس کی تہوں میں دبا پڑا ہے، اُس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اِس پر بعد کا یہ فقرہ دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسّرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے، اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اُس نے قتل کیے، حق داروں کے حُقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں قزّاقیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اُس کے کسی کام کا نہیں ہے، بلکہ اُلٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

۳۔ انسان سے مراد ہر انسان بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ زندہ ہو کر ہوش میں آتے ہی پہلا تأثّر ہر شخص پر یہی ہوگا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے، بعد میں اُس پر یہ بات کھلے گی کہ یہ روزِ حشر ہے۔ اور انسان سے مراد آخرت کا منکر انسان بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ جس چیز کو وہ غیر ممکن سمجھتا تھا، وہ اس کے سامنے برپا ہو رہی ہوگی اور وہ اس پر حیران و پریشان ہوگا۔ رہے اہلِ ایمان، تو ان پر یہ حیرانی و پریشانی طاری نہ ہوگی، اس لیے کہ سب کچھ ان کے عقیدہ ویقین کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایک حد تک اِس دوسرے معنیٰ کی تائید سورۂ یٰسین کی آیت ۵۲ کرتی ہے، جس میں ذکر آیا ہے کہ اُس وقت منکرینِ آخرت کہیں گے کہ مَنۢ بَعَثَنَا مِنۢ مَّرۡقَدِنَا ''کس نے ہماری خواب گاہ سے ہمیں اُٹھا دیا؟'' اور جواب ملے گا: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ''یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں نے سچ کہا تھا۔'' یہ آیت اِس معاملے میں صریح نہیں ہے کہ کافروں کو یہ جواب اہلِ ایمان ہی دیں گے، کیونکہ آیت میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اس امر کا احتمال ضرور ہے کہ اہلِ ایمان کی طرف سے اُن کو یہ جواب ملے گا۔

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا: ''جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔'' فرمایا: ''وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اِس نے فُلاں دن فُلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔'' (مُسْنَدِ احمد، تِرمِذِی، نَسائی، ابنِ جَرِیر، عبد بن حُمَید، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی فی الشُّعَب) حضرت رَبیعۃ الخَرَشی کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ذرا زمین سے بچ کر رہنا، کیونکہ یہ تمھاری جڑ بنیاد ہے اور اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے، خواہ اچھا ہو یا بُرا۔'' (مُعْجَم الطَّبَرانی) حضرت اَنسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز زمین ہر اُس عمل کو لے آئے گی جو اس کی پیٹھ پر کیا گیا ہو۔'' پھر آپؐ نے یہی آیات تلاوت فرمائیں۔ (ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی) حضرت علیؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیا اہلِ حُقوق میں تقسیم کر کے اُسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر فرماتے: ''تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا۔''

زمین کے متعلّق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اُوپر گزرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم

زمانے کے آدمی کے لیے تو بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبیعی کے اِنکشافات اور سینما، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اِس دَور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اُس کے نُقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور اُن کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو اُن سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے، ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دُہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اُس وقت سن لے گا کہ یہ اُس کی اپنی ہی آوازیں ہیں، اور اس کے سب جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں، وہ اسی شخص کی آواز اور اسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے، اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اُس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر اُن پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گُھپ اندھیرے میں بھی اُس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شُعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرّک فلم کی طرح انسان کے سامنے آ جائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں، کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اُس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدّمہ قائم کیا جائے گا، اُس کو ایسی مکمل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ سب سے پہلے تو وہ نامۂ اعمال ہے جس میں ہر وقت اُس کے ساتھ لگے ہوئے کراماً کاتبین اس کے ایک ایک قول اور فعل کا ریکارڈ درج کر رہے ہیں۔ (قٓ، آیات ۱۷-۱۸۔ الانفطار، آیات ۱۰ تا ۱۲) یہ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ پڑھ اپنا کارنامۂ حیات، اپنا حساب لینے کے لیے تُو خود کافی ہے۔ (بنی اسرائیل: ۱۴) انسان اسے پڑھ کر حیران رہ جائے گا کہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اس میں ٹھیک ٹھیک درج نہ ہو۔ (الکہف: ۴۹) اِس کے بعد انسان کا اپنا جسم ہے جس سے اُس نے دنیا میں کام لیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں اُس کی اپنی زبان شہادت دے گی کہ اُس سے وہ کیا کچھ بولتا رہا ہے، اس کے اپنے ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے کہ ان سے کیا کیا کام اُس نے لیے۔ (النور: ۲۴) اس کی آنکھیں شہادت دیں گی، اس کے کان شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کیا کچھ سنا۔ اس کے جسم کی پوری کھال اس کے افعال کی شہادت دے گی۔ وہ حیران ہو کر اپنے اعضا سے کہے گا کہ تم بھی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اس کے اعضا جواب دیں گے کہ آج جس خدا کے حکم سے ہر چیز بول رہی ہے، اسی کے حکم سے ہم بھی بول رہے ہیں۔ (حٰم السجدہ: ۲۰ تا ۲۲) اس پر مزید وہ شہادتیں ہیں جو زمین اور اس کے پورے ماحول سے پیش کی جائیں گی، جن میں آدمی اپنی آوازیں خود اپنے کانوں سے، اور اپنی حرکات کی ہو بہو تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل میں جو خیالات، ارادے اور مقاصد چُھپے ہوئے تھے، اور جن نیّتوں کے ساتھ

لَهَا ۝٥ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝٦ؕ

دیا ہوگا۔ اُس روز لوگ متفرّق حالت میں پلٹیں[۵] گے تا کہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں[۶]۔

اس نے سارے اعمال کیے تھے، وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے، جیسا کہ آگے سورۂ عادیات میں آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِتنے قطعی اور صریح اور نا قابلِ انکار ثبوت سامنے آجانے کے بعد انسان دم بخود رہ جائے گا اور اُس کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہے گا۔ (المرسلات، آیات ۳۵-۳۶)

۵ - اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا اپنی انفرادی حیثیت میں ہوگا، خاندان، جتھے، پارٹیاں، قومیں، سب بکھر جائیں گی۔ یہ بات قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس روز لوگوں سے فرمائے گا کہ "لو، اب تم ویسے ہی تنِ تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کیا تھا۔" (آیت ۹۴) اور سورۂ مریم میں فرمایا: "یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا۔" (آیت ۸۰) اور یہ کہ "اِن میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا۔" (آیت ۹۵) دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ہزار ہا برس کے دوران میں جگہ جگہ مرے تھے، زمین کے گوشے گوشے سے گروہ دَر گروہ چلے آ رہے ہوں گے، جیسا کہ سورۂ نبا میں فرمایا گیا: "جس روز صُور میں پھونک ماردی جائے گی، تم فوج در فوج آجاؤ گے۔" (آیت ۱۸) اس کے علاوہ جو مطلب مختلف مفسرین نے بیان کیے ہیں، اُن کی گنجایش لفظ اَشۡتَاتًا میں نہیں ہے، اس لیے ہمارے نزدیک وہ اِس لفظ کے معنوی حُدود سے باہر ہیں، اگرچہ بجائے خود صحیح ہیں اور قرآن و حدیث کے بیان کردہ احوالِ قیامت سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۶ - اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اُن کو اُن کے اعمال دکھائے جائیں، یعنی ہر ایک کو بتایا جائے کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُن کو اُن کے اعمال کی جزا دکھائی جائے۔ اگرچہ یہ دوسرے معنیٰ بھی لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ کے لیے جا سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے لِيُرَوۡا جَزَآءَ اَعۡمَالِهِمۡ (تاکہ انھیں ان کے اعمال کی جزا دکھائی جائے) نہیں فرمایا ہے، بلکہ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ (تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں) فرمایا ہے۔ اس لیے پہلے معنیٰ ہی قابلِ ترجیح ہیں، خُصوصاً جب کہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اِس کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ کافر و مومن، صالح و فاسق، تابعِ فرمان اور نافرمان، سب کو اُن کے نامۂ اعمال ضرور دیے جائیں گے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الحاقّہ، آیات ۱۹ و ۲۵، اور الِانشقاق، آیات ۷ و ۱۰) ظاہر ہے کہ کسی کو اُس کے اعمال دکھانے، اور اس کا نامۂ اعمال اس کے حوالے کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ بریں زمین جب اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات پیش کرے گی تو حق و باطل کی وہ کش مکش جو ابتدا سے برپا ہے اور قیامت تک برپا رہے گی، اُس کا پورا نقشہ بھی سب کے سامنے آجائے گا، اور اس میں سب ہی دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا، اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے ان کے مقابلے میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ بعید نہیں کہ ہدایت کی طرف بلانے والوں اور ضلالت پھیلانے والوں کی ساری تقریریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سن لیں۔ دونوں طرف کی تحریروں اور لٹریچر کا پورا ریکارڈ جُوں کا تُوں سب کے سامنے لاکر رکھ دیا جائے۔ حق پرستوں پر

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

ع ۸

پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

باطل پرستوں کے ظلم، اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے معرکوں کے سارے مناظر میدانِ حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

۷ – اِس ارشاد کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی کی کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہیں ہوگی جو اُس کے نامۂ اعمال میں درج ہونے سے رہ گئی ہو، اُسے وہ بہر حال دیکھ لے گا۔ لیکن اگر دیکھنے سے مراد اُس کی جزا و سزا دیکھنا لیا جائے تو اس کا یہ مطلب لینا بالکل غلط ہے کہ آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی جزا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی سزا ہر شخص کو دی جائے گی، اور کوئی شخص بھی وہاں اپنی کسی نیکی کی جزا اور کسی بدی کی سزا پانے سے نہ بچے گا۔ کیونکہ اوّل تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ایک ایک بُرے عمل کی سزا، اور ایک ایک اچھے عمل کی جزا الگ الگ دی جائے گی۔ دوسرے اس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صالح مومن بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کی سزا پانے سے نہ بچے گا اور کوئی بدترین کافر و ظالم اور بدکار انسان بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے اچھے فعل کا اجر پائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دونوں معنیٰ قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں، اور عقل بھی اِسے نہیں مانتی کہ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیسے سمجھ میں آنے کے قابل ہے کہ آپ کا کوئی خادم نہایت وفادار اور خدمت گزار ہو، لیکن آپ اس کے کسی چھوٹے سے قصور کو بھی معاف نہ کریں، اور اس کی ایک ایک خدمت کا اجر و انعام دینے کے ساتھ اس کے ایک ایک قصور کو گن گن کر ہر ایک کی سزا بھی اُسے دے ڈالیں۔ اِسی طرح یہ بھی عقلاً ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کا پَروَردَہ کوئی شخص جس پر آپ کے بے شمار احسانات ہوں، وہ آپ سے غداری اور بے وفائی کرے اور آپ کے احسانات کا جواب ہمیشہ نمک حرامی ہی سے دیتا رہے، مگر آپ اس کے مجموعی رَوِیّے کو نظر انداز کر کے اس کی ایک ایک غداری کی الگ سزا، اور اس کی ایک ایک خدمت کی، خواہ وہ کسی وقت پانی لا کر دے دینے یا پنکھا جھل دینے ہی کی خدمت ہو، الگ جزا دیں۔ اب رہے قرآن و حدیث، تو وہ وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومنِ صالح، مومنِ خطا کار، مومنِ ظالم و فاسق، محض کافر، اور کافرِ مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصّل قانون بیان کرتے ہیں، اور یہ جزا و سزا دنیا سے آخرت تک انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

اس سلسلے میں قرآنِ مجید اُصولی طور پر چند باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ کافر و مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے) ضائع کر دیے گئے، آخرت میں

وہ ان کا کوئی اجر نہیں پا سکیں گے۔ اُن کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں اُن کو مل جائے گا۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الاعراف ۱۴۷۔ التوبہ ۱۷۔ ۶۷ تا ۶۹۔ ہود ۱۵۔ ۱۶۔ ابراہیم ۱۸۔ الکہف ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ النور ۳۹۔ الفرقان ۲۳۔ الاحزاب ۱۹۔ الزُمَر ۶۵۔ الاَحقاف ۲۰)

دوم، یہ کہ بدی کی سزا اُتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے، مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی، بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے ۱۰ گُنا ہے، اور کہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔ (مُلاحظہ ہو: البقرہ ۲۶۱۔ الاَنعام ۱۶۰۔ یُونُس ۲۶۔ ۲۷۔ النور ۳۸۔ القصص ۸۴۔ سبا ۳۷۔ المومن ۴۰)

سوم، یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں گے تو اُن کے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (النساء ۳۱۔ الشُوریٰ ۳۷۔ النجم ۳۲)

چہارم، یہ کہ مومنِ صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اس کی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔ (العنکبوت ۷۔ الزُمَر ۳۵۔ الاحقاف ۱۶۔ الانشقاق ۸)

احادیث بھی اِس معاملے کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ انشقاق کی تفسیر میں وہ احادیث نقل کر چکے ہیں جو قیامت کے روز ہلکے حساب اور سخت حساب فہمی کی تشریح کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمائی ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، الانشقاق، حاشیہ ۶) حضرت اَنسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور عرض کیا کہ ''یا رسولؐ اللہ! کیا میں اُس ذرہ برابر بُرائی کا نتیجہ دیکھوں گا جو مجھ سے سرزد ہوئی؟'' حضورؐ نے فرمایا: ''اے ابوبکرؓ! دنیا میں جو معاملہ بھی تمھیں ایسا پیش آتا ہے جو تمھیں ناگوار ہو، وہ اُن ذرہ برابر برائیوں کا بدلہ ہے جو تم سے صادر ہوں، اور جو ذرہ برابر نیکیاں بھی تمھاری ہیں، انھیں اللہ آخرت میں تمھارے لیے محفوظ رکھ رہا ہے۔'' (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، بَیہَقی فی الشُّعب، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَردُوْیَہ، عَبد بن حُمَید) حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ ''تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا اس کی جزا آخرت میں ہے، اور جو کسی قسم کی برائی کرے گا وہ اِسی دنیا میں اُس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا۔'' (ابنِ مَردُوْیَہ) قَتَادَہ نے حضرت اَنسؓ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے اور آخرت میں ان کی جزا دے گا۔ رہا کافر، تو دنیا میں اس کی بھلائیوں کا بدلہ چُکا دیا جاتا ہے، پھر جب قیامت ہوگی تو اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی۔'' (ابنِ جَرِیر) مَسرُوق حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عبداللہ بن جُدعان جاہلیت کے زمانے میں صلۂ رحمی کرتا تھا، مسکین کو کھانا کھلاتا تھا، مہمان نواز تھا، اسیروں کو رہائی دلواتا تھا۔ کیا آخرت میں یہ اس کے لیے نافع ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، اس نے مرتے وقت تک کبھی یہ نہیں کہا کہ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ، ''میرے پروردگار! روزِ جزا میں میری خطا معاف کیجیو۔'' (ابنِ جَرِیر) اِسی طرح کے جوابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اور لوگوں کے بارے

میں بھی دیے ہیں جو جاہلیّت کے زمانے میں نیک کام کرتے تھے، مگر مرے کفر و شرک ہی کی حالت میں تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی نیکی اُسے جہنّم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی، البتہ جہنّم میں اُس کو وہ سخت سزا نہ دی جائے گی جو ظالم اور فاسق اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔ مثلاً: حدیث میں آیا ہے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے اُس کو ہلکا عذاب دیا جائے گا۔ (رُوح المعانی)

تاہم یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبّہ کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کسی چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسی بہت سی نیکیاں مل کر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک بہت بڑی نیکی قرار پا سکتی ہیں، اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بدی کا ارتکاب بھی نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے گناہ مل کر گناہوں کا ایک انبار بن سکتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو متعدّد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عَدِیؓ بن حاتم سے یہ روایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”دوزخ کی آگ سے بچو، خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دینے یا ایک اچھی بات کہنے ہی کے ذریعے سے ہو۔“ اِنہی حضرت عَدِیؓ سے صحیح روایت میں حضوؐر کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ”کسی نیک کام کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ کسی پانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول ڈال دینا ہو، یا یہی نیکی ہو کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو۔“ بخاری میں حضرت ابوہُریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا: ”اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے، خواہ وہ بکری کا ایک کُھر ہی کیوں نہ ہو۔“ مُسْنَدِ احمد، نَسائی اور ابنِ ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضوؐر فرمایا کرتے تھے: ”اے عائشہؓ! ان گناہوں سے بچی رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی پُرسش بھی ہونی ہے۔“ مُسْنَدِ احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”خبردار! چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سب آدمی پر جمع ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیں گے۔“ (گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کے فرق کو سمجھنے کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۵۳۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۳۲)

تفہیم القرآن

العادیات

(۱۰۰)

العادیات

نام پہلے ہی لفظ الْعٰدِیٰتِ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اِس کے مکی اور مَدَنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، جابر، حَسَن بصری، عِکرِمہ اور عطا کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ حضرت اَنَسؓ بن مالک اور قَتَادَہ کہتے ہیں کہ مدنی ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سورت مکی ہے، اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن سورت کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے، بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دَوْر میں نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا مقصود لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اُس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ لوگوں کو اس بات سے خبردار بھی کرنا ہے کہ آخرت میں صرف اُن کے ظاہری افعال ہی کی نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے اَسرار تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔

اِس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اُس عام بد امنی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے سارا مُلک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کُشت و خون برپا تھا، لُوٹ مار کا بازار گرم تھا، قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چَین سے نہیں گزار سکتا تھا، کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قَباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لُٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لُوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لُوٹنے والے کی اپنی شامت آ جاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بُری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ اِس صورتِ حال کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں خدا کے حضور جواب دِہی سے ناواقف ہو کر انسان اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو ظلم و ستم اور غارت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ مال و دولت کی محبّت میں اندھا ہو کر ہر طریقے سے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور گھناؤنا طریقہ ہو، اور اُس کی حالت خود اِس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کر کے اس کی ناشکری کر رہا ہے۔ اُس کی یہ رَوِش ہرگز نہ ہوتی اگر وہ اُس وقت کو جانتا ہوتا جب قبروں سے زندہ ہو کر اُٹھنا ہوگا، اور جب وہ ارادے اور وہ اغراض و مقاصد تک دلوں سے نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے جن کی تحریک سے اُس نے دنیا میں طرح طرح کے کام کیے تھے۔ اُس وقت انسانوں کے رب کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور کس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

آیاتھا ۱۱ سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ

قسم ہے اُن (گھوڑوں) کی جو پُھنکارے مارتے ہوئے دَوڑتے ہیں[1]، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں[2]، پھر صبح سویرے چھاپا مارتے ہیں[3]، پھر اس موقع پر گرد و غبار اُڑاتے ہیں، پھر اِسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گُھستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا

۱- آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دَوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، بلکہ صرف وَالْعٰدِیٰتِ (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے مفسّرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کا ایک گروہ اِس طرف گیا ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں۔ لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضَبح کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدّتِ تَنَفُّس سے نکلتی ہے، اور بعد کی آیات بھی جن میں چنگاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپا مارنے اور وہاں گرد اُڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لیے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں۔ ابنِ جَریر کہتے ہیں کہ "دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابلِ ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ اُونٹ ضَبح نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضَبح کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُن دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضَبح کرتے ہیں۔" امام رازی کہتے ہیں کہ "اِن آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ ضَبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی، اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر سُموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا، اور اسی طرح صبح سویرے چھاپا مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعے سے سہل ہوتا ہے۔"

۲- چنگاریاں جھاڑنے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہیں، کیونکہ رات ہی کو ان کی ٹاپوں سے جھڑنے والے شرارے نظر آتے ہیں۔

۳- اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر اُنھیں چھاپا مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ دشمن خبردار نہ ہو سکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آ سکے، اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دُور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلے کے لیے تیار ہو جائے۔

لَكَنُودٌ ۝٦ وَإِنَّهُۥ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝٧ وَإِنَّهُۥ لِحُبِّ ٱلْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝٨

بڑا ناشکرا ہے[4]، اور وہ خود اِس پر گواہ ہے[5]، اور وہ مال و دولت کی محبّت میں بُری طرح مُبتلا ہے[6]۔

۴- یہ ہے وہ بات جس پر اُن گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پُھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر صبح سویرے غبار اُڑاتے ہوئے کسی بستی پر جا پڑتے ہیں اور مدافعت کرنے والوں کی جماعت میں گُھس جاتے ہیں۔ تعجب اِس پر ہوتا ہے کہ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے مراد غازیوں کے گھوڑے لیے ہیں اور جس مجمع میں ان کے جا گُھسنے کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے مراد اُن کے نزدیک کفار کا مجمع ہے۔ حالانکہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ ”انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔“ اب یہ ظاہر ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں غازیوں کے گھوڑوں کی دوڑ دھوپ اور کفار کے کسی مجمع پر اُن کا ٹوٹ پڑنا اِس امر پر کوئی دلالت نہیں کرتا کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے، اور نہ بعد کے یہ فقرے کہ انسان اپنی اس ناشکری پر خود گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبّت میں بُری طرح مبتلا ہے، اُن لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، اُن کا اشارہ دراصل اُس عام کُشت و خون اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اُس وقت برپا تھی۔ جاہلیّت کے زمانے میں رات ایک بہت خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کون سا دشمن اُن پر چڑھائی کرنے کے لیے آ رہا ہو، اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ رات خیریت سے گزر گئی۔ وہاں قبیلوں کے درمیان محض انتقامی لڑائیاں ہی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اِس غرض کے لیے بھی چھاپے مارتے رہتے تھے کہ ان کی دولت لُوٹ لیں، ان کے مال مویشی ہانک لے جائیں، اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیں۔ اس ظلم و ستم اور غارت گری کو، جو زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر ہی کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ اِس امر کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یعنی جس طاقت کو وہ جنگ و جدل اور غارت گری میں استعمال کر رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس لیے تو نہیں دی تھی کہ اس سے یہ کام لیا جائے۔ پس درحقیقت یہ بہت بڑی ناشکری ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اِن وسائل اور اس کی بخشی ہوئی اِن طاقتوں کو اُس فساد فی الارض میں استعمال کیا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

۵- یعنی اُس کا ضمیر اِس پر گواہ ہے، اُس کے اعمال اِس پر گواہ ہیں، اور بہت سے کافر انسان خود اپنی زبان سے علانیہ ناشکری کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک خدا ہی سرے سے موجود نہیں، کجا کہ وہ اپنے اُوپر اس کی کسی نعمت کا اعتراف کریں اور اس کا شکر اپنے ذمّے لازم سمجھیں۔

۶- اصل الفاظ ہیں: وَإِنَّهُۥ لِحُبِّ ٱلْخَيْرِ لَشَدِيدٌ۔ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ”وہ خیر کی محبّت میں بہت سخت ہے۔“ لیکن عربی زبان میں خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ مال و دولت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۰ میں خیر بمعنیٰ مال و دولت ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ بات کلام کے موقع و محل سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں خیر کا لفظ نیکی کے معنیٰ میں ہے اور کہاں مال و دولت کے معنیٰ میں۔ اِس آیت کے سیاق و سباق سے خود ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ ﴿٩﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ ﴿١٠﴾
اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿١١﴾ ع

تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے[7] گا، اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے[8] گی؟ یقیناً اُن کا رب اُس روز اُن سے خوب باخبر ہوگا۔[9] ع

کہ اِس میں "خیر" مال و دولت کے معنیٰ میں ہے، نہ کہ بھلائی اور نیکی کے معنیٰ میں، کیونکہ جو انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے خود اپنی ناشکری پر شہادت دے رہا ہے، اُس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نیکی اور بھلائی کی محبّت میں بہت سخت ہے۔

۷ – یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں کی شکل میں اُٹھایا جائے گا۔

۸ – یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار، اور ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرّکات (motives) چھُپے ہوئے ہیں، وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے، اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور بُرائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھُپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو جو کام انسان نے کیے، وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمّل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اُصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اُسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرّکات کارفرما رہے ہیں ان کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز اِن رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دکھا دیا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اِسی لیے حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنیٰ کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اُتار کر مغز نکالنا، اور مختلف قسم کی چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں

میں چھپے ہوئے اَسرار کی تحصیل میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ اُن کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی، اور ان کو چھانٹ کر بُرائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی۔ یہی مضمون سورۂ طارق میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ''جس روز پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال ہوگی۔'' (آیت ۹)

۹۔ یعنی اُس کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کس سزا یا جزا کا مستحق ہے۔

تفہیم القرآن

القارِعَہ

(۱۰۱)

القارِعَہ

نام پہلے لفظ اَلْقَارِعَۃُ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں سارا ذکر قیامت ہی کا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع ہے قیامت اور آخرت۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ کہہ کر چونکایا گیا ہے کہ عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ اِس طرح سامعین کو کسی ہولناک واقعے کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کرنے کے بعد دو فقروں میں ان کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے کہ اُس روز لوگ گھبراہٹ کے عالَم میں اِس طرح ہر طرف بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، ان کی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ دُھنکے ہوئے اُون کی طرح ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب لوگوں کا حساب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی تو اُس میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ کس شخص کے نیک اعمال برے اعمال سے زیادہ وزنی ہیں، اور کس کے نیک اعمال کا وزن اس کے بُرے اعمال کی بہ نسبت ہلکا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ عیش نصیب ہوگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اُس گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

---

۱۱ آیاتہا — سُوْرَۃُ الْقَارِعَۃِ مَکِّیَّۃٌ — ۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱ ع

عظیم حادثہ[1]! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔[2] پھر[3] جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا، اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے[4] اُس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی۔[5] اور تمھیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ۔[6] ع

۱ — اصل میں لفظ قارعہ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے: ”ٹھونکنے والی“۔ قَرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں جس سے سخت آواز نکلے۔ اس لُغوی معنی کی مناسبت سے قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں: قَرَعَتْهُمُ الْقَارِعَۃ، یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آ گئی ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی ایک جگہ یہ لفظ کسی قوم پر بڑی مصیبت نازل ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ رعد میں ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ”جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے۔“ (آیت ۳۱) لیکن یہاں القارعہ کا لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور سورۂ الحاقّہ میں بھی قیامت کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (آیت ۴) اِس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب و ثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالمِ آخرت کا یکجا ذکر ہو رہا ہے۔

۲ — یہاں تک قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ یعنی جب وہ حادثۂ عظیم برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا

نظام دَرہم بَرہم ہو جائے گا، اس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ و منتشر ہوتے ہیں، اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہوئے اُون کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ رنگ برنگ کے اُون سے پہاڑوں کو تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ اُن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

۳- یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے، جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔

۴- اصل میں لفظ مَوَازِین استعمال ہوا ہے جو مَوزُون کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور میزان کی جمع بھی۔ اگر اس کو مَوزُون کی جمع قرار دیا جائے تو مَوَازِین سے مراد وہ اعمال ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وزن ہو، جو اس کے ہاں کسی قدر کے مستحق ہوں۔ اور اگر اسے میزان کی جمع قرار دیا جائے تو مَوَازِین سے مراد ترازو کے پلڑے ہوں گے۔ پہلی صورت میں مَوَازِین کے بھاری اور ہلکے ہونے کا مطلب نیک اعمال کا بُرے اعمال کے مقابلے میں بھاری یا ہلکا ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف نیکیاں ہی وزنی اور قابلِ قدر ہیں۔ دوسری صورت میں مَوَازِین کے بھاری ہونے کا مطلب اللہ جَلَّ شانُہٗ کی میزانِ عدل میں نیکیوں کے پلڑے کا برائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہونا ہے، اور اُن کے ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں کا پلڑا بُرائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ عَرَبی زبان کے محاورے میں میزان کا لفظ وزن کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اِس معنیٰ کے لحاظ سے وزن کے بھاری اور ہلکا ہونے سے مراد بھلائیوں کا وزن بھاری یا ہلکا ہونا ہے۔ بہر حال مَوَازِین کو خواہ موزون کے معنیٰ میں لیا جائے، یا میزان کے معنیٰ میں، یا وزن کے معنیٰ میں، مدّعا ایک ہی رہتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی اعمال کی جو پونجی لے کر آیا ہے، وہ وزنی ہے، یا بے وزن، یا اس کی بھلائیوں کا وزن اُس کی بُرائیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر آیا ہے، جن کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے ”اور وزن اُس روز حق ہوگا، پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے۔“ (آیات ۸-۹) سورۂ کہف میں ارشاد ہوا: ”اے نبی! اِن لوگوں سے کہو: کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جُہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔“ (آیات ۱۰۴-۱۰۵) سورۂ انبیاء میں فرمایا: ”قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم لے آئیں گے، اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔“ (آیت ۴۷) اِن آیات سے معلوم ہوا کہ کفر اور حق سے انکار بجائے خود اتنی بڑی بُرائی ہے کہ وہ بُرائیوں کے پلڑے کو لازماً جھکا دے گی، اور کافر کی کوئی نیکی ایسی نہ ہوگی کہ بھلائیوں کے پلڑے میں اُس کا کوئی وزن ہو جس سے اُس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے

میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے ساتھ اُن نیکیوں کا وزن بھی جو اس نے دنیا میں کیں۔ دوسری طرف اُس کی جو بدی بھی ہوگی، وہ بدی کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آیا نیکی کا پلڑا جُھکا ہوا ہے یا بدی کا۔

۵ - اصل الفاظ ہیں: اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ، "اُس کی ماں ہاوِیہ ہوگی"۔ ہاوِیہ ہوِیٰ سے ہے، جس کے معنٰی اونچی جگہ سے نیچی جگہ گرنے کے ہیں اور ہاوِیہ اُس گہرے گڑھے کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے۔ جہنّم کو ہاویہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ بہت عمیق ہوگی اور اہلِ جہنّم اس میں اُوپر سے پھینکے جائیں گے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس کی ماں جہنم ہوگی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماں کی گود بچے کا ٹھکانا ہوتی ہے، اسی طرح آخرت میں اہلِ جہنّم کے لیے جہنّم کے سوا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔

۶ - یعنی وہ محض ایک گہری کھائی ہی نہ ہوگی بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

تفہیم القرآن

التکاثُر

(۱۰۲)

التکاثر

نام پہلی آیت کے لفظ التَّكَاثُرُ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابوحیّان اور شوکانی کہتے ہیں کہ یہ تمام مفسّرین کے نزدیک مکّی ہے، اور امام سُیُوطی کا قول ہے کہ مشہور ترین بات یہی ہے کہ یہ مکّی ہے، لیکن بعض روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر اسے مدنی کہا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

ابنِ ابی حاتم نے ابوبُرَیدہؓ کی رِوایت نقل کی ہے کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی الحرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کے مَفاخِر بیان کیے، پھر قبرستان جا کر اپنے اپنے مرے ہوئے لوگوں کے مَفاخِر پیش کیے۔ اس پر یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ لیکن شانِ نُزول کے بارے میں صحابہؓ وتابعینؒ کا جو طریقہ تھا، اُس کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو یہ روایت اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ سورۂ تکاثُر اسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اِن دونوں قبیلوں کے اِس فعل پر یہ سورت چسپاں ہوتی ہے۔

امام بخاری اور ابنِ جَرِیر نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کو کہ لو ان لابن اٰدم وادیین من مال لتمنّٰی وادیًا ثالثًا ولا یَمْلَأُ جوف ابن اٰدم الّا التراب (اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنّا کرے گا۔ ابنِ آدم کا پیٹ مٹّی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا) قرآن میں سے سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔" اس حدیث کو سورۂ تکاثُر کے مَدَنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ حضرت اُبَیؓ مدینے میں مسلمان ہوئے تھے۔ مگر حضرت اُبَیؓ کے اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحابۂ کرامؓ کس معنٰی میں حضورؐ کے اس ارشاد کو قرآن میں سے سمجھتے تھے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اسے قرآن کی ایک آیت سمجھتے تھے، تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ صحابہؓ کی عظیم اکثریت اُن اصحاب پر مشتمل تھی جو قرآن کے حرف حرف سے واقف تھے، ان کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ حدیث قرآن کی ایک آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں سے ہونے کا مطلب قرآن سے ماخوذ ہونا لیا جائے، تو اس روایت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینۂ طیّبہ میں جو اصحاب داخلِ اسلام ہوئے تھے، انھوں نے جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سورت سنی تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے، اور پھر حضورؐ کے مذکورۂ بالا ارشاد کے متعلق اُن

کو یہ خیال ہوا کہ وہ اِسی سورت سے ماخوذ ہے۔

ابن جَرِیر، ترمِذِی اور ابن المُنذِر وغیرہ محدثین نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ہم عذابِ قبر کے بارے میں برابر شک میں پڑے رہے، یہاں تک کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔“ اِس کو سورۂ تکاثُر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ عذابِ قبر کا ذکر مدینے ہی میں ہوا تھا، مکے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ قرآن کی مکّی سورتوں میں بکثرت مقامات پر قبر کے عذاب کا ایسے صریح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الأنعام، آیت ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ المومنون ۹۹-۱۰۰۔ المومن ۴۵-۴۶۔ یہ سب مکّی سورتیں ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ کے ارشاد سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا مکّی سورتوں کے نُزول سے پہلے سورۂ تکاثُر نازل ہو چکی تھی، اور اُس کے نُزول نے عذابِ قبر کے بارے میں صحابہؓ کے شک کو دُور کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اِن روایات کے باوجود مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکّی ہونے پر متفق ہے۔ ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ مکی سورت ہے، بلکہ اس کا مضمون اور اندازِ بیان یہ بتا رہا ہے کہ یہ مکّے کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

اس میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت، اور دنیوی فائدے اور لذّتیں اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اور انھی چیزوں کے حُصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور اِس ایک فکر نے اُن کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انھیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اِس کے بُرے انجام پر متنبّہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمھاری آزمایش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جواب دِہی کرنی ہوگی۔

---

۸ آیاتہا سُوۡرَۃُ التَّکَاثُرِ مَکِّیَّۃٌ ۱ رکوعاتہا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ كَلَّا سَوۡفَ

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے[1]، یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو[2]۔ ہرگز نہیں، عنقریب

۱- اصل میں اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ فرمایا گیا ہے، جس کے معنیٰ میں اتنی وسعت ہے کہ ایک پوری عبارت میں بمشکل اس کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

اَلْھٰکُمْ لَہْو سے ہے جس کے اصل معنیٰ غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں مُنہمِک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اِس مادّے سے جب اَلْھٰکُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لَہْو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمھیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اِس اِنہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

تکاثر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنیٰ ہیں: ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حُصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اِس بات پر فخر جتائیں کہ انھیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے معنیٰ ہوئے: تکاثُر نے تمھیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دھن نے تمھیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثُر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْھٰکُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْھٰکُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مُخاطَب کون لوگ ہیں۔ اِس عدمِ تصریح کی وجہ سے اِن الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثُر کے معنیٰ محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائل قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جُہد کرنا، ان کے حُصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اَلْھٰکُمْ کے مخاطَب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطَب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے، اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار

تَعْلَمُوْنَ ۝٣ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٤ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨

ع ۸ / ۲۴

تم کو معلوم ہو جائے گا۔[3] پھر (سُن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اِس رَوِش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔[4] ع

ہے اور اقوام پر بھی۔ اِسی طرح اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثُر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اُس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اِس تکاثُر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حُدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حق داروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملے میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں۔ انھیں معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اِس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ انھیں عیش و عشرت اور جسمانی لذّتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اِس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اِس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اِس رَوِش کا انجام کیا ہے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملے میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اِس بات کی فکر انھیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سروسامان ہے۔ غرض تکاثُر کی بے شمار صورتیں ہیں جنھوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انھیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذّتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔

۲ – یعنی تم اپنی ساری عمر اِسی کوشش میں کھپا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمھارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

۳ – یعنی تمھیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ عنقریب اِس کا بُرا انجام تمھیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لو گے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ اَزَل سے اَبَد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے، اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت

بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہے، اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کُھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے، وہ اس کے لیے سعادت وخوش بختی کا ذریعہ تھے یا بدانجامی و بدبختی کا ذریعہ۔

۴- اس فقرے میں ''پھر'' کا لفظ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جواب طلبی کی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر یہ خبر بھی ہم تمھیں دیے دیتے ہیں کہ تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سوال عدالتِ الٰہی میں حساب لینے کے وقت ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متعدّد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بندوں کو دی ہیں ان کے بارے میں جواب دِہی مومن و کافر سب ہی کو کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں نے کُفرانِ نعمت نہیں کیا اور شکر گزار بن کر رہے وہ اس محاسبے میں کامیاب رہیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے قول یا عمل سے، یا دونوں سے ان کی ناشکری کی وہ اس میں ناکام ہوں گے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہم نے آپؐ کو تر و تازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ''یہ اُن نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔'' (مُسْنَدِ احمد، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابن المُنْذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ، عَبد بن حُمَید، بَیْہَقی فی الشُّعَب)

حضرت ابوہریرہؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ چلو، ابوالہَیْثَم بن التَّیِّہان انصاریؓ کے ہاں چلیں۔ چنانچہ ان کو لے کر آپؐ ابن التَّیِّہانؓ کے نخلستان میں تشریف لے گئے۔ انھوں نے لا کر کھجوروں کا ایک خوشہ رکھ دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: تم خود کیوں نہ کھجوریں توڑ لائے؟ انھوں نے عرض کیا: میں چاہتا تھا کہ آپ حضرات خود چھانٹ چھانٹ کر کھجوریں تناول فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے کھجوریں کھائیں اور ٹھنڈا پانی پیا۔ فارغ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں تمھیں قیامت کے روز جواب دِہی کرنی ہوگی، یہ ٹھنڈا سایہ، یہ ٹھنڈی کھجوریں، یہ ٹھنڈا پانی۔'' (اِس قصّے کو مختلف طریقوں سے مسلم، ابنِ ماجہ، ابوداؤد، تِرمِذی، نَسائی، ابنِ جَرِیر اور ابویعلیٰ وغیرہم نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے، جن میں سے بعض میں اُن انصاری بزرگ کا نام لیا گیا ہے اور بعض میں صرف انصار میں سے ایک شخص کہا گیا ہے۔ اس قصّے کو مختلف طریقوں سے متعدّد تفصیلات کے ساتھ ابنِ ابی حاتم نے حضرت عمرؓ سے، اور امام احمدؒ نے ابوعَسیبؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سے نقل کیا ہے۔ ابنِ حِبّان اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں پیش آیا تھا۔)

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوال صرف کفار ہی سے نہیں، مومنینِ صالحین سے بھی ہوگا۔ رہیں خدا کی وہ نعمتیں جو اُس نے انسان کو عطا کی ہیں، تو وہ لامحدود ہیں، اُن کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں کہ انسان کو اُن کی خبر بھی نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا، ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم اُن کا پورا شمار نہیں کر سکتے۔'' (ابراہیم: ۳۴) اِن نعمتوں میں سے بے حدوحساب نعمتیں تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ

نے براہِ راست انسان کو عطا کی ہیں، اور بکثرت نعمتیں وہ ہیں جو انسان کو اُس کے اپنے کسب کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ انسان کے کسب سے حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اُس کو جواب دِہی کرنی پڑے گی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں اُسے حساب دینا ہوگا کہ اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ اور مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے متعلق اُس کو بتانا پڑے گا کہ آیا اُس نے اِس امر کا اعتراف کیا تھا کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر دل، زبان اور عمل سے اُس کا شکر ادا کیا تھا؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا ہے؟ یا یہ خیال کیا تھا کہ بہت سے خدا ان کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ عقیدہ رکھا تھا کہ یہ ہیں تو خدا ہی کی نعمتیں، مگر ان کے عطا کرنے میں بہت سی دوسری ہستیوں کا بھی دخل ہے اور اِس بنا پر اُنھیں معبود ٹھیرا لیا تھا اور اُنھی کے شکریے ادا کیے تھے؟

تفہیم القرآن

العَصر

(۱۰۳)

العَصر

نام پہلی آیت کے لفظ اَلْعَصْرِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اگرچہ مجاہد، قتَادَہ اور مُقاتل نے اِسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اِس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ اُن کو سن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں، اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اِس کے اندر چند جچے تُلے الفاظ میں معنٰی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے، جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اِس میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعیؒ نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اِس سورت پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی نگاہ میں اِس کی اہمیّت کیا تھی، اُس کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حِصْن الدّارمی ابومَدِینہ کی رِوایَت کے مطابق اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے، جب تک ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سنا لیتے۔ (طَبَرانی)

---

۳ آیاتھا — سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ — ۱ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿٢﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾

ع ۲۸

زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔[1]

ا- اِس سورت میں زمانے کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اِس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان۔ (۲) عملِ صالح۔ (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا۔ (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اب اِس کے ایک ایک جُز کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے، تاکہ اس ارشاد کا پورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اِس سے پہلے بارہا ہم اِس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اِس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی، جس میں حال درحقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر آن گزر کر ماضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر آن آ کر مستقبل کو حال، اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے دونوں طرح کے زمانے اُس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے، وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے، وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اُس کی مثال اُس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالبِ علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے، اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سُوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اِسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ

چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے، اور خدا کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں، خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ تاہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سُوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اِس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں، سب کچھ اُس محدود مدّتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازیؒ نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے سورۂ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گُھلا جا رہا ہے، رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گُھلا جا رہا ہے۔ اُس کی یہ بات سُن کر میں نے کہا: یہ ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا مطلب۔ عُمر کی جو مدّت انسان کو دی گئی ہے، وہ برف کے گُھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اِس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صَرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔" پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اِس سورہ میں کہی گئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ اِن چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مُہلتِ عمر کو صَرف کر رہا ہے، وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو اِن چاروں صفات سے مُتّصِف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالبِ علم سے، جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالبِ علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو مُستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متّصف ہوں، اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اِسمِ جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام اور پوری نوعِ انسانی پر یکساں ہوتا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہوگا، خواہ اُن سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لیے مُہلک ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زہر بہر حال مہلک ہے، خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پوری قوم، یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ زہر کی مُہلک خاصیّت اپنی جگہ اٹل ہے، اُس میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھایا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اِجماع اس پر ہو گیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اِسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورۂ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اِس قاعدۂ کُلّیّہ میں اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص اُن سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بدعملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگیِ نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآنِ مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لُغت کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اِس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں گھاٹا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب

سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ قرآنِ مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصورِ فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصورِ خُسران بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خُسران، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اِس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں، اس لیے اُن کے اعادے کی حاجت نہیں ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۔ الانفال، حاشیہ ۳۰۔ یونُس، حاشیہ ۲۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۷۔ المومنون، حواشی ۱-۲-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۔ الزُّمَر، حاشیہ ۳۴) اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسارہ وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اِس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اِسی دنیا میں خسارہ ہے، اور جس چیز کو لوگ خسارہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خسارہ نہیں ہے بلکہ اِس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اِس حقیقت کو قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۳۔ طٰہٰ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد ششم، اللّیل، حواشی ۳-۵) پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ "درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے"، تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اِس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اِس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اِس سورت کی رُو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآنِ مجید میں محض زبانی اقرارِ ایمان کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷، المائدہ، آیت ۵۴- الانفال، آیت ۲۰-۲۷، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصّف، آیت ۲ میں)، لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنیٰ ہی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اِس لفظ کے یہی معنیٰ ہیں۔ لُغت میں اٰمَنَ لَہٗ کے معنیٰ ہیں: صَدَّقَهٗ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ (اُس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا) اور اٰمَنَ بِهٖ کے معنیٰ ہیں: اَيْقَنَ بِهٖ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو اِن آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا۔ (الحجرات: ۱۵)	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حٰم السجدہ: ۳۰)	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (الانفال: ۲)	جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۶۵)	اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبّت رکھتے ہیں۔
فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (النساء: ۶۵)	پس نہیں، (اے نبیؐ!) تمھارے رب کی قسم! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمھیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

اِن سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ۔ (النساء: ۱۳۶)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآنِ مجید میں پوری طرح اِس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس سے مراد اوّلاً، اللہ کو ماننا ہے۔ محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اِس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اِس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دُعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکّل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اِسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاؑ اور کُتبِ الٰہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسولؐ نے دی ہیں۔ ثالثاً، آخرت کو ماننا، اِس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اِس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اِس محاسبے میں جو لوگ نیک قرار پائیں انھیں جزا اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے، جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو، وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے، جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے، وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رُو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عملِ صالح نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں ہر جگہ عملِ صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اِس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عملِ بلا ایمان پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عملِ صالح محض ایک دعویٰ ہے، جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اِس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اِسی بنا پر قرآنِ پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں اُنھی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عملِ صالح کریں، اور یہی بات اِس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر عملِ صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورۂ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہییں۔ اِس کے بعد یہ سورت دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اوّل تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اِس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے، اور بالعُموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ایک، صحیح اور سچی اور مطابقِ عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو، یا بندوں کا حق، یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں، بلکہ اِس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اُٹھائے، کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راست بازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حُقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اِس طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ

خُسران سے نہیں بچ سکتا، اور اِس خُسران میں وہ لوگ بھی آخرِ کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۂ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، اور اِس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (آیات ۷۸-۷۹) پھر اِسی بات کو سورۂ اَعراف میں اِس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کُھلّم کُھلاّ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا، اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اِس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶) اور اِسی بات کو سورۂ اَنفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ (آیت ۲۵) اِسی لیے امر بالمعروف اور نہی عَنِ المنکر کو اُمّتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آلِ عمران: ۱۰۴)، اور اُس امت کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہلِ ایمان اور اُن کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اِس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مَشقّتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمّت بندھاتا رہے کہ وہ اِن حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ششم، الدَّہر، حاشیہ ۱۶۔ البَلَد، حاشیہ ۱۴)

تفہیم القرآن

الھمزہ

(۱۰۴)

الھمزۃ

نام

پہلی آیت کے لفظ ھُمَزَۃٍ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اِس کے مکّی ہونے پر تمام مفسّرین کا اتفاق ہے، اور اس کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

اِس میں چند ایسی اخلاقی بُرائیوں کی مَذمّت کی گئی ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں زر پرست مال داروں کے اندر پائی جاتی تھیں، جنھیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ بُرائیاں فی الواقع اُس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور جن کو سب ہی بُرا سمجھتے تھے، کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اِس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن لوگوں کا کیا انجام ہوگا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک طرف یہ کردار، اور دوسری طرف آخرت میں اُس کا یہ انجام) ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اِس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اِس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے، اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھُولتے ہی نظر آتے ہیں، اس لیے آخرت کا برپا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔

اِس سورت کو اگر اُن سورتوں کے تسلسُل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورۂ زِلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکّۂ معظمہ کے ابتدائی دَور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اُس کی اَخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زِلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اُس کے سامنے نہ آ جائے۔ سورۂ عادیات میں اُس لُوٹ مار، کُشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اُس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اِسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمھارے افعال ہی کی نہیں، تمھاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی، اور تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورۂ قارِعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا بُرے انجام کا انحصار اِس پر ہوگا کہ اُس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثُر میں اُس مادّہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش و آرام اور جاہ و منزلت زیادہ سے زیادہ حاصل

کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اِس غفلت کے بُرے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی خوانِ یَغما نہیں ہے کہ اُس پر تم جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمھیں مل رہی ہے، اُس کے لیے تمھیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا، اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتّٰی کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے، اگر اُس کے افراد میں ایمان و عملِ صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اِس کے معاً بعد سورۂ ہُمَزَہ آتی ہے، جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟

آیاتہا ۹ — سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾ ع

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (مُنہ در مُنہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) بُرائیاں کرنے کا خُوگر ہے[1]۔ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گِن گِن کر رکھا[2]۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا[3]۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چُور کر دینے والی[4] جگہ میں پھینک دیا جائے گا[5]۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چُور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ[6]، خُوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی[7]۔ وہ اُن پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی[8] (اِس حالت میں کہ وہ) اُونچے اُونچے ستونوں میں (گھِرے ہوئے ہوں[9] گے)۔ ع

۱- اصل الفاظ ہیں: ھُمَزَةٍ لُّمَزَةِ۔ عربی زبان میں ھَمْز اور لَمْز معنیٰ کے اعتبار سے باہم اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں ہم معنیٰ استعمال ہوتے ہیں، اور کبھی دونوں میں فرق ہوتا ہے، مگر ایسا فرق کہ خود اہلِ زبان میں سے کچھ لوگ ھَمْز کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ وہی مفہوم لَمْز کا بیان کرتے ہیں، اور اس کے برعکس کچھ لوگ لَمْز کے جو معنیٰ بیان کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے نزدیک ھَمْز کے معنیٰ ہیں۔ یہاں چونکہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں اور ھُمَزَةٍ لُّمَزَةِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس لیے دونوں مل کر یہ معنیٰ دیتے ہیں کہ اُس شخص کی عادت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، کسی کو دیکھ کر اُنگلیاں اُٹھاتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا ہے، کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی ذات میں کیڑے نکالتا ہے، کسی پر منہ در منہ چوٹیں کرتا ہے، کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائیاں کرتا ہے، کہیں چغلیاں کھا کر اور لگائی بجھائی کر کے دوستوں کو لڑواتا اور کہیں بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے، لوگوں کے بُرے بُرے نام رکھتا ہے، اُن پر چوٹیں کرتا ہے اور اُن کو

عیب لگاتا ہے۔

۲- پہلے فقرے کے بعد یہ دوسرا فقرہ خود بخود یہ معنیٰ دیتا ہے کہ لوگوں کی یہ تحقیر و تذلیل وہ اپنی مال داری کے غرور میں کرتا ہے۔ مال جمع کرنے کے لیے جَمَعَ مَالًا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر گِن گِن کر رکھنے کے الفاظ سے اُس شخص کے بُخل اور زر پرستی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

۳- دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے اُس کا مال اُسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا، یعنی دولت جمع کرنے اور اُسے گِن گِن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اُسے اپنی موت یاد نہیں رہی ہے اور اُسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت اُس کو یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پڑے گا۔

۴- اصل میں لفظ حُطَمَة استعمال کیا گیا ہے جو حَطْم سے ہے۔ حَطْم کے معنیٰ توڑنے، کچل دینے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں۔ جہنّم کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جو چیز بھی اُس میں پھینکی جائے گی، اُسے وہ اپنی گہرائی اور اپنی آگ کی وجہ سے توڑ کر رکھ دے گی۔

۵- اصل میں لَیُنْۢبَذَنَّ فرمایا گیا ہے۔ نَبذ عربی زبان میں کسی چیز کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اِس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنی مال داری کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے، لیکن قیامت کے روز اُسے حقارت کے ساتھ جہنّم میں پھینک دیا جائے گا۔

۶- قرآنِ مجید میں اِس مقام کے سوا اور کہیں جہنّم کی آگ کو اللہ کی آگ نہیں کہا گیا ہے۔ اِس مقام پر اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے نہ صرف اُس کی ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی دولت پا کر غرور و تکبّر میں مبتلا ہو جانے والوں کو اللہ کس قدر سخت نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جس کی وجہ سے اُس نے اُس آگ کو خاص اپنی آگ کہا ہے جس میں وہ پھینکے جائیں گے۔

۷- اصل الفاظ ہیں: تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ - تَطَّلِعُ اِطّلَاع سے ہے، جس کے ایک معنیٰ چڑھنے اور اُوپر پہنچ جانے کے ہیں، اور دوسرے معنیٰ باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے۔ اَفْئِدَة فُؤاد کی جمع ہے جس کے معنیٰ دل کے ہیں، لیکن یہ لفظ اُس عُضو کے لیے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے، بلکہ اُس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شُعور و اِدراک، اور جذبات و خواہشات اور عقائد و افکار، اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اُس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے بُرے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات و جذبات، خبیث نیتوں اور ارادوں کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے، بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر اس کے جرم کی نوعیت معلوم کرے گی اور ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دے گی۔

۸- یعنی جہنّم میں مجرموں کو ڈال کر اُوپر سے اُس کو بند کر دیا جائے گا۔ کوئی دروازہ تو درکنار، کوئی جِھری تک کھلی ہوئی نہ ہوگی۔

۹- فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہنّم کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر اُونچے اُونچے ستون گاڑ دیے جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مجرم اُونچے اُونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ تیسرا مطلب ابنِ عباسؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ اُس آگ کے شعلے لمبے ستونوں کی شکل میں اُٹھ رہے ہوں گے۔

تفہیم القرآن

الفیل

(۱۰۵)

الفِیل

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَصْحٰبِ الْفِیْلِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے۔ اور اِس کے تاریخی پَس منظر کو اگر نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکّۂ معظّمہ کے بھی ابتدائی دَور میں ہُوا ہوگا۔

تاریخی پَس منظر اِس سے پہلے تفسیر سورۂ بُروج، حاشیہ ۴ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجران میں یمن کے یہودی فرماں روا ذُونُواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اُس کا بدلہ لینے کے لیے حَبَش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حِمیَری حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۵۲۵ء میں اِس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حَبَش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حَبَش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اُسی کے ذریعے سے یمن کے ساحل پر اُتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اِس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اِس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقا، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آ رہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ اُس کے منافع پورے کے پورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اِس مقصد کے لیے ۲۴ یا ۲۵ قبلِ مسیح میں قیصر آگسٹَس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیَس گالوس (Aelius Gallus) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اُتار دی تھی، تاکہ وہ اُس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ (اِس شاہراہ کا نقشہ ہم نے تفہیم القرآن، جلد دوم میں صفحہ ۱۲۲ پر درج کیا ہے)۔ لیکن عرب کے شدید جغرافی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑا بحرِ احمر میں لے آئے اور انھوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف برّی راستہ اُن کے لیے باقی رہ گیا۔ اِسی برّی راستے کو قبضے میں لینے کے لیے انھوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی، اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط، دوسرا اَبْرَہَہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اَریاط تھا، اور اَبْرَہَہ اُس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اِس بات پر متفق ہیں کہ اَبْرَہَہ اور اَرْیاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اَریاط مارا گیا، ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہِ حبش کو اِس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اُسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اِس کے برعکس یونانی اور سُریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتحِ یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو اُن میں سے ایک سردار اَلسُّمَیْفَع اَشْوَع (جسے یونانی مؤرخین Esymphaeus لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جِزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہِ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کرلیا۔ لیکن حبشی فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور اَبْرَہَہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا، جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر ورسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں، وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخرِ کار شاہِ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا۔ (یونانی مؤرخین اُس کا نام اَبرامس (Abrames) اور سُریانی مؤرخین ابراہام (Abraham) لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اسی کا حبشی تلفُّظ ہے، کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفظ ابراہیم ہے)۔

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خُود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہِ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مُفَوَّض المَلِک (نائبِ شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر ورُسوخ حاصل کر لیا تھا، اُس کا اندازہ اِس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سَدِ مَآرِب کی مَرَمَّت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حِیْرَہ اور شاہِ غَسّان کے سُفَرا شریک ہوئے۔ اِس کا مفصَّل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سَدِ مَآرِب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر (Glaser) نے اس کو نقل کیا ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سَبا، حاشیہ ۳۷)

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بِلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اِس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کش مکشِ اقتدار نے بِلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

اَبْرَہَہ نے اِس مقصد کے لیے یمن کے دارالسلطنت صَنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا، جس کا ذکر عرب مؤرخین نے اَلْقَلِیْس یا اَلْقُلَّیْس یا اَلْقُلَیْس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ Ekklesia کا

مُعَرَّب ہے اور اُردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اِس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج، کعبہ سے اِس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔[1] ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ اُس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اِس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی مُنادی کرا دی۔ اس کی اِس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصہ دلائے، تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو مکے پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اِس اعلان پر غضب ناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھُس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ اِن میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دَور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندہ کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کر لے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب ابرہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

اِس کے بعد وہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُونَفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ پھر خَثْعَم کے علاقے میں ایک عرب سردار نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بَدْرَقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثَقیف نے محسوس کیا کہ اِتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اُن کے معبود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر ابرہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بُت کدہ وہ مَعْبَد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے مَعْبَد کو چھوڑ دیں، ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بَدْرَقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی، اور بنی ثَقیف نے ابو رِغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمَّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابو رِغال مر گیا، اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ بنی ثَقیف کو

1 یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے نَجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم تفسیر سورۂ بروج، حاشیہ ۴ میں کر چکے ہیں۔

بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ اُنھوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المُغَمَّس سے اَبرہہ نے اپنے مُقَدِّمَۃُ الجَیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تِہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لُوٹ لے گیا، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمُطّلِب کے بھی دو سو اُونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعے سے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اِس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمھاری جان و مال سے کوئی تَعَرُّض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبدالمُطّلِب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر اَبرہہ کا پیغام پہنچایا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم میں اَبرَہَہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچا لے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ اَبرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ اُن کو دیکھ کر اَبرہہ بہت متاثّر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جو اُونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ اَبرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثّر ہوا تھا، مگر آپ کی اِس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مَرجَع ہے، اِس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا: میں تو صرف اپنے اُونٹوں کا مالک ہوں اور انھی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اِس کا ایک رب ہے، وہ اِس کی حفاظت خود کرلے گا۔ اَبرہہ نے جواب دیا: وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمُطّلِب نے کہا: آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ اَبرہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اُس نے اُن کے اُونٹ واپس کر دیے۔

ابنِ عباسؓ کی روایت اِس سے مختلف ہے۔ اُس میں اُونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حُمید، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُوَیہ، حاکم، ابو نُعَیم اور بَیہَقی نے اُن سے جو روایات نقل کی ہیں، اُن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اَبرہہ اَلصِّفاح کے مقام پر پہنچا (جو عَرَفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حُدودِ حَرَم کے قریب واقع ہے) تو عبدالمُطّلِب خود اُس کے پاس گئے اور اس سے کہا: آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے، یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمُطّلِب نے کہا: یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اِس پر مسلَّط نہیں ہونے دیا ہے۔ اَبرہہ نے جواب دیا: ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمُطّلِب نے کہا: آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر اَبرہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمُطّلِب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اِس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو اِن میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ اَحزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے۔ وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ اَبرہہ کی لشکر گاہ سے واپس آ کر عبدالمُطّلِب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حَرَم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کُنڈا پکڑ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے، مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھول گئے اور انھوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ اُن کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں، ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابنِ ہِشام نے سیرت میں عبدالمُطّلِب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لاھُمَّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حِلالکْ

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تُو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

لا یغلبنّ صلیبھم و مِحالھم غدوًا مِحالکْ

کل اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے۔

ان کنت تارکھم و قِبلتنا فامر ما بدالک

اگر تُو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تُو چاہے کر۔

سُہَیلی نے رَوضُ الاُنُف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

وانصرنا علیٰ اٰل الصّلیبِ وعابدیہ الیوم اٰلکْ

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما۔

ابنِ جَرِیر نے عبدالمُطّلِب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے انھوں نے پڑھے تھے:

یا ربّ لا ارجولھم سواکا یا ربّ فامنع منھم حِماکا

اے میرے رب! تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے اُمید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب! ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر۔

ان عدوّ البیت من عاداکا امنعھم ان یخربوا قراکا

اِس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک۔

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمُطّلِب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز اَبرَہہ مکے میں

داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اُس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبرَ مارے گئے، آنکسوں سے کَچوکے دیے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہِلا۔ اُسے جنوب، شِمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اِس لشکر پر اُن سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے، اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عِکرِمہ کی رِوایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بِلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اُسے سخت کُھجلی لاحق ہو جاتی اور کُھجاتے ہی جِلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباسؓ کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود اَبرَہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا، اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا، وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں اِن لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی کو، جسے یہ لوگ بَذرَقہ بنا کر بِلادِ خَثْعَم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انھوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفرّ والالٰہ الطالبُ والاشرم المغلوب لیس الغالبُ

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جب کہ خدا تعاقب کر رہا ہے اور نکٹا (اَبرَہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطا بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اُسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ اَبرَہہ بھی بلادِ خَثْعَم پہنچ کر مرا۔[1]

یہ واقعہ مُزدَلِفہ اور مِنٰی کے درمیان وادیِ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی رِوایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حَجَّۃ الوداع کا جو قصّہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے نقل کیا ہے، اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزدَلِفہ سے مِنٰی کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپؐ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نَوَوِی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اِسی جگہ پیش آیا تھا، اس لیے سنّت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ مُوَطّا میں امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مُزدَلِفہ پورا

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں اُن کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی، جگہ جگہ یمنی سردار عَلَم بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذِی یَزَن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی صرف ایک ہزار فوج، جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

کا پورا ٹھیرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں نہ ٹھیرا جائے۔ نُفَیل بن حبیب کے جو اشعار ابنِ اسحاق نے نقل کیے ہیں، ان میں وہ اِس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

رُدَینۃُ لو رأیتِ ولا تَریہ لدٰی جنب المحصَّب ما رأینا

اے رُدَینہَ! کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادیِ مُحَصَّب کے قریب دیکھا۔

حمدتُ اللّٰہ اذا بصرت طیرًا و خفت حجارۃ تلقٰی علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا، اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آ پڑیں۔

وکلّ القوم یسأل عن نُفَیل کأن علیّ للحبشان دَینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفَیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اُوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی اور اس پر بہت سے شعرا نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اِعجاز قرار دیا اور کہیں اشارتاً وکنایتاً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں اُن بُتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِّبَعْرٰی کہتا ہے:

ستّون الفا لم یؤبوا ارضھم و لم یعش بعد الایاب سقیمھا

۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جاسکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (اَبرہہ) زندہ رہا۔

کانت بھا عاد و جرھم قبلھم واللّٰہ من فوق العباد یقیمھا

یہاں ان سے پہلے عاد اور جُرہُم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اُوپر موجود ہے جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہے۔

ابوقَیس بن اَسلَت کہتا ہے:

فقوموا فصلّوا ربکم و تمسّحوا بارکان ھٰذا البیت بین الاخاشب

اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ وِمنٰی کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو۔

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردّھم جنود الملیک بین ساف و حاصب

جب عرش والے کی مدد تمھیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اِس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمِّ ہانیؓ اور حضرت زُبَیر بن العَوّامؓ کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش نے ۱۰ سال (اور بروایتِ بعض، سات سال) تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُمِّ ہانیؓ کی روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور طَبَرانی، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور بَیہَقی نے اپنی کُتُبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زُبَیرؓ کا بیان طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیَہ اور ابنِ عَساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اِس کی تائیدِ مزید حضرت سعید بن المُسَیَّب کی اُس مُرسَل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اُسے عامُ الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اُسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور موٴرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحابُ الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپؐ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

مقصودِ کلام جو تاریخی تفصیلات اُوپر درج کی گئی ہیں، ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سورہ میں اِس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہلِ عرب اس بات کے قائل تھے کہ اَبرہہ کے اِس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اِس واقعے سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ اُنھوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں اِن تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خُصوصاً، اور اہلِ عرب عُموماً، اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں، وہ آخر اِس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام دوسرے معبُودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اِس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے اُنھوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا، اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔

آیاتہا ۵ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵ ع

تم نے دیکھا نہیں[1] کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا[2]؟ کیا اُس نے اُن کی تدبیر[3] کو اکارت نہیں کردیا[4]؟ اور اُن پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیج دیے[5]، جو اُن پر پکّی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے[6]، پھر اُن کا یہ حال کردیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بُھوسا[7]۔ ع

۱ – خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر اصل مخاطب نہ صرف قریش، بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں، جو اِس سارے قصّے سے خوب واقف تھے۔ قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اُن سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے۔ (مثال کے طور پر آیاتِ ذیل مُلاحظہ ہوں: ابراہیم، آیت ۱۹۔ الحج ۱۸-۶۵۔ النور ۴۳۔ القمان ۲۹-۳۱۔ فاطر ۲۷۔ الزُّمر ۲۱) پھر دیکھنے کا لفظ اس مقام پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مکہ اور اطرافِ مکہ اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکہ سے یمن تک ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا، کیونکہ اِس واقعے کو گزرے ہوئے چالیس پینتالیس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا، اور سارا عرب ہی اس کی ایسی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سُن چکا تھا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔

۲ – یہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی تفصیل اس امر کی بیان نہیں کی کہ یہ ہاتھی والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے، اور کس غرض کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ یہ باتیں سب کو معلوم تھیں۔

۳ – اصل میں لفظ کَیْدَ استعمال کیا گیا ہے جو کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساٹھ ہزار کا لشکر کئی ہاتھی لیے ہوئے علانیہ یمن سے مکہ آیا تھا، اور اُس نے یہ بات چُھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ جو بات خفیہ تھی، وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر قریش کو کچل کر، اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اِس غرض کو انھوں نے چُھپا رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ اُن کے کلیسا کی جو بے حُرمتی عربوں نے کی ہے،

اس کا بدلہ وہ اُن کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔

۴ – اصل الفاظ ہیں: فِیْ تَضْلِیْلٍ، یعنی ان کی تدبیر کو اُس نے ”گمراہی میں ڈال دیا“۔ لیکن محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کرنے کا مطلب اُسے ضائع کر دینا اور اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام کر دینا ہے جیسے ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں: فلاں شخص کا کوئی داؤں نہ چل سکا، یا اس کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ، ”مگر کافروں کی چال اَکارت ہی گئی۔“ (المومن: ۲۵) اور دوسری جگہ ارشاد ہوا: وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ”اور یہ کہ اللہ خائنوں کی چال کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔“ (یوسف: ۵۲) اہلِ عرب اِمْرَؤُ القیس کو اَلْمَلِکُ الضِّلِّیْل، ”ضائع کرنے والا بادشاہ“ کہتے تھے، کیونکہ اس نے اپنے باپ سے پائی ہوئی بادشاہی کو کھو دیا تھا۔

۵ – اصل میں طَیْرًا اَبَابِیْلَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں، اس لیے ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اَبْرَہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن عَرَبی زبان میں ابابیل کے معنٰی ہیں: بہت سے متفرق گروہ جو پے درپے مختلف سَمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے۔ عِکْرِمَہ اور قَتَادَہ کہتے ہیں کہ یہ جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے، بحرِ احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جُبَیر اور عِکْرِمَہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے، اور نہ تِہامَہ یعنی حجاز اور بحرِ احمر کے درمیان ساحلی علاقے کے۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کُتے جیسے۔ عِکْرِمَہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب راویوں کا مُتّفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر۔ مکّہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدّت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابو نُعَیم نے نَوفَل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھے۔ ابنِ عباسؓ کی رِوایت ابو نُعَیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے، اور ابنِ مَرْدُوْیَہ کی رِوایت میں ہے کہ بکری کی مینگنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے، اُن میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا۔

۶ – اصل الفاظ ہیں: بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ، یعنی سِجّیل کی قسم کے پتھر۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گِل کا مُعَرَّب ہے اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہوا اور پک کر سخت ہو گیا ہو۔ قرآنِ مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سورۂ ہود، آیت ۸۲ اور سورۂ حِجر، آیت ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ قومِ لُوط پر سِجّیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے، اور انھی پتھروں کے متعلّق سورۂ ذاریات، آیت ۳۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ، یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور، جنھوں نے عہدِ حاضر میں قرآنِ مجید کے معانی و مطالب کی تحقیق پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، اِس آیت میں تَرْمِیْهِمْ کا فاعل اہلِ مکّہ اور دوسرے اہلِ عرب کو قرار دیتے ہیں جو اَلَمْ تَرَ کے مُخاطَب ہیں، اور پرندوں کے متعلّق فرماتے ہیں کہ وہ سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے، بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھائیں۔ اِس تاویل کے لیے جو دلائل اُنھوں نے دیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبد المُطّلِب کا اَبْرَہَہ کے پاس جا کر کعبہ کے بجائے اپنے اُونٹوں کا

مطالبہ کرنا کسی طرح باور کرنے کے قابل بات نہیں ہے، اور یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں نے، جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حملہ آور فوج کا کوئی مقابلہ نہ کیا ہو اور کعبے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ پہاڑوں میں جا چھپے ہوں۔ اس لیے صورتِ واقعہ دراصل یہ ہے کہ عربوں نے اَبْرَہَہ کے لشکر کو پتھر مارے، اور اللہ تعالیٰ نے پتھراؤ کرنے والی طوفانی ہوا بھیج کر اس لشکر کا بُھرکس نکال دیا، پھر پرندے اُن لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، رِوایت صرف یہی نہیں ہے کہ عبدالمُطّلِب اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کرنے گئے تھے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اُونٹوں کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور اَبْرَہَہ کو خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام معتبر روایات کی رو سے ابرہہ کا لشکر محرّم میں آیا تھا جب کہ حُجّاج واپس جا چکے تھے۔ اور یہ بھی ہم نے بتا دیا ہے کہ ۶۰ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس کا کام نہ تھا، وہ تو غَزْوَۂ اَحزاب کے موقع پر بڑی تیاریوں کے بعد مشرکینِ عرب اور یہودی قبائل کی جو فوج لائے تھے وہ دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی، پھر بھلا وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتے تھے۔ تاہم اِن ساری دلیلوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف سورۂ فیل کی ترتیبِ کلام کو دیکھا جائے تو یہ تاویل اُس کے خلاف پڑتی ہے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ پتھر عربوں نے مارے، اور اصحابِ فیل بُھس بن کر رہ گئے، اور اس کے بعد پرندے ان کی لاشیں کھانے کو آئے، تو کلام کی ترتیب یوں ہوتی کہ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ. وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (تم ان کو پکّی ہوئی مٹی کے پتھر مار رہے تھے، پھر اللہ نے اُن کو کھائے ہوئے بُھس جیسا کر دیا، اور اللہ نے اُن پر جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بھیج دیے)۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جُھنڈ بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، پھر اُس کے مُتّصِلاً بعد تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ (جو اُن کو پکی ہوئی مٹی کے پتھر مار رہے تھے) فرمایا ہے، اور آخر میں کہا ہے کہ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بُھس جیسا کر دیا۔

۷ – اصل الفاظ ہیں: كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ۔ عَصف کا لفظ سورۂ رحمٰن، آیت ۱۲ میں آیا ہے: ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ، ''اور غلّہ بُھوسے اور دانے والا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ عَصف کے معنیٰ اُس چھلکے کے ہیں جو غلّے کے دانوں پر ہوتا ہے اور جسے کسان دانے نکال کر پھینک دیتے ہیں، پھر جانور اُسے کھاتے بھی ہیں، اور کچھ ان کے چبانے کے دوران میں گِرتا بھی جاتا ہے، اور کچھ ان کے پاؤں تلے روندا بھی جاتا ہے۔

تفہیم القرآن

قُریش

(۱۰۶)

قُریش

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ قریش کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اگرچہ ضحاک اور کَلبی نے اِس کو مَدَنی کہا ہے، لیکن مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، اور اس کے مکی ہونے کی کھلی شہادت خود اِس سورہ کے الفاظ رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ (اس گھر کے رب) میں موجود ہے۔ اگر یہ مدینہ میں نازل ہوتی تو خانۂ کعبہ کے لیے ''اِس گھر'' کے الفاظ کیسے موزوں ہو سکتے تھے؟ بلکہ اِس کے مضمون کا سورۂ فیل کے مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ غالباً اِس کا نُزول اُس کے مُتّصلاً بعد ہی ہوا ہوگا۔ دونوں سورتوں کے درمیان اِسی مناسبت کی بنا پر سَلَف میں سے بعض بزرگ اِس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی سورت ہیں۔ اِس خیال کو تقویت اِن روایات کی بنا پر ملی ہے کہ حضرت اُبَیؓ بن کعب کے مُصحَف میں یہ دونوں ایک ساتھ لکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں بسم اللہ مرقوم نہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی فصل کے بغیر ان دونوں کو ملا کر نماز میں پڑھا تھا۔ لیکن یہ رائے اِس وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی عظیم تعداد کے تعاون سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلادِ اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے، ان میں دونوں کے درمیان بسم اللہ درج تھی، اور اُس وقت سے آج تک تمام دنیا کے مَصاحِف میں یہ الگ الگ سورتوں کی حیثیت ہی سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ مزید برآں دونوں سورتوں کا اندازِ بیان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ عَلانِیَہ دو الگ سورتیں نظر آتی ہیں۔

تاریخی پَس منظر

اِس سورت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اِس کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جَدِّ اعلیٰ قُصَیّ بن کِلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قُصَیّ نے اُس کو مکے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تَولیت اِس قبیلے کے ہاتھ میں آ گئی۔ اِسی بنا پر قُصَیّ کو مُجَمِّع (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ اِس شخص نے اپنے اعلیٰ درجے کے تدبُّر سے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی، اور جملہ اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا، جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رُسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبدِ مَناف اور عبدالدّار کے درمیان مکہ کی ریاست کے مناصِب تقسیم ہو گئے، مگر دونوں میں سے عبدِ مَناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموَری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اُس کا شَرَف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔

عبدِمَناف کے چار بیٹے تھے: ہاشم، عبدِشَمس، مُطّلِب اور نَوفَل۔ ان میں سے ہاشم، عبدالمُطّلِب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کوسب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے، تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلُّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیجِ فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحرِاَحمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا، اُس کا کاروبار بہت چمک اُٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیّاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے، اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنھیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں اُن کے قافلوں پر ڈاکا مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہ گزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وُصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنھی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اِسکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حَبَش کے بادشاہ سے عبدِشمس نے، یمنی اُمَرا سے مُطّلِب نے، اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نَوفَل نے تجارتی مَراعات حاصل کیں۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتَّجِرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے، اور جو روابط انھوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے، اُن کی بنا پر اِن کو اَصحابُ الْاِیلاف بھی کہا جاتا تھا، جس کے لفظی معنیٰ ''اُلفت پیدا کرنے والوں'' کے ہیں۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے مَمالک سے تعلّقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلّقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآنِ مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انھی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس، ''قریش لوگوں کے لیڈر ہیں۔'' (مُسنَدِ احمد، مَرویّات عَمرو بن العاص) اور حضرت علیؓ کی روایت بَیْہَقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: کان ھٰذا الامر فی حِمْیَرَ فنزعہ اللّٰہ منھم وجعلہ فی قریش۔ ''پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمْیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے وہ ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔''

قریش اِسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جارہے تھے کہ مکّہ پر اَبْرَہَہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آ گیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں، خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا، وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکّہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کِلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر اَبرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اِس تباہ شدہ فوج کے آدمی گِر گِر کر مرتے چلے گئے، تو کعبہ کے بیتُ اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا، اور اُس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ اِن لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصّے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ انھیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اُس سے کوئی تعرّض نہ کیا جاتا تھا۔

مقصودِ کلام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت کے زمانے میں یہ حالات چونکہ سب ہی کو معلوم تھے، اس لیے اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس سورت کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اِتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم خود اِس گھر (خانۂ کعبہ) کو بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر مانتے ہو، اور جب تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں اِس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمھاری تجارتوں کو یہ فروغ بخشا، اور تمھیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوش حالی نصیب فرمائی، تو تمھیں اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

آیاتہا ۴ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿١﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿٤﴾

ع

چونکہ قُریش مانوس ہوئے[1]، (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس[2]، لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اِس گھر کے رب کی عبادت کریں[3]، جس نے اُنھیں بُھوک سے بچا کر کھانے کو دیا[4] اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا[5]۔ ع

۱ – اصل الفاظ ہیں: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ اِیلاف اَلف سے ہے جس کے معنٰی خوگر ہونے، مانوس ہونے، پھٹنے کے بعد مِل جانے، اور کسی چیز کی عادت اختیار کرنے کے ہیں۔ اردو زبان میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ ایلاف سے پہلے جو لام آیا ہے، اس کے متعلق عَرَبی زبان کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ عربی محاورے کے مطابق تعجُّب کے معنٰی میں ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں کہ لِزَیْدٍ وَّمَا صَنَعْنَا بِہٖ، یعنی ذرا اِس زید کو دیکھو کہ ہم نے اس کے ساتھ کیسا نیک سلوک کیا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ پس لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رَوِیَّہ بڑا ہی قابلِ تعجُّب ہے کہ اللہ ہی کے فضل کی بدولت وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور اُن تجارتی سفروں کے خوگر ہو گئے جو اُن کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اور وہ اللہ ہی کی بندگی سے رُوگردانی کر رہے ہیں۔ یہ رائے اَخْفَش، کِسائی، اور فرّا کی ہے، اور اس رائے کو ابنِ جَرِیر نے ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جب اس لام کے بعد کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو وہی بات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے کہ اُس کے ہوتے جو شخص کوئی رَوِیَّہ اختیار کر رہا ہے وہ قابلِ تعجب ہے۔ بخلاف اِس کے خلیل بن احمد، سِیبَوَیہ اور زَمَخْشَری کہتے ہیں کہ یہ لام تعلیل ہے اور اس کا تعلق آگے کے فقرے فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یوں تو قریش پر اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن اگر کسی اور نعمت کی بنا پر نہیں تو اِسی ایک نعمت کی بنا پر وہ اللہ کی بندگی کریں کہ اُس کے فضل سے وہ اِن تجارتی سفروں کے خوگر ہوئے، کیونکہ یہ بجائے خود اُن پر اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔

۲ – گرمی اور جاڑے کے سفروں سے مراد یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر، شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں، اور جاڑے کے زمانے میں وہ جنوبِ عرب کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ گرم علاقے ہیں۔

۳- اِس گھر سے مراد خانۂ کعبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ نعمت اِسی گھر کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اور وہ خود مانتے ہیں کہ وہ ۳۶۰ بُت اس کے رب نہیں ہیں جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں، بلکہ صرف اللہ ہی اِس کا رب ہے۔ اُسی نے ان کو اصحابِ فیل کے حملے سے بچایا۔ اُسی سے انھوں نے اَبْرَہَہ کی فوج کے مقابلے میں مدد کی دعا کی تھی۔ اُس کے گھر کی پناہ میں آنے سے پہلے جب وہ عرب میں منتشر تھے تو اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عرب کے عام قبائل کی طرح وہ بھی ایک نسل کے بکھرے ہوئے گروہ تھے۔ مگر جب وہ مکّہ میں اِس گھر کے گرد جمع ہوئے اور اِس کی خدمت انجام دینے لگے تو سارے عرب میں محترم ہو گئے، اور ہر طرف اُن کے تجارتی قافلے بے خوف وخطر آنے جانے لگے۔ پس انھیں جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے، اِس گھر کے رب کی بدولت نصیب ہوا ہے، اس لیے اُسی کی اِن کو عبادت کرنی چاہیے۔

۴- یہ اشارہ ہے اِس طرف کہ مکے میں آنے سے پہلے جب قریش عرب میں منتشر تھے تو بھوکوں مر رہے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اُن کے لیے رزق کے دروازے کُھلتے چلے گئے اور ان کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا حرف بحرف پوری ہوئی کہ اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بے آب وگیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس تُو لوگوں کے دلوں کو اِن کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ (ابراہیم، آیت ۳۷)

۵- یعنی جس خوف سے عرب کی سرزمین میں کوئی محفوظ نہیں ہے، اُس سے یہ محفوظ ہیں۔ عرب کا حال اُس دَور میں یہ تھا کہ پورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچانک اُس پر چھاپا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حُدود سے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ اِکّا دُکّا آدمی کا زندہ بچ کر واپس آ جانا، یا گرفتار ہو کر غلام بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امرِ محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکا پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے با اثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے۔ لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے، انھیں کسی دشمن کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اُن کے چھوٹے اور بڑے، ہر طرح کے قافلے ملک کے ہر حصّے میں آتے جاتے تھے، کوئی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ قافلہ حَرَم کے خادموں کا ہے، انھیں چھیڑنے کی جراَت نہ کر سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اکیلا قریشی بھی اگر کہیں سے گزر رہا ہو اور کوئی اس سے تعرّض کرے تو صرف لفظ ''حَرَمی'' یا ''اَنَا مِنْ حَرَمِ اللّٰہِ'' کہہ دینا کافی ہو جاتا تھا، یہ سنتے ہی اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے تھے۔

تفہیم القرآن

الماعون

(۱۰۷)

الماعون

نام

آخری آیت کے آخری لفظ اَلْمَاعُوْنَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عباس اور ابن الزُّبیر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکّی ہے، اور یہی قول عطاؒ اور جابرؒ کا بھی ہے۔ لیکن ابوحَیّان نے البحر المحیط میں ابنِ عباسؓ اور قَتادَہ اور ضَحّاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک خود اِس سورہ کے اندر ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جو اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اِس میں اُن نماز پڑھنے والوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ منافقین کی یہ قسم مدینے ہی میں پائی جاتی تھی، کیونکہ وہیں اسلام اور اہلِ اسلام کو یہ قوّت حاصل ہوئی تھی کہ بہت سے لوگوں کو مَصلحتًا ایمان لانا پڑا تھا اور وہ مجبُوراً مسجد میں آتے تھے، جماعت میں شریک ہوتے تھے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھتے تھے، تاکہ انھیں مسلمانوں میں شمار کیا جائے۔ اِس کے برعکس مکّے میں ایسے حالات سرے سے موجود ہی نہ تھے کہ وہاں کسی کو دکھاوے کی نماز پڑھنی پڑتی۔ وہاں تو اہلِ ایمان کے لیے نمازِ باجماعت کا اہتمام بھی مشکل تھا۔ اُن کو چھپ چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی تھی، اور کوئی عَلانِیَہ پڑھتا تھا تو جان پر کھیل کر پڑھتا تھا۔ منافقین کی جو قسم وہاں پائی جاتی تھی، وہ رِیا کارانہ ایمان لانے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھنے والوں کی نہیں، بلکہ اُن لوگوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برسرِ حق ہونے کو جان اور مان گئے تھے، مگر اُن میں سے کوئی اپنی ریاست و وَجاہت اور مَشیخَت کو برقرار رکھنے کی خاطر اسلام قبُول کرنے سے گریز کر رہا تھا، اور کوئی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان ہو کر اُن مصائب میں مبتلا ہو جائے جن میں وہ ایمان لانے والوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مبتلا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مکّی دَور کے منافقین کی یہ حالت سورۂ عنکبوت، آیات ۱۰-۱۱ میں بیان کی گئی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، العنکبوت، حواشی ۱۳ تا ۱۶)

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع یہ بتانا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیت ۲ اور ۳ میں اُن کفّار کی حالت بیان کی گئی ہے جو عَلانِیَہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں اُن منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں، مگر دل میں آخرت اور اُس کی جزا و سزا اور اُس کے ثواب و عقاب کا کوئی تصوُّر نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دونوں قسم کے گروہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ انسان کے اندر ایک مضبوط اور مستحکم پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

آیاتہا ۷ | سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ مَکِّیَّۃٌ | رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷ ع

تم نے دیکھا[1] اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا[2] کو جُھٹلاتا ہے[3]؟ وہی تو ہے[4] جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے[5]، اور مسکین کا کھانا[6] دینے پر نہیں اُکساتا[7]۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے[8] جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں[9]، جو رِیا کاری کرتے ہیں[10] اور معمولی ضرورت کی چیزیں[11] (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں[12]۔ ع

۱- "تم نے دیکھا" کا خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر قرآن کا اندازِ بیان یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ عموماً ہر صاحبِ عقل اور سوچنے سمجھنے والے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔ اور دیکھنے کا مطلب آنکھوں سے دیکھنا بھی ہے، کیونکہ آگے لوگوں کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ ہر دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب جاننا، سمجھنا اور غور کرنا بھی ہے۔ عربی کی طرح اُردو میں بھی دیکھنے کا لفظ اس دوسرے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "میں دیکھ رہا ہوں"، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں جانتا ہوں، یا مجھے خبر ہے۔ یا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "ذرا یہ بھی تو دیکھو" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذرا اس بات پر بھی غور کرو۔ پس اگر لفظ اَرَءَیْتَ کو اِس دوسرے معنیٰ میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے جو جزا و سزا کو جُھٹلاتا ہے؟" یا "تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے؟"

۲- اصل میں یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فرمایا گیا ہے۔ الدِّیْن کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں آخرت کی جزائے اعمال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دینِ اسلام کے لیے بھی۔ لیکن جو مضمون آگے بیان ہوا ہے اس کے ساتھ پہلے معنیٰ ہی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے معنیٰ بھی سلسلۂ کلام سے غیر مطابق نہیں ہیں۔ ابنِ عباسؓ نے دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، اور اکثر مفسرین پہلے معنیٰ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو پوری سورت کے مضمون کا مطلب یہ ہوگا کہ آخرت کے انکار کا عقیدہ انسان میں یہ سیرت و کردار پیدا کرتا ہے۔ اور

دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو پوری سورت کا مدعا دینِ اسلام کی اخلاقی اہمیت واضح کرنا قرار پائے گا۔ یعنی کلام کا مقصد یہ ہو گا کہ اسلام اُس کے برعکس سیرت و کردار پیدا کرنا چاہتا ہے جو اِس دین کا انکار کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔

۳- اندازِ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس سوال سے بات کا آغاز کرنے کا مقصد یہ پوچھنا نہیں ہے کہ تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے یا نہیں، بلکہ سامع کو اِس بات پر غور کرنے کی دعوت دینا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا کا انکار آدمی میں کس قسم کا کردار پیدا کرتا ہے، اور اُسے یہ جاننے کا خواہش مند بنانا ہے کہ اِس عقیدے کو جھٹلانے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں، تاکہ وہ ایمان بالآخرت کی اخلاقی اہمیت سمجھنے کی کوشش کرے۔

۴- اصل میں فَذٰلِكَ الَّذِيْ فرمایا گیا ہے۔ اس فقرے میں ف ایک پورے جملے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ "اگر تم نہیں جانتے تو تمھیں معلوم ہو کہ وہی تو ہے جو۔" یا پھر یہ اِس معنیٰ میں ہے کہ "اپنے اسی انکارِ آخرت کی وجہ سے وہ ایسا شخص ہے جو۔"

۵- اصل میں يَدُعُّ الْيَتِيْمَ کا فقرہ استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کر کے اسے دھکّے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دُھتکار دیتا ہے، اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشان حالی کی بنا پر رحم کی امید لیے ہوئے کھڑا رہے تو اسے دھکے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتہ دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمتگاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اِس فقرے میں یہ معنیٰ بھی پوشیدہ ہیں کہ اُس شخص سے کبھی کبھار یہ ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رَوِیّہ یہی ہے۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی بُرا کام ہے جو وہ کر رہا ہے۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ رَوِش اختیار کیے رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یار و مددگار مخلوق ہے، اس لیے کوئی ہرج نہیں اگر اس کا حق مار کھایا جائے، یا اسے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا کر رکھا جائے، یا وہ مدد مانگنے کے لیے آئے تو اُسے دھتکار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوَرْدِی نے اپنی کتاب اَعلامُ النُّبُوّۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اِس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اُسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپؐ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اِس بچے کا حق اِسے دے دو، تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں، اِن دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انھوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے

اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا: خدا کی قسم! میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا، اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ اِس واقعے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یارومددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپؐ کے اِس اخلاق کا آپؐ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رعب تھا۔ اِسی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۴۶ پر نقل کر چکے ہیں، جو حضورؐ کے اُس زبردست اخلاقی رعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کفارِ قریش آپؐ کو جادوگر کہتے تھے۔

۶ – اِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ نہیں بلکہ طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر اِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ کہا گیا ہوتا تو معنیٰ یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ لیکن طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ بالفاظِ دیگر، جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے، وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اُسی مسکین کا کھانا ہے، وہ اُس کا حق ہے جو دینے والے پر عائد ہوتا ہے، اور دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ اُس کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ ذاریات، آیت ۱۹ میں فرمائی گئی ہے کہ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔"

۷ – لَا يَحُضُّ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے نفس کو بھی اِس کام پر آمادہ نہیں کرتا، اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہیں کہتا کہ مسکین کا کھانا دیا کریں، اور دوسرے لوگوں کو بھی اِس بات پر نہیں اکساتا کہ معاشرے میں جو غریب ومحتاج لوگ بھوکے مر رہے ہیں، ان کے حقوق پہچانیں اور ان کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکارِ آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود اِن دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اکساتے، بلکہ جو بے شمار خرابیاں اِس گمراہی کے نتیجے میں رُونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اِس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دِہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکارے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اَوصاف تو وہ ہیں جو سورۂ عصر اور سورۂ بَلَد میں بیان کیے گئے ہیں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو خلقِ خدا پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادائے حُقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔

۸ – فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں 'فَ' اس معنیٰ میں ہے کہ کھلے کھلے منکرینِ آخرت کا حال تو یہ تھا جو ابھی تم نے سنا، اب ذرا اُن منافقوں کا حال بھی دیکھو جو نماز پڑھنے والے گروہ، یعنی مسلمانوں میں شامل ہیں۔ وہ چونکہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود آخرت کو جھوٹ سمجھتے ہیں، اس لیے ذرا دیکھو کہ وہ اپنے لیے کس تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

مُصَلِّیْنَ کے معنیٰ تو "نماز پڑھنے والوں" کے ہیں، لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور آگے ان لوگوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، اُن کے لحاظ سے اِس لفظ کے معنیٰ درحقیقت نمازی ہونے کے نہیں بلکہ اہلِ صلوٰۃ، یعنی مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔

۹- فِیْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ نہیں کہا گیا بلکہ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ کہا گیا ہے۔ اگر فِیْ صَلَاتِہِمْ کے الفاظ استعمال ہوتے تو مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جانا شریعت میں نفاق تو درکنار، گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی عیب یا قابلِ گرفت بات تک نہیں ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی وقت نماز میں بھول لاحق ہوئی ہے، اور حضورؐ نے اُس کی تلافی کے لیے سجدۂ سہو کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ اِس کے برعکس عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں۔ نماز پڑھی تو، اور نہ پڑھی تو، دونوں کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں تو اِس طرح کہ نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں، اور جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتے ہیں۔ یا نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بے دِلی کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور بادِلِ ناخواستہ پڑھ لیتے ہیں، جیسے کوئی مصیبت ہے جو ان پر نازل ہوگئی ہے۔ کپڑوں سے کھیلتے ہیں، جماہیاں لیتے ہیں، خدا کی یاد کا کوئی شائبہ تک ان کے اندر نہیں ہوتا۔ پوری نماز میں نہ اُن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ انھوں نے کیا پڑھا ہے۔ پڑھ رہے ہوتے ہیں نماز، اور دل کہیں اور پڑا رہتا ہے۔ مارا مار اس طرح پڑھتے ہیں کہ نہ قیام ٹھیک ہوتا ہے، نہ رُکوع، نہ سُجود۔ بس کسی نہ کسی طرح نماز کی سی شکل بنا کر جلدی سے جلدی فارغ ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ کسی جگہ پھنس گئے تو نماز پڑھ لی، ورنہ اِس عبادت کا کوئی مقام ان کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نماز کا وقت آتا ہے تو انھیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ نماز کا وقت ہے۔ مؤذّن کی آواز کان میں آتی ہے تو انھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ کیا پکار رہا ہے، کس کو پکار رہا ہے، اور کس لیے پکار رہا ہے۔ یہی آخرت پر ایمان نہ ہونے کی علامات ہیں۔ کیونکہ دراصل اسلام کے مدّعیوں کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہ نماز پڑھنے پر کسی جزا کے قائل ہیں اور نہ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کے نہ پڑھنے پر کوئی سزا ملے گی۔ اسی بنا پر حضرت اَنَسؓ بن مالک اور عطا بن دینار کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے اس نے فِیْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ نہیں بلکہ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ فرمایا۔ یعنی ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں، اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔

قرآنِ مجید میں منافقین کی اس کیفیت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ○ "وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کَسمَساتے ہوئے، اور (اللہ کی راہ میں) خرچ نہیں کرتے مگر بادِلِ ناخواستہ۔" (التوبہ: ۵۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تلك صلٰوة المنافق، تلك صلٰوة المنافق، تلك صلٰوة المنافق، یجلس یرقب الشمس حتّٰی اذا کانت بین قرنی الشیطان قام فنقر اربعًا لا یذکر اللّٰه فیھا الّا قلیلا۔ "یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ عصر کے وقت بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے (یعنی غروب کا وقت قریب آجاتا ہے) تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے، جن میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔" (بخاری۔ مسلم۔ مُسندِ احمد) حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص سے ان کے صاحبزادے مُصْعَب بن سعد روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا جو نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اُس کا وقت ٹال کر پڑھتے ہیں۔

(ابنِ جَریر، ابویَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی السُّنَن۔ یہ روایت حضرت سعدؓ کے اپنے قول کی حیثیت سے بھی مَوقوفاً نقل ہوئی ہے اور اُس کی سند زیادہ قوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت سے اس کی مرفوعاً روایت کو بَیْہَقی اور حاکم نے ضعیف قرار دیا ہے)۔ حضرت مُصعَب کی دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ اِس آیت پر آپ نے غور فرمایا؟ کیا اِس کا مطلب نماز کو چھوڑ دینا ہے؟ یا اِس سے مراد نماز پڑھتے پڑھتے آدمی کا خیال کہیں اور چلا جانا ہے؟ خیال بٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، اِس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔ (ابنِ جریر، ابنِ ابی شَیبَہ، ابویَعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی السُّنَن)

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نماز میں دوسرے خیالات کا آ جانا اَور چیز ہے، اور نماز کی طرف کبھی متوجہ ہی نہ ہونا اور اس میں ہمیشہ دوسری باتیں ہی سوچتے رہنا بالکل دوسری چیز۔ پہلی حالت تو بَشَریّت کا تقاضا ہے، بلاارادہ دوسرے خیالات آ ہی جاتے ہیں، اور مومن کو جب بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ نماز سے اُس کی توجہ ہٹ گئی ہے تو وہ پھر کوشش کر کے اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسری حالت نماز سے غفلت برتنے کی تعریف میں آتی ہے، کیونکہ اس میں آدمی صرف نماز کی ورزش کر لیتا ہے، خدا کی یاد کا کوئی ارادہ اس کے دل میں نہیں ہوتا، نماز شروع کرنے سے سلام پھیرنے تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور جن خیالات کو لیے ہوئے وہ نماز میں داخل ہوتا ہے انھی میں مستغرق رہتا ہے۔

۱۰ – یہ فقرہ ایک مستقل فقرہ بھی ہو سکتا ہے اور پہلے فقرے سے متعلّق بھی۔ اگر اسے ایک مستقل فقرہ قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی نیک کام بھی وہ خالص نیت کے ساتھ خدا کے لیے نہیں کرتے، بلکہ جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں، تاکہ ان کی تعریف ہو، لوگ ان کو نیکوکار سمجھیں، ان کے کارِ خیر کا ڈھنڈورا دنیا میں پٹے، اور اس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں انھیں دنیا ہی میں حاصل ہو جائے۔ اور اگر اس کا تعلق پہلے فقرے کے ساتھ مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ مفسّرین نے بالعموم دوسرے ہی معنیٰ کو ترجیح دی ہے، کیونکہ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ اِس کا تعلّق پہلے فقرے سے ہے۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد منافقین ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے تھے، اگر دوسرے لوگ موجود ہوتے تو پڑھ لیتے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو نہیں پڑھتے تھے۔'' دوسری روایت میں اُن کے الفاظ یہ ہیں: ''تنہا ہوتے تو نہ پڑھتے اور عَلانیَہ پڑھ لیتے تھے۔'' (ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَردُوْیَہ، بَیْہَقی فی الشُّعَب) قرآنِ مجید میں بھی منافقین کی یہ حالت بیان کی گئی ہے کہ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ ''اور جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے اُٹھتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔'' (النساء: ۱۴۲)

۱۱ – اصل میں لفظ مَاعُوْنَ استعمال ہوا ہے۔ حضرت علیؓ، ابنِ عمرؓ، سعید بن جُبَیر، قَتادہ، حَسَن بصری، محمد بن حَنَفِیّہ، ضَحّاک، ابنِ زید، عِکْرِمہ، مجاہد، عطا اور زُہری رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ ابنِ عباسؓ، ابنِ مسعودؓ، ابراہیم نَخَعیؒ، ابو مالکؒ اور بہت سے دوسرے حضرات کا قول ہے کہ اس سے مراد عام ضرورت کی اشیا، مثلاً ہنڈیا، ڈول، کلھاڑی، ترازو، نمک، پانی، آگ، چقماق (جس کی جانشین اب دیا سلائی ہے) وغیرہ ہیں، جو عُموماً لوگ ایک دوسرے سے عاریتاً مانگتے رہتے ہیں۔ سعید بن جُبَیر اور مجاہد کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ حضرت علیؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ بھی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی عام ضروریات کی چیزیں بھی۔ عِکرِمہ سے

ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ ماعُون کا اعلیٰ مرتبہ زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ کسی کو چھلنی، ڈول یا سوئی عاریتاً دی جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہا کرتے تھے (اور بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ کے عہدِ مبارک میں یہ کہا کرتے تھے) کہ ماعُون سے مراد ہنڈیا، کلھاڑی، ڈول، ترازو، اور ایسی ہی دوسری چیزیں مستعار دینا ہے۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبہ، ابوداؤد، نَسائی، بَزّار، ابن المُنذِر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی فی الاوسط، ابنِ مَرْدُوْیہ، بَیْہَقی فی السُّنَن) سعد بن عِیاض ناموں کی تصریح کے بغیر قریب قریب یہی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے نقل کرتے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انھوں نے متعدّد صحابہؓ سے یہ بات سنی تھی۔ (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبہ) دَیلمی، ابنِ عَساکر اور ابونُعَیم نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد کلھاڑی اور ڈول اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو غالباً یہ دوسرے لوگوں کے علم میں نہ آئی ہو گی، ورنہ ممکن نہ تھا کہ پھر کوئی شخص اس آیت کی کوئی اور تفسیر کرتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ماعُون چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے لیے کوئی مَنفعت یا فائدہ ہو۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے زکوٰۃ بھی ماعُون ہے، کیونکہ وہ بہت سے مال میں سے تھوڑا سا مال ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے دینا ہوتا ہے، اور وہ دوسری عام ضرورت کی اشیا بھی ماعون ہیں جن کا ذکر حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور ان کے ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ماعُون کا اطلاق اُن تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہوتا ہے جو عادتاً ہمسایے ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں۔ اُن کا مانگنا کوئی ذلّت کی بات نہیں ہوتا، کیونکہ غریب اور امیر سب ہی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ البتہ ایسی چیزوں کو دینے سے بُخل برتنا اخلاقاً ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا ہے۔ عُموماً ایسی چیزیں بجائے خود باقی رہتی ہیں اور ہمسایہ ان سے کام لے کر انھیں جُوں کا تُوں واپس دے دیتا ہے۔ اِسی ماعون کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں مہمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے چارپائی یا بستر مانگ لے۔ یا کوئی اپنے ہمسایے کے تنور میں اپنی روٹی پکا لینے کی اجازت مانگے۔ یا کوئی کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہو اور حفاظت کے لیے اپنا کوئی قیمتی سامان دوسرے کے ہاں رکھوانا چاہے۔ پس آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آخرت کا انکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنا دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کوئی معمولی ایثار کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

تفہیم القرآن

الکوثر

(۱۰۸)

الکَوْثَر

نام

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے لفظ الکوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور حضرت عائشہؓ صدّیقہ سے نقل کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے، کَلْبی اور مُقاتل بھی اسے مکی کہتے ہیں، اور جُمہورِ مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن حضرت حسن بصری، عِکْرِمہ، مجاہد اور قَتادَہ اِس کو مدنی قرار دیتے ہیں۔ امام سُیُوطی نے اِتْقان میں اِسی قول کو صحیح ٹھیرایا ہے، اور امام نَوَوِی نے شرح مسلم میں اِسی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ اِس کی وہ روایت ہے جو امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابن المُنْذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور بَیْہَقِی وغیرہ محدثین نے حضرت اَنَسؓ بن مالک سے نقل کی ہے کہ حضوؐر ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ اتنے میں آپؐ پر کچھ اُونگھ سی طاری ہوئی، پھر آپؐ نے مسکراتے ہوئے سرِ مبارک اٹھایا۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا: آپؐ کس بات پر تبسم فرما رہے ہیں؟ اور بعض میں ہے کہ آپؐ نے خود لوگوں سے فرمایا: اِس وقت میرے اوپر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر آپؐ نے سورۂ کوثر پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ نے پوچھا: جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا: وہ ایک نہر ہے جو میرے رب نے مجھے جنت میں عطا کی ہے (اس کی تفصیل آگے "کوثر" کی تشریح میں آ رہی ہے)۔ اِس روایت سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر اس وجہ سے اِستِدلال کیا گیا ہے کہ حضرت اَنَسؓ مکے میں نہیں بلکہ مدینے میں تھے، اور اُن کا یہ کہنا کہ ہماری موجودگی میں یہ سورت نازل ہوئی، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مدنی ہے۔

مگر اوّل تو اِنھی حضرت اَنَسؓ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذِی اور ابنِ جَرِیر نے یہ روایات نقل کی ہیں کہ جنت کی یہ نہر (کوثر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں دکھائی جا چکی تھی، اور سب کو معلوم ہے کہ معراج ہجرت سے پہلے مکّہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے، جب معراج میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کے اِس عَطِیّے کی نہ صرف خبر دی جا چکی تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضوؐر کو اُس کی خوشخبری دینے کے لیے مدینۂ طیّبہ میں سورۂ کوثر نازل کی جاتی۔ تیسرے، اگر صحابہؓ کے ایک مجمع میں حضوؐر نے خود سورۂ کوثر کے نزول کی وہ خبر دی ہوتی جو حضرت اَنَسؓ کی مذکورۂ بالا روایت میں بیان ہوئی ہے اور اُس کا مطلب یہ ہوتا کہ پہلی مرتبہ یہ سورت اِسی وقت نازل ہوئی ہے، تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے باخبر صحابہ اس سورت کو مکی قرار دیتے اور جُمہورِ مفسرین اس کے مکی ہونے کے قائل ہو جاتے؟ اس معاملے پر غور کیا جائے تو حضرت اَنَسؓ کی روایت میں یہ خلا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اُس میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے کہ جس مجلس میں حضوؐر نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی،

اُس میں پہلے سے کیا گفتگو چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضورؐ کسی مسئلے پر کچھ ارشاد فرما رہے ہوں، اُس کے دوران میں وحی کے ذریعے سے آپؐ کو مُطّلع کیا گیا ہو کہ اِس مسئلے پر سورۂ کوثر سے روشنی پڑتی ہے، اور آپؐ نے اِسی بات کا ذکر یوں فرمایا ہو کہ مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ اِس قسم کے واقعات متعدّد مواقع پر پیش آئے ہیں، جن کی بنا پر مفسرین نے بعض آیات کے متعلق کہا ہے کہ وہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ اس دوسرے نُزول کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ آیت تو پہلے نازل ہو چکی تھی، مگر دوسری بار کسی موقع پر حضورؐ کو بذریعۂ وحی اُسی آیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ایسی روایات میں کسی آیت کے نُزول کا ذکر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا کہ وہ مکی ہے یا مدنی، اور اس کا اصل نزول فی الواقع کس زمانے میں ہوا تھا۔

حضرت اَنَسؓ کی یہ روایت اگر شک پیدا کرنے کی موجب نہ ہو تو سورۂ کوثر کا پورا مضمون بجائے خود اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب حضورؐ کو انتہائی دل شکن حالات سے سابقہ درپیش تھا۔

تاریخی پس منظر

اِس سے پہلے سورۂ ضُحیٰ اور سورۂ اَلَم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوّت کے ابتدائی دَور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تُلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضورؐ اور آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دُور دُور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپؐ کو تسلّی دینے اور آپؐ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدّد آیات نازل فرمائیں۔ سورۂ ضُحیٰ میں فرمایا: وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ ’’اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دَور (یعنی ہر بعد کا دَور) پہلے دَور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمھارا رب تمھیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔‘‘ اور اَلَم نشرح میں فرمایا کہ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ’’اور ہم نے تمھارا آوازہ بلند کر دیا۔‘‘ یعنی دشمن تمھیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں، مگر ہم نے اُن کے عَلَی الرَّغم تمھارا نام روشن کرنے اور تمھیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے۔ اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ’’پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔‘‘ یعنی اِس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دَور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورۂ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلّی بھی دی اور آپؐ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفّار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور اُن کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عِکرِمہ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نبی بنائے گئے اور آپؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے: بَتِرَ محمدٌ مِنّا (ابنِ جَرِیر)، یعنی محمدؐ اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور متوقّع یہی ہو

کہ کچھ مدت بعد وہ سوکھ کر پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سَہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا: ''اجی چھوڑو انھیں، وہ تو ایک اَبتَر (جڑ کٹے) آدمی ہیں، ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں، مرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔'' شِمر بن عَطِیّہ کا بیان ہے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط بھی ایسی ہی باتیں حضورؐ کے متعلق کہا کرتا تھا۔ (ابنِ جَریر) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کَعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: الا ترٰی الی ھٰذا الصبیّ المنبتر من قومہٖ یزعم انہ خیر منّا ونحن اھل الحجیج واھل السدانۃ واھل السقایۃ۔ ''بھلا دیکھو تو سہی، اِس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے، حالانکہ ہم حج اور سِدانَت اور سِقایَت کے منتظم ہیں۔'' (بزّار) اسی واقعے کے متعلق عِکرِمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضورؐ کے لیے الصُّنبورُ المُنبَتِر من قومہٖ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی ''کمزور، بے یارومددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے۔'' (ابنِ جریر) ابنِ سعد اور ابنِ عَساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں اُمِّ کُلثومؓ، فاطمہؓ اور رُقیّہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا: ''اُن کی نسل ختم ہوگئی، اب وہ ابتر ہیں۔'' (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا: ان محمدًا ابتر لا ابن لہ یقومُ مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واسترحتم منہ۔ ''محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مرجائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمھارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔'' عبد بن حُمَید نے ابنِ عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہؓ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عَطِیّہ سے ابنِ ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اِس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی مُعَیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے مُتّصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور اُن کو یہ ''خوش خبری'' دی کہ بَتِرَ محمدٌ اللّیلۃ ''آج رات محمدؐ لاولد ہوگئے یا ان کی جڑ کٹ گئی۔''

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی وعبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپؐ نے عَلانِیَہ رد کر دیا تھا۔ اِسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ ومقام آپؐ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا، وہ آپؐ سے چھین لیا گیا تھا اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یارومددگار تھے اور مارے کھدیڑے جارہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی وتعزیت

کے بجائے وہ خوشیاں منائی جارہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جارہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس مختصر ترین سورت کے ایک فقرے میں وہ خوش خبری دی جس سے بڑی خوش خبری دنیا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی، اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ آپؐ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

---

۳ آیاتھا — سُورَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ — ۱ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

(اے نبیؐ!) ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا[۱]۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو[۲]۔ تمھارا دشمن[۳] ہی جڑ کٹا ہے[۴]۔ ع

۱- کوثر کا لفظ یہاں جس طرح استعمال کیا گیا ہے، اس کا پورا مفہوم ہماری زبان تو درکنار، شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کثرت سے مبالغے کا صیغہ ہے، جس کے لُغوی معنی تو بے انتہا کثرت کے ہیں، مگر جس موقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اُس میں محض کثرت کا نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت، اور ایسی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے جو اِفراط اور فراوانی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو، اور اُس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں، بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔ دیباچے میں اِس سورہ کا جو پَس منظر ہم نے بیان کیا ہے، اُس پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ حالات وہ تھے جب دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں۔ قوم سے کٹ کر بے یار و مددگار رہ گئے۔ تجارت برباد ہو گئی۔ اولادِ نرینہ تھی، جس سے آگے اُن کا نام چل سکتا تھا، وہ بھی وفات پا گئی۔ بات ایسی لے کر اُٹھے ہیں کہ چند گِنے چُنے آدمی چھوڑ کر مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اُن کے مقدّر میں اِس کے سوا کچھ نہیں کہ جیتے جی ناکامی و نامرادی سے دوچار رہیں، اور جب وفات پا جائیں تو دنیا میں کوئی اُن کا نام لیوا بھی نہ ہو۔ اِس حالت میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا، تو اِس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمھارے مخالف بے وقوف تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم برباد ہو گئے اور نبوت سے پہلے جو نعمتیں تمھیں حاصل تھیں وہ بھی تم سے چِھن گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمھیں بے انتہا خیر اور بے شمار نعمتوں سے نواز دیا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ بے نظیر خوبیاں بھی شامل ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی گئیں۔ اس میں نبوت اور قرآن اور علم اور حکمت کی وہ عظیم نعمتیں بھی شامل ہیں جو آپؐ کو عطا کی گئیں۔ اس میں توحید اور ایک ایسے نظامِ زندگی کی نعمت بھی شامل ہیں جس کے سیدھے سادھے، عام فہم، عقل و فطرت کے مطابق اور جامع و ہمہ گیر اُصول تمام عالَم میں پھیل جانے اور ہمیشہ پھیلتے ہی چلے جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس میں رفعِ ذکر کی نعمت بھی شامل ہے، جس کی بدولت حضورؐ کا نام نامی چودہ سو برس سے دنیا کے گوشے گوشے میں بلند ہو رہا ہے اور قیامت تک بلند ہوتا رہے گا۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ آپؐ کی دعوت سے بالآخر ایک ایسی عالَم گیر اُمّت وجود میں آئی جو دنیا میں ہمیشہ کے لیے دینِ حق کی عَلَم بردار بن گئی، جس سے زیادہ نیک اور پاکیزہ اور بلند پایہ انسان دنیا کی کسی اُمّت میں کبھی پیدا نہیں ہوئے، اور جو بگاڑ کی حالت کو پہنچ کر بھی دنیا کی سب قوموں سے بڑھ کر

خیر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ حضورؐ نے اپنی آنکھوں سے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں اپنی دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھ لیا اور آپؐ کے ہاتھوں سے وہ جماعت تیار ہوگئی جو دنیا پر چھا جانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اِس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ اولادِ نرینہ سے محروم ہو جانے کی بنا پر دشمن تو یہ سمجھتے تھے کہ آپؐ کا نام ونشان دنیا سے مٹ جائے گا، لیکن اللہ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی صورت میں آپؐ کو وہ روحانی اولاد عطا فرمائی جو قیامت تک رُوئے زمین پر آپؐ کا نام روشن کرنے والی ہے، بلکہ آپؐ کی صرف ایک ہی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کو وہ جسمانی اولاد بھی عطا کی جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کا سارا سرمایۂ افتخار ہی حضورؐ سے اس کا انتساب ہے۔

یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو اِس دنیا میں لوگوں نے دیکھ لیں کہ وہ کس فراوانی کے ساتھ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ کوثر سے مراد دو مزید ایسی عظیم نعمتیں بھی ہیں جو آخرت میں اللہ تعالیٰ آپؐ کو دینے والا ہے۔ اُن کو جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اُن کی خبر دی اور بتایا کہ کوثر سے مراد وہ بھی ہیں۔ ایک حوضِ کوثر، جو قیامت کے روز میدانِ حشر میں آپؐ کو ملے گا۔ دوسرے نہرِ کوثر، جو جنت میں آپؐ کو عطا فرمائی جائے گی۔ اِن دونوں کے متعلّق اِس کثرت سے احادیث حضورؐ سے منقول ہوئی ہیں اور اتنے کثیر راویوں نے اُن کو روایت کیا ہے کہ اُن کی صحت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں۔

حوضِ کوثر کے متعلق حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپؐ کو عطا ہوگا اور اُس سخت وقت میں، جب کہ ہر ایک العَطَش العَطَش کر رہا ہوگا، آپؐ کی اُمت آپؐ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی۔ آپؐ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہوں گے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: هو حوض ترد عليه امتي يوم القيٰمة۔ ”وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز وارد ہوگی۔“ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب السُّنّۃ) انا فَرَطكم على الحوض ”میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہوں گا۔“ (بخاری، کتاب الرِّقاق اور کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ۔ ابنِ ماجہ، کتاب المناسک اور کتاب الزُّہد۔ مُسندِ احمد، مَرویاتِ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ وابو ہریرہؓ) اني فرط لكم وانا شهيد عليكم واني والله لانظر الى حوضي الاٰن۔ ”میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دوں گا، اور خدا کی قسم! میں اپنے حوض کو اِس وقت دیکھ رہا ہوں۔“ (بخاری، کتاب الجنائز، کتاب المغازی، کتاب الرِّقاق) انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: انكم ستلقون بعدي اَثَرة فاصبروا حتّٰى تلقوني على الحوض۔ ”میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور اقربا نوازیوں سے پالا پڑے گا، اس پر صبر کرنا، یہاں تک کہ مجھ سے آکر حوض پر ملو۔“ (بخاری، کتاب مناقب الانصار وکتاب المغازی۔ مسلم، کتاب الامارۃ۔ ترمذی، کتاب الفتن) انا يوم القيٰمة عِنْدَ عقر الحوض۔ ”میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہوں گا۔“ (مسلم، کتاب الفضائل) حضرت ابو برزہؓ اَسلَمی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا ہے، جو اُس کو جھٹلائے اللہ اسے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے۔ (ابوداؤد، کتاب السُّنّۃ) عبید اللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتّٰی کہ اس نے حضرت ابو برزہؓ اَسلَمی، براءؓ بن عازِب اور عائذ بن عَمروؓ کی سب روایات کو جھٹلا دیا۔ آخرِکار ابو سَبرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص سے سن کر نقل کی تھی اور اس میں

حضورؐ کا یہ ارشاد درج تھا کہ الا اِن موعدکم حوضی۔ ”خبردار رہو! میری اور تمھاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے۔“ (مُسنَدِ احمد، مَروِیّاتِ عبداللہ بن عمروؓ بن عاص)

(۲) اُس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے۔ مگر کثیر رِوایات میں یہ ہے کہ وہ اَیلہ (اسرائیل کے موجودہ بندرگاہ اَیلات) سے یمن کے صَنعا تک، یا اَیلہ سے عَدن تک، یا عَمّان سے عدن تک طویل ہوگا، اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا اَیلہ سے جُحْفہ (جِدّہ اور رابغ کے درمیان ایک مقام) تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، کتاب الرّقاق۔ ابوداؤد الطَّیالِسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مُسنَدِ احمد، مَروِیّاتِ ابوبکر صدیقؓ و عبداللہ بن عمرؓ۔ مسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمِذی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد) اِس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمر ہی کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اس حوض کے متعلق حضورؐ نے بتایا ہے کہ اس میں جنت کی نہرِ کوثر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) سے پانی لاکر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیہ میزابان من الجنّۃ، اور دوسری روایت میں ہے: یغت فیہ میزابان یمدّانہ من الجنّۃ، یعنی اس میں جنت سے دو نالیاں لاکر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی۔ (مسلم، کتاب الفضائل) ایک اور روایت میں ہے: یفتح نہر من الکوثر الی الحوض، جنت کی نہرِ کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی۔ (مُسنَدِ احمد، مَروِیّاتِ عبداللہؓ بن مسعود)

(۴) اس کی کیفیّت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دودھ سے (اور بعض روایات میں ہے چاندی سے، اور بعض میں برف سے) زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی، اس پر اتنے کُوزے رکھے ہوں گے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اُس کا پانی پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی، اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔ (بخاری، کتاب الرِّقاق۔ مسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ مُسنَدِ احمد، مرویاتِ ابنِ مسعودؓ، ابنِ عمرؓ، وعبداللہ بن عَمروؓ بن العاص۔ ترمِذی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد۔ ابوداؤد طیالسی، حدیث ۹۹۵ و ۲۱۳۵)

(۵) اس کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، ان کو اُس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انھیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں، تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپؐ کو نہیں معلوم کہ آپؐ کے بعد اِنھوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی اُن کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور ہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، کتاب الرِّقاق، کتاب الفِتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مُسنَدِ احمد، مَروِیّاتِ ابنِ مسعودؓ و ابوہریرہؓ۔ ابنِ ماجہ، کتاب المَناسک۔ ابنِ ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے، وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں: الا وانی فرطکم علی الحوض واکاثربکم الامم فلا تسودوا وجھی، الا وانی مستنقذ اُناسًا ومستنقذ اناس منّی فاقول یا رب اصیحابی، فیقول انك لا تدری ما احدثوا بعدك، ”خبردار رہو! میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہوں گا اور تمھارے ذریعے سے دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اپنی اُمت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو! کچھ لوگوں کو میں چھُڑاؤں گا اور کچھ لوگ مجھ سے چھُڑائے جائیں گے۔ میں کہوں گا کہ اے پروردگار! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ وہ فرمائے گا: تم نہیں جانتے، اِنھوں نے تمھارے بعد کیا نرالے کام کیے ہیں۔“ ابنِ ماجہ کی رِوایت ہے کہ یہ الفاظ حضورؐ نے

عرفات کے خطبے میں فرمائے تھے)۔

(۶) اسی طرح حضورؐ نے اپنے دَور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں رَدّ و بدل کریں گے انھیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا، میں کہوں گا کہ اے رب! یہ تو میرے ہیں، میری اُمّت کے لوگ ہیں۔ جواب ملے گا: آپ کو معلوم نہیں کہ انھوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا تغیّرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اِس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں۔ (بخاری، کتاب المُساقات، کتاب الرِّقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفضائل۔ ابنِ ماجہ، کتاب الزُّہد، مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابنِ عباسؓ)

اس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہؓ سے مروی ہیں، اور سَلَف نے بالعُموم اس سے مراد حوضِ کوثر لیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الرقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے: بابٌ فی الحوض وقول اللہ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ۔ اور حضرت اَنسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضوؐر نے کوثر کے متعلق فرمایا: **ھو حوض ترد علیه امتی** ''وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت وارد ہوگی۔''

جنت میں کوثر نامی جو نہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی، اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت اَنسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضوؐر کو جنت کی سیر کرائی گئی اور اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے ترشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے قُبّے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تہ کی مٹی مُشکِ اَذفَر کی تھی۔ حضوؐر نے جبریل سے، یا اُس فرشتے سے جس نے آپؐ کو سیر کرائی تھی، پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ نہرِ کوثر ہے جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، ابوداؤد طیالسی، ابنِ جَریر) حضرت اَنسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضوؐر سے پوچھا گیا۔ (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مُشک ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ جَریر۔ مُسندِ احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضوؐر نے نہرِ کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: اس کی تہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، جس کے کنارے سونے کے ہیں، وہ موتیوں اور ہیروں پر بہ رہی ہے (یعنی کنکریوں کی جگہ اس کی تہ میں یہ جواہر پڑے ہوئے ہیں)، اس کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی دودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ ماجہ، ابنِ ابی حاتم، دارمی، ابوداؤد طیالسی، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُوْیہ، ابنِ ابی شَیبَہ) اسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے حضوؐر کی تواضع کی اور دورانِ گفتگو میں عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپؐ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اور اس کی زمین یاقوت و مَرجان اور زَبَرجَد اور موتیوں کی ہے۔ (ابنِ جَریر، ابنِ مَردُوْیہ۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے)۔ اِن مرفوع

روایات کے علاوہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنت کی یہ نہر لیتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اوپر گزری ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت اَنَسؓ بن مالک، حضرت عائشہؓ، مجاہد اور ابو العالیہ کے اقوال مُسْنَدِ احمد، بخاری، ترْمِذی، نَسائی، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابنِ جَرِیر اور ابنِ ابی شَیْبَہ وغیرہ محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔

۲- اس کی مختلف تفسیریں مختلف بزرگوں سے منقول ہیں۔ بعض حضرات نے نماز سے مراد پنج وقتہ فرض نماز لی ہے، بعض اس سے بقرعید کی نماز مراد لیتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ بجائے خود نماز مراد ہے۔ اسی طرح وَانْحَرْ یعنی نَحْر کرو سے مراد بعض جلیل القدر بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اُسے سینے پر باندھنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ افتتاحِ نماز کے وقت، اور رُکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اُٹھ کر رفع یدین کرنا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بقرعید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ حکم دیا گیا ہے، اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کا مطلب صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اے نبیؐ! جب تمھارے رب نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بھلائیاں عطا کی ہیں تو تم اُسی کے لیے نماز پڑھو اور اُسی کے لیے قربانی کرو۔'' یہ حکم اُس ماحول میں دیا گیا تھا جب مشرکینِ قریش ہی نہیں، تمام عرب کے مشرکین اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبُودوں کی عبادت کرتے تھے اور انھی کے آستانوں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ پس حکم کا منشا یہ ہے کہ مشرکین کے برعکس تم اپنے اِسی رَوِیّے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو کہ تمھاری نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہو اور قربانی بھی اُسی کے لیے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ ''اے نبیؐ! کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا ہوں۔'' (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳) یہی مطلب ابنِ عباسؓ، عطاء، مجاہد، عِکْرِمَہ، حسن بصری، قَتَادَہ، محمد بن کَعْب القُرظِی، ضَحّاک، ربیع بن اَنَس، عطاء الخُراسانی، اور بہت سے دوسرے اکابر مفسرین رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔ (ابنِ کثیر) البتہ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیّبہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بقرعید کی نماز اور قربانی کا طریقہ جاری کیا تو اس بنا پر کہ آیت اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ اور آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ میں نماز کو مقدم اور قربانی کو مؤخر رکھا گیا ہے، آپؐ نے خود بھی یہ عمل اختیار فرمایا اور اسی کا حکم مسلمانوں کو دیا کہ اُس روز پہلے نماز پڑھیں اور پھر قربانی کریں۔ یہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے، نہ اس کی شانِ نزول ہے، بلکہ اِن آیات سے حضورؐ کا استنباط ہے، اور آپؐ کا اِستنباط بھی وحی کی ایک قسم ہے۔

۳- اصل میں لفظ شَانِئَکَ استعمال ہوا ہے۔ شانئ شَنْءٌ سے ہے، جس کے معنی ایسے بُغض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ ''اور اے مسلمانو! کسی گروہ کی عداوت تمھیں اِس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو۔'' پس شَانِئَکَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپؐ کو عیب لگاتا ہو، آپؐ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپؐ کی توہین کرتا ہو، اور آپؐ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔

۴- هُوَالْاَبْتَرُ ''وہی اَبتر ہے'' فرمایا گیا ہے، یعنی وہ آپؐ کو اَبتر کہتا ہے، لیکن حقیقت میں ابتر وہ خود ہے۔ اَبتر کی کچھ تشریح ہم اِس سے پہلے اس سورت کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ یہ لفظ بَتَر سے ہے جس کے معنٰی کاٹنے کے ہیں۔ مگر محاورے میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے، بُتَیراء کہا گیا ہے، یعنی اکیلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے: كلّ امر ذی بالٍ لا يُبدأ فيه بحمد الله فهو ابتر۔ ''ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ابتر ہے۔'' یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے، اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی ابتر کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ابتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں، وہ بھی ابتر ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے، برادری اور اعوان و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو، وہ بھی ابتر ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا مر گئی ہو، اس کے لیے بھی ابتر کا لفظ بولا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب اِن سب معنوں میں کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبیؐ! ابتر تم نہیں ہو بلکہ تمھارے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ محض کوئی ''جوابی حملہ'' نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اُس وقت لوگ حضوؐر ہی کو اَبتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملکِ عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اَعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ اَحزاب (۵ھ) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضوؐر کو محصور ہو کر، شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ھ میں جب آپؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انھیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملکِ عرب حضوؐر کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے، اور آپؐ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو اُن میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعَیط وغیرہ اَعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زُبیری، اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضوؐر نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

تفہیم القرآن

الکافرون

(۱۰۹)

الکافِرون

نام پہلی ہی آیت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے لفظ الکافرون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حسن بصریؒ اور عِکرِمہؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے، حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ کہتے ہیں مدنی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور قَتَادَہؒ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جُمہورِ مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے، اور اس کا مضمون خود اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

تاریخی پَسِ منظر مکۂ معظّمہ میں ایک دَور ایسا گزرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اِس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ کو کسی نہ کسی طرح مُصالحَت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپؐ کے پاس مُصالحَت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تا کہ آپؐ اُن میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپؐ کے اور اُن کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدّد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عُزّیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبُود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا، ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔[1] اس پر وحی نازل ہوئی:

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کسی درجے میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنیٰ قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپؐ نے، معاذ اللہ، کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آ جائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیجے دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ...... اور یہ کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ○ (الزُّمَر، آیت ۶۴) ''اِن سے کہو: اے نادانو! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟'' (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی) ابنِ عباسؓ کی ایک اور رِوایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا: ''اے محمدؐ! اگر تم ہمارے معبُودُبتوں کو چوم لو تو ہم تمھارے معبُود کی عبادت کریں گے۔'' اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (عبد بن حُمَید)

سعید بن مِیناء (ابوالبَختَری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مُغِیرہ، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المُطّلِب اور اُمَیَّہ بن خَلَف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے کہا: ''اے محمدؐ! آؤ، ہم تمھارے معبُود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبُودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمھیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو، اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے، تو ہم تمھارے ساتھ اُس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصّہ اُس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہوگے اور اُس سے اپنا حصہ پالو گے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ...... (ابنِ جَرِیر وابنِ ابی حاتم۔ ابنِ ہِشام نے بھی سیرت میں اس واقعے کو نقل کیا ہے)۔

وَہب بن مُنَبِّہ کی رِوایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہوجائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہوجایا کریں۔ (عبد بن حُمَید، ابنِ ابی حاتم)

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے کر اُن کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملے میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر اُن سے کوئی مُصالَحت کرلیں گے۔

موضوع اور مضمون

اِس پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اِس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفّار کے دین اور اُن کی پوجاپاٹ اور اُن کے معبُودوں سے قطعی براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور اُنھیں بتا دیا جائے کہ دینِ کفر اور دینِ اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اُن کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مُخاطَب کر کے اُن کی تجاویزِ مُصالَحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ اُنھی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دینِ کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے، اُن کو اس سے قول اور عمل میں بَراءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رُو رعایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملے میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مُداہنت یا مُصالحَت نہیں کرسکتے۔ اسی لیے یہ سورت اُس

رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اُوپر سے حکومت کا جواب ہی تمھارے مطالبے کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہوجاتے ہیں۔

وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مرکھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اِس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور اُن کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں، کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلّقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورہ کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جا سکتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ میں نے بارہا حضورؐ کو فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے دیکھا ہے۔ (اس مضمون کی متعدد روایات کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ امام احمد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حِبّان اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے ابنِ عمرؓ سے نقل کی ہیں)۔

حضرت خَبّابؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹو تو قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، اور حضورؐ کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپ سونے کے لیے لیٹتے تو یہ سورت پڑھ لیا کرتے تھے۔ (بزّار، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: ”میں تمھیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو۔“ (ابویَعلیٰ، طَبَرانی)

حضرت اَنَسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُعاذؓ بن جَبَل سے فرمایا: سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، کیونکہ یہ شرک سے بَراءت ہے۔ (بَیْہَقی فی الشُّعَب)

فَرْوَہ بن نَوْفَل اور عبدالرحمٰن بن نَوْفَل، دونوں کا بیان ہے کہ ان کے والد نَوْفَل بن معاویہ الاَشْجَعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجیے جسے میں سوتے وقت پڑھ لیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا: قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ آخر تک پڑھ کر سو جایا کرو، کیونکہ یہ شرک سے بَراءت ہے۔ (مُسْنَدِ احمد، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ابی شَیْبَہ، حاکم، ابنِ مَرْدُوْیَہ، بَیْہَقی فی الشُّعَب) ایسی ہی درخواست حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بھائی حضرت جَبَلہؓ بن حارثہ نے حضورؐ سے کی تھی اور ان کو بھی آپؐ نے یہی جواب دیا تھا۔ (مُسْنَدِ احمد، طَبَرانی)

آیاتھا ۶ سُوۡرَۃُ الۡکٰفِرُوۡنَ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتھا ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾

ع ۶ / ۳۳

کہہ دو کہ اے کافرو[1]! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو[2]، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[3]۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[4]۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین[5]۔ ع

۱- اس آیت میں چند باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

(۱) حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے کہ آپ کافروں سے یہ بات صاف صاف کہہ دیں، لیکن آگے کا مضمون یہ بتا رہا ہے کہ ہر مومن کو وہی بات کافروں سے کہہ دینی چاہیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہے، حتیٰ کہ جو شخص کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آیا ہو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ دینِ کفر اور اس کی عبادات اور معبُودوں سے اِسی طرح اپنی بَراءت کا اظہار کر دے۔ پس لفظ قُلۡ (کہہ دو) کے اوّلین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر یہ حکم حضورؐ کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپؐ کے واسطے سے ہر مومن کو پہنچتا ہے۔

(۲) ''کافر'' کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے جو اس آیت کے مُخاطبوں کو دی گئی ہو، بلکہ عَرَبی زبان میں کافر کے معنیٰ انکار کرنے والے اور نہ ماننے والے (unbeliever) کے ہیں، اور اس کے مقابلے میں ''مومن'' کا لفظ مان لینے اور تسلیم کر لینے والے (believer) کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''اے کافرو'' دراصل اس معنیٰ میں ہے کہ ''اے وہ لوگو جنھوں نے میری رسالت اور میری لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔'' اور اسی طرح ایک مومن جب یہ لفظ کہے گا تو اس کی مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے والے ہوں گے۔

(۳) اے کافرو کہا ہے، اے مشرکو نہیں کہا، اس لیے کہ مخاطب صرف مشرکین ہی نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول، اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم و ہدایت کو اللہ جَلَّ شانُہٗ کی تعلیم و ہدایت نہیں مانتے، خواہ وہ یہود ہوں، نصاریٰ ہوں، مجوسی ہوں، یا دنیا بھر کے کفار و مشرکین اور مَلاحِدہ ہوں۔ اِس خطاب کو صرف قریش یا عرب کے مشرکین تک محدود رکھنے کی کوئی

وجہ نہیں ہے۔

(۴) منکرین کو "اے کافرو" کہہ کر خطاب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کچھ لوگوں کو اے دشمنو، یا اے مخالفو کہہ کر مخاطب کریں۔ اِس طرح کا خطاب دراصل مُخاطَبوں کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اُن کی صفتِ دشمنی اور صفتِ مُخالَفت کی بنا پر ہوتا ہے اور اُسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک اُن میں یہ صفت باقی رہے۔ اگر اُن میں سے کوئی دشمنی و مخالفت چھوڑ دے، یا دوست اور حامی بن جائے تو وہ اس خطاب کا مُخاطَب نہیں رہتا۔ بالکل اِسی طرح جن لوگوں کو "اے کافرو" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، وہ بھی اُن کی صفتِ کفر کے لحاظ سے ہے، نہ کہ اُن کی ذاتی حیثیت سے۔ اُن میں سے جو شخص مرتے دم تک کافر رہے اُس کے لیے تو یہ خطاب دائمی ہوگا، لیکن جو شخص ایمان لے آئے وہ اِس کا مُخاطَب نہ رہے گا۔

(۵) مفسرین میں سے بہت سے بزرگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سورت میں "اے کافرو" کا خطاب قریش کے صرف اُن چند مخصوص لوگوں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین کے معاملے میں مُصالَحت کی تجویزیں لے لے کر آ رہے تھے اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ رائے انھوں نے دو وجوہ سے قائم کی ہے۔ ایک یہ کہ آگے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (جس کی یا جن کی عبادت تم کرتے ہو اُس کی یا اُن کی عبادت مَیں نہیں کرتا) فرمایا گیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قول یہود و نصاریٰ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں)، اور ان کا اِستدلال یہ ہے کہ یہ قول اُن لوگوں پر صادق نہیں آتا جو اِس سورت کے نُزول کے وقت کافر تھے اور بعد میں ایمان لے آئے۔ لیکن یہ دونوں دلیلیں صحیح نہیں ہیں۔ جہاں تک اِن آیتوں کا تعلق ہے اِن کی تشریح تو ہم آگے چل کر کریں گے، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا وہ مطلب نہیں ہے جو اِن سے سمجھا گیا ہے۔ یہاں اِس استدلال کی غلطی واضح کرنے کے لیے صرف اتنی بات کہہ دینا کافی ہے کہ اگر اِس سورہ کے مخاطَب صرف وہی لوگ تھے تو اُن کے مر کھپ جانے کے بعد اِس سورہ کی تلاوت جاری رہنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور اسے مستقل طور پر قرآن میں درج کر دینے کی کیا ضرورت تھی کہ قیامت تک مسلمان اسے پڑھتے رہیں؟

۲ — اس میں وہ سب معبُود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کفّار اور مشرکین کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خواہ وہ ملائکہ ہوں، جِنّ ہوں، انبیا اور اولیا ہوں، زندہ یا مردہ انسانوں کی ارواح ہوں، یا سورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، دریا، بُت اور خیالی دیویاں اور دیوتا ہوں۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو بھی تو معبُود مانتے تھے، اور دنیا کے دوسرے مشرکین نے بھی قدیم زمانے سے آج تک اللہ کے معبُود ہونے کا انکار نہیں کیا ہے۔ رہے اہلِ کتاب، تو وہ اصل معبُود تو اللہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اِن سب لوگوں کے تمام معبُودوں کی عبادت سے کسی استثنا کے بغیر بَراءت کا اعلان کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب کہ اللہ بھی ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معبُودوں کے مجموعے میں ایک معبُود کی حیثیت سے شامل کر کے اگر دوسروں کے ساتھ اُس کی عبادت کی جائے تو وہ شخص جو توحید پر ایمان رکھتا ہو، لازماً اس عبادت سے اپنی بَراءت کا اظہار کرے گا، کیونکہ اس کے نزدیک اللہ معبُودوں کے مجموعے میں سے ایک معبُود نہیں بلکہ وہی ایک تنہا معبُود ہے، اور اِس مجموعے کی عبادت سرے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں ہے، اگرچہ اُس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآنِ مجید میں اِس بات کو صاف صاف کہا گیا ہے

کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس میں انسان اپنی بندگی کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ ۔ ’’لوگوں کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یک سُو ہو کر، اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی عبادت کریں۔‘‘ (البیّنۃ:۵) یہ مضمون بکثرت مقامات پر قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: النساء، آیات ۱۴۵-۱۴۶۔ الاعراف، ۲۹۔ الزُّمَر، ۲-۳-۱۱-۱۴-۱۵۔ المومن، ۱۴-۶۴ تا ۶۶۔ یہی مضمون ایک حدیثِ قُدسی میں بیان کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی عمل ایسا کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی اُس نے شریک کیا ہو، اُس سے میں بَری ہوں اور وہ پورا کا پورا عمل اُسی کے لیے ہے جس کو اُس نے شریک کیا۔‘‘ (مسلم، مُسندِ احمد، ابنِ ماجہ) پس درحقیقت اللہ کو دو یا تین یا بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا اور اُس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و پرستش کرنا ہی تو وہ اصل کفر ہے جس سے اظہارِ بَراءت کرنا اِس سورت کا مقصود ہے۔

۳۔ اصل الفاظ ہیں: مَآ اَعْبُدُ۔ عربی زبان میں مَا کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اِس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے چار جواب عام طور پر مفسّرین نے دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں مَا بمعنیٰ مَنْ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا بمعنیٰ الَّذِیْ (یعنی جو یا جس) ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں فقروں میں مَا مصدر کے معنیٰ میں ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو، یعنی مشرکانہ عبادت، اور تم وہ عبادت نہیں کرتے جو میں کرتا ہوں، یعنی مؤحِّدانہ عبادت۔ چوتھے یہ کہ پہلے فقرے میں چونکہ مَا تَعْبُدُوْنَ فرمایا گیا ہے اس لیے دوسرے فقرے میں کلام کی مناسبت برقرار رکھتے ہوئے مَآ اَعْبُدُ فرمایا گیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف لفظ کی یکسانی ہے، معنیٰ کی یکسانی نہیں ہے، اور اس کی مثالیں قرآنِ مجید میں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ بَقَرہ (آیت ۱۹۴) میں فرمایا گیا ہے: فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَيْكُمْ ’’جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے۔‘‘ ظاہر ہے کہ زیادتی کا ویسا ہی جواب جیسی زیادتی کی گئی ہو، زیادتی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر محض کلام کی یکسانی کے لیے جواباً زیادتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ توبہ (آیت ۶۷) میں ارشاد ہوا ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ’’وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ اُن کو بھول گیا۔‘‘ حالانکہ اللہ بھولتا نہیں ہے، اور مقصودِ کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نظر انداز فرما دیا، لیکن اُن کے نِسیان کے جواب میں اللہ کے لیے نِسیان کا لفظ محض کلام کی یکسانی برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں یہ سب معنیٰ لینے کی گنجایش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدّعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کہا گیا ہے۔ دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَنْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اُس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے، اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اُردو

زبان میں جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں، تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کیا ہیں؟ تو اس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مثلاً وہ فوج کا آدمی ہے تو فوج میں اس کا منصب کیا ہے؟ اور کسی درس گاہ سے تعلق رکھتا ہے تو اُس میں ریڈر ہے؟ لیکچرر ہے؟ پروفیسر ہے؟ کس علم یا فن کا استاد ہے؟ کیا ڈگریاں رکھتا ہے؟ وغیرہ۔ پس اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَنْ اَعْبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور اس کے جواب میں مشرکین اور کفّار یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور اس کی عبادت بھی ہم کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں، اُن صفات کے معبُود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین منکرینِ خدا کے سوا تمام اقسام کے کفّار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ کا خدا اُن سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ اُن میں سے کسی کا خدا ایسا ہے جس کو چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی، جو ربُّ العالمین نہیں بلکہ ربِّ اسرائیل ہے، جس کا ایک نسل کے لوگوں سے ایسا خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، جو حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑتا ہے اور ان کو گرا نہیں سکتا، جو عُزَیر نامی ایک بیٹا بھی رکھتا ہے۔ کسی کا خدا یسوع مسیح نامی ایک اِکلوتے بیٹے کا باپ ہے اور دوسروں کے گناہوں کا کفارہ بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو صلیب پر چڑھوا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے، مگر بے چارے کے ہاں صرف بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھارتا ہے اور زمین پر انسانی جسم میں رہ کر انسانوں کے سے کام کرتا ہے۔ کسی کا خدا محض واجب الوجود، یا عِلّتُ العِلَل یا عِلّتِ اُولیٰ (first cause) ہے، کائنات کے نظام کو ایک مرتبہ حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اس کے بعد کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق خود چل رہی ہے اور انسان کا اُس سے اور اُس کا انسان سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی درحقیقت اُس خدا کو نہیں مانتے جو ساری کائنات کا ایک ہی خالق، مالک، مدبِّر، منتظم اور حاکم ہے۔ جس نے نظامِ کائنات کو صرف بنایا ہی نہیں ہے، بلکہ ہر آن وہی اس کو چلا رہا ہے اور اس کا حکم ہر وقت یہاں چل رہا ہے۔ جو ہر عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے مُنَزَّہ ہے۔ جو ہر تشبیہ اور تجسیم سے پاک، ہر نظیر و مثیل سے مُبرّا، اور ہر ساتھی اور ساجھی سے بے نیاز ہے۔ جس کی ذات، صفات، اختیارات اور اِستحقاقِ معبُودیّت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ جو اِس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو، یا کسی کو وہ بیٹا بنائے، یا کسی قوم اور نسل سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہو۔ جس کا اپنی مخلوق کے ایک ایک فرد کے ساتھ رزّاقی اور رُبوبیّت اور رحمت اور نگہبانی کا براہِ راست تعلّق ہے۔ جو دعائیں سننے والا اور اُن کا جواب دینے والا ہے۔ جو موت اور زندگی، نفع اور ضرر اور قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے جملہ اختیارات کا تنہا مالک ہے۔ جو اپنی مخلوق کو صرف پالتا ہی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق ہدایت بھی دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا معبود ہے اور ہم اُس کی پرستش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انبیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں امرونہی کے احکام دیتا ہے اور ہمارا کام اس کے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ جس کے سامنے ہم اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں، جو مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ اٹھانے والا ہے اور ہمارے اعمال کا مُحاسَبہ کر کے جزا اور سزا دینے والا ہے۔ اِن صفات کے معبُود کی عبادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے اگر خدا کی عبادت کر بھی رہے ہیں تو اصلی اور حقیقی خدا کی نہیں بلکہ اس خدا کی عبادت کر

رہے ہیں جو اُن کا اپنا اختراع کردہ ایک خیالی خدا ہے۔

۴ - مفسّرین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دونوں فقرے پہلے دو فقروں کے مضمون کی تکرار ہیں، اور یہ تکرار اِس غرض کے لیے کی گئی ہے کہ اُس بات کو زیادہ پُرزور بنا دیا جائے جو پہلے دو فقروں میں کہی گئی تھی۔ لیکن بہت سے مفسّرین اس کو تکرار نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اِن میں ایک اور مضمون بیان کیا گیا ہے جو پہلے فقروں کے مضمون سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اِس حد تک تو اُن کی بات صحیح ہے کہ اِن فقروں میں تکرار نہیں ہے، کیونکہ اِن میں صرف "اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں" کا اعادہ کیا گیا ہے، اور یہ اعادہ بھی اُس معنیٰ میں نہیں ہے، جس میں یہ فقرہ پہلے کہا گیا تھا۔ مگر تکرار کی نفی کرنے کے بعد مفسّرین کے اس گروہ نے ان دونوں فقروں کے جو معنیٰ بیان کیے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اِس کا موقع نہیں ہے کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے بیان کردہ معنیٰ کو نقل کر کے اُس پر بحث کریں، اس لیے طولِ کلام سے بچتے ہوئے ہم صرف وہ معنیٰ بیان کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح ہیں۔

پہلے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ "اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔" اِس کا مضمون آیت ۲ کے مضمون سے بالکل مختلف ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ "میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔" ان دونوں باتوں میں دو حیثیتوں سے بہت بڑا فرق ہے۔ ایک یہ کہ "میں فلاں کام نہیں کرتا یا نہیں کروں گا" کہنے میں اگرچہ انکار اور پُرزور انکار ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ زور یہ کہنے میں ہے کہ میں فلاں کام کرنے والا نہیں ہوں، کیونکہ اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایسا بُرا کام ہے جس کا ارتکاب کرنا تو درکنار، اُس کا ارادہ یا خیال کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ "جن کی عبادت تم کرتے ہو" کا اطلاق صرف اُن معبُودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفار اب کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے "جن کی عبادت تم نے کی ہے" کا اطلاق اُن سب معبُودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفار اور ان کے آبا و اجداد زمانۂ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ اب یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مشرکین اور کفار کے معبُودوں میں ہمیشہ ردّ و بدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے، مختلف زمانوں میں کفار کے مختلف گروہ مختلف معبُودوں کو پوجتے رہے ہیں، اور سارے کافروں کے معبُود ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی نہیں رہے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تمھارے آج کے معبُودوں ہی سے نہیں بلکہ تمھارے آبا و اجداد کے معبودوں سے بھی بَری ہوں، اور میرا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے معبودوں کی عبادت کا خیال تک اپنے دل میں لاؤں۔

رہا دوسرا فقرہ، تو اگرچہ آیت ۵ میں اُس کے الفاظ وہی ہیں جو آیت ۳ میں ہیں، لیکن دونوں جگہ اُس کا مفہُوم مختلف ہے۔ آیت ۳ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ "میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو"، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ "اور نہ تم اُن صفات کے معبُودِ واحد کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔" اور آیت ۵ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ "اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے"، اس لیے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ "اور نہ تم اُس معبُودِ واحد کی عبادت کرنے والے بنتے نظر آتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"، یا بالفاظِ دیگر، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جن جن کو تم نے اور تمھارے اسلاف نے پوجا ہے اُن کا پجاری بن جاؤں، اور تم کو بہت سے معبُودوں کی بندگی چھوڑ کر ایک معبُودِ واحد کی عبادت اختیار کرنے سے جو چِڑ ہے، اُس کی بنا پر تم سے یہ توقع نہیں ہے کہ اپنی اِس غلط عبادت سے باز آ جاؤ گے اور اُس کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

۵ - یعنی میرا دین الگ ہے اور تمھارا دین الگ۔ میں تمھارے معبُودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبُود کے پرستار نہیں۔ میں

تمھارے معبُودوں کی بندگی نہیں کرسکتا اور تم میرے معبُود کی بندگی کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس لیے میرا اور تمھارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔ یہ کفّار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے، بلکہ جب تک وہ کافر ہیں اُن سے ہمیشہ کے لیے بَراءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے، اور اس سے مقصود اُن کو اِس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملے میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی اُن سے کوئی مُصالَحت کرے گا۔ یہی اعلانِ بَراءت اور اظہارِ بیزاری اِس سورت کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونُس میں فرمایا: ''اگر یہ تجھے جھُٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمّہ داری سے تم بَری ہو، اور جو کچھ تم کررہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بَری ہوں۔'' (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اِسی سورت میں فرمایا: ''اے نبیؐ! کہہ دو کہ لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شُبہے میں ہو تو (سن لو کہ) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو، میں ان کی بندگی نہیں کرتا، بلکہ صرف اُس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمھاری موت ہے۔'' (آیت ۱۰۴) سورۂ شُعَراء میں فرمایا: ''اے نبیؐ! اب اگر یہ لوگ تمھاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُس سے میں بَری الذمہ ہوں۔'' (آیت ۲۱۶) سورۂ سَبا میں فرمایا: ''ان سے کہو: جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی، اور جو کچھ تم کررہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو: ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمھیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے گا۔'' (آیات ۲۵-۲۶) سورۂ زُمَر میں فرمایا: ''اِن سے کہو: اَے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں۔'' (آیات ۳۹-۴۰) پھر یہی سبق مدینۂ طیبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ''تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے اُن معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑگیا، جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔'' (الممتحنہ، آیت ۴) قرآنِ مجید کی ان پے درپے توضیحات سے اس شُبہے کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی سورۂ زُمَر میں فرمائی گئی ہے کہ ''اے نبیؐ! اِن سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔'' (آیت ۱۴)

اِس آیت سے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن کفر بحیثیت مجموعی ایک ہی ملّت ہے، اس لیے یہودی عیسائی کا، اور عیسائی یہودی کا، اور اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہوسکتا ہے اگر اُن کے درمیان نسب، یا نکاح، یا کسی سبب کی بنا پر کوئی ایسا تعلق ہو جو ایک کی وراثت دوسرے کو پہنچنے کا مقتضی ہو۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ، امام اَوزاعیؒ اور امام احمدؒ اِس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پَیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پاسکتے۔ ان کا اِستدلال اُس حدیث سے ہے، جو حضرت عبداللہ بن عَمروؓ بن عاص سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یتوارث اھل ملّتین شتّٰی۔ ''دو مختلف ملّتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔'' (مُسندِ احمد، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دارقُطنی) اس سے ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث ترمذی نے حضرت جابرؓ سے، اور ابنِ حبّان نے حضرت عبداللہؓ بن عمر سے، اور بَزّار نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسلکِ حنفی

کے مشہور امام، شمس الائمہ سَرَخسی لکھتے ہیں: ''کفّار آپس میں اُن سب اسباب کی بنا پر بھی ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں جن کی بنا پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، اور اُن کے درمیان بعض ایسی صورتوں میں بھی توارُث ہوسکتا ہے جن میں مسلمانوں کے درمیان نہیں ہوتا...... حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بس دو ہی دین قرار دیے ہیں، ایک: دینِ حق، دوسرے دینِ باطل۔ چنانچہ فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ اور اس نے لوگوں کے دو ہی فریق رکھے ہیں، ایک فریق جنّتی ہے اور وہ مومن ہے، اور دوسرا فریق دوزخی ہے اور وہ بحیثیتِ مجموعی تمام کفّار ہیں۔ اور اس نے دو ہی گروہوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ (یہ دو مدِّ مقابل فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ الحج، آیت ۱۹) یعنی ایک فریق تمام کفّار بحیثیتِ مجموعی ہیں اور ان کا جھگڑا اہلِ ایمان سے ہے...... ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق باہم الگ الگ ملّتیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہی ملّت ہیں، کیونکہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا اقرار کرتے ہیں اور وہ ان کا انکار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کافر قرار پائے ہیں اور مسلمانوں کے معاملے میں وہ سب ایک ملت ہیں...... حدیث لا یتوارث اهل ملّتین، اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ مِلّتَین (دو ملّتوں) کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے کر دی ہے کہ لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم۔ ''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے۔'' (المَبسُوط، ج ۳۰، صفحات ۳۰-۳۲) امام سَرَخسی نے یہاں جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، اسے بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ اور ابوداؤد نے حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے روایت کیا ہے۔

تفہیم القرآن

النَّصر

(۱۱۰)

النَّصر

نام

پہلی آیت اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ کے لفظ نصر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت حضورؐ پر نازل نہیں ہوئی[1] (مسلم، نَسائی، طَبَرانی، ابنِ ابی شَیْبَہ، ابنِ مَرْدُوْیَہ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ یہ سورت حَجَّۃُ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں بمقام مِنٰی نازل ہوئی اور اس کے بعد حضورؐ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔ (ترمِذی، بزّار، بَیْہَقی، ابنِ ابی شَیْبَہ، عبد بن حُمَید، ابویَعلیٰ، ابنِ مَرْدُوْیَہ) بَیْہَقی نے کتاب الحج میں حضرت سَرّاء بنت نَبْہان کی روایت سے حضورؐ کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپؐ نے اِس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ:

"میں نے حَجَّۃُ الوداع میں حضورؐ کو یہ فرماتے سنا کہ لوگو! جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: یہ ایامِ تشریق کے بیچ کا دن ہے۔ پھر آپؐ نے پوچھا: جانتے ہو یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: یہ مَشْعَرِ حرام ہے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، شاید اِس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ خبردار رہو، تمھارے خون

---

[1] مختلف رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد بعض آیات نازل ہوئی ہیں، لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی وہ آیت کون سی ہے جو حضورؐ پر سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضرت بَراءؓ بن عازِب کی روایت یہ ہے کہ وہ سورۂ نساء کی آخری آیت یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ ہے۔ امام بخاریؒ نے ابنِ عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت رِبا یعنی جس آیت میں سود کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ اس کی تائید اُن روایات سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد، ابنِ ماجہ اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت عمرؓ سے نقل کی ہیں، مگر اُن میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ آخری آیت ہے، بلکہ حضرت عمرؓ کا قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ ابوعُبَید نے فضائل القرآن میں امام زُہری کا، اور ابن جَرِیر نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن المُسَیَّب کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ رِبا اور آیتِ دَین (یعنی سورۂ بقرہ رُکوع ۳۸، ۳۹) قرآن میں نازل ہونے والی آخری آیات ہیں۔ نَسائی، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور ابنِ جَرِیر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ (البقرہ: ۲۸۱) قرآن کی آخری آیت ہے۔ الفِریابی نے اپنی تفسیر میں ابنِ عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ آیت حضورؐ کی وفات سے ۸۱ دن پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور سعید بن جُبَیرؒ کا قول جو ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے، اس میں اس آیت کے نزول اور حضورؐ کی وفات کے درمیان صرف ۹ دن کا فصل بیان کیا گیا ہے۔ امام احمد کی مُسنَد اور امام حاکم کی المستدرک میں حضرت اُبَیؓ بن کَعْب کی روایت یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۸، ۱۲۹ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

اور تمھاری عزّتیں ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مقام حرام ہے، یہاں تک کہ تم اپنے رب کے سامنے حاضر ہو اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں سوال کرے۔ سنو، یہ بات تم میں سے قریب والا دُور والے تک پہنچا دے۔ سنو، کیا میں نے تمھیں پہنچا دیا؟ اِس کے بعد جب ہم لوگ مدینہ واپس ہوئے تو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ حضوؐر کا انتقال ہو گیا۔‘‘

اِن دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نصر کے نُزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیان ۳ مہینے کچھ دن کا فصل تھا، کیونکہ تاریخ کی رُو سے حَجۃُ الوداع اور حضوؐر کے وصال کے درمیان اتنا ہی زمانہ گزرا تھا۔

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا: مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پورا ہوا۔ (مُسندِ احمد، ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، ابنِ مَرْدُوْیَہ) دوسری روایات جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِس سورت کے نزول سے حضوؐر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپؐ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ (مُسند احمد، ابنِ جَرِیر، طَبَرانی، نَسائی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حَبِیبہؓ فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا: اس سال میرا انتقال ہونے والا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت فاطمہؓ رو دیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: میرے خاندان میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آ کر ملو گی۔ یہ سن کر وہ ہنس دیں۔ (ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ) قریب قریب اِسی مضمون کی روایت بَیْہَقی نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے۔

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے، غَزوۂ بَدر میں شریک ہونے والے بڑے بڑے شُیوخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بلاتے تھے۔ یہ بات بعض بزرگوں کو ناگوار گزری اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اِسی لڑکے جیسے ہیں، اِس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ شریکِ مجلس کیا جاتا ہے؟ (امام بخاری اور ابنِ جَریر نے تصریح کی ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عَوف تھے)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اِس کا جو مقام ہے، وہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک روز اُنھوں نے شیوخِ بدر کو بلایا اور مجھے بھی اُن کے ساتھ بُلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے یہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے کہ مجھ کو اِن کی مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت عمرؓ نے شیوخِ بدرؓ سے پوچھا کہ آپ حضرات اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بعض نے کہا: اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آئے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے اِستِغفار کریں۔ بعض نے کہا: اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے۔ بعض خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا: ابنِ عباسؓ! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اَجل ہے۔ اس میں حضوؐر کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ کا وقت آن پورا ہوا، اِس

کے بعد آپؐ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں بھی اُس کے سوا کچھ نہیں جانتا جو تم نے کہا ہے۔ ایک رِوایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے شیوخ بدر سے فرمایا: آپ لوگ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں، جب کہ اِس لڑکے کو اِس مجلس میں شریک کرنے کی وجہ آپ نے دیکھ لی۔ (بخاری، مُسندِ احمد، ترمِذی، ابنِ جَرِیر، ابنِ مَردُوْیہ، بَغَوی، بَیْہَقی، ابن المُنذِر)

موضوع اور مضمون

جیسا کہ مندرجۂ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپؐ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اُس کے فضل سے آپؐ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے، اور اُس سے دعا کریں کہ اِس خدمت کی انجام دہی میں جو بُھول چُوک یا کوتاہی بھی آپؐ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرما دے۔ اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلابِ عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدّن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اُٹھا کر اِس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوامِ عالَم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں، بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے کلمات ہیں جو آپؐ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا: میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں، اور وہ ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ (مُسندِ احمد، مسلم، ابنِ جَرِیر، ابن المُنذِر، ابنِ مَردُوْیہ) اسی سے ملتی جُلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے: سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ۔ یہ قرآن (یعنی سورۂ نصر) کی تاویل تھی جو آپؐ نے فرمائی تھی۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جَرِیر)

حضرت اُمِّ سَلَمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آپؐ کے آخری زمانۂ حیات

میں اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، میں نے ایک روز پوچھا کہ یارسولؐ اللہ! آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہیں؟ فرمایا: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ سورت پڑھی۔ (ابنِ جَریر)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ، سُبْحٰنَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ (ابنِ جریر، مُسندِ احمد، ابنِ ابی حاتم)

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے لیے محنت و ریاضت کرنے میں اِس قدر شدت کے ساتھ مشغول ہو گئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ (نَسائی، طَبَرانی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

آیاتہا ۳ — رکوعاتہا ۱

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ ع

جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے[1] اور (اے نبیؐ!) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج دَر فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں[2]، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو[3]، اور اُس سے مغفرت کی دُعا مانگو[4]، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ع

۱- فتح سے مراد کسی ایک معرکے میں فتح نہیں، بلکہ وہ فیصلہ کُن فتح ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے قابل باقی نہ رہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عرب میں اِسی دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ بعض مفسّرین نے اس سے مراد فتحِ مکّہ لی ہے۔ لیکن فتحِ مکّہ ۸ ھ میں ہوئی ہے اور اِس سورہ کا نزول ۱۰ ھ کے آخر میں ہوا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت سَرّاءؓ بنت نَبہان کی اُن روایات سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے دیباچے میں نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول بھی اِس تفسیر کے خلاف پڑتا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی سب سے آخری سورت ہے، کیونکہ اگر فتح سے مراد فتحِ مکہ ہو تو پوری سورۂ توبہ اس کے بعد نازل ہوئی تھی، پھر یہ سورت آخری سورت کیسے ہو سکتی ہے؟ بلاشبہ فتحِ مکہ اس لحاظ سے فیصلہ کُن تھی کہ اس نے مشرکینِ عرب کی ہمتیں پست کر دی تھیں، مگر اُس کے بعد بھی اُن میں کافی دَم خم باقی تھا۔ طائف اور حُنَین کے معرکے اس کے بعد ہی پیش آئے اور عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہونے میں تقریباً دو سال صَرف ہوئے۔

۲- یعنی وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آ جائے جب پورے پورے قبیلے، اور بڑے بڑے علاقوں کے باشندے کسی جنگ اور کسی مزاحمت کے بغیر از خود مسلمان ہونے لگیں۔ یہ کیفیت ۹ ھ کے آغاز سے رونما ہونی شروع ہوئی جس کی وجہ سے اُس سال کو سالِ وُفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اسلام قبول کر کے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۰ ھ میں جب حضورؐ حَجۃُ الوداع کے لیے تشریف لے گئے، اُس وقت پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی نہ رہا تھا۔

۳- حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف وثنا کرنا بھی ہے اور اُس کا شکر ادا کرنا بھی۔ اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور مُنَزَّہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اِس عظیم کامیابی کے متعلق تمھارے دل میں کبھی اس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آئے کہ یہ تمھارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اِس کو سراسر اللہ کا فضل وکرم سمجھو، اِس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب وزبان سے اِس امر کا اعتراف کرو کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اِس سے پاک اور مُنَزَّہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمھاری کسی سعی وکوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اِس کے برعکس تمھارا دل اس یقین سے لبریز رہے کہ تمھاری سعی وکوشش کی کامیابی اللہ کی تائید ونصرت پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمھارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کرایا۔ اِس کے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی مُحیِّرُالعقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے، ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اُس سے صادر ہو سکتا۔

۴- یعنی اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اُس نے تمھارے سُپرد کی تھی اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو، اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو، اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں اور اس کی عبادت وبندگی بجا لانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اُس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورا کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا، اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اُس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو اس سے درگزر فرما کر میری حقیری خدمت قبول فرما لے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی وجُہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اِس غرّے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اُس پر تھا وہ اُس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اِس سے بہت بالا وبرتر ہے کہ کوئی مخلوق اُسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت وریاضت اور کسی خدمتِ دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان راہِ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔“ اسی طرح جب کبھی انھیں کوئی فتح نصیب ہو، اُسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر وغرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد وتسبیح اور توبہ واستغفار کریں۔

تفہیم القرآن

اللھب

(۱۱۱)

اَللَّھَب

نام پہلی آیت کے لفظ لَہَب کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول اِس کے مکی ہونے میں تو مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مکّی دَور کے کس زمانے میں یہ نازل ہوئی تھی۔ البتہ ابولہب کا جو کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ حق کے خلاف تھا، اُس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس سورہ کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہوگا جب وہ حضوؐر کی عداوت میں حد سے گزر گیا تھا اور اُس کا رَوِیّہ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن رہا تھا۔ بعید نہیں کہ اِس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان والوں کا مقاطعہ کر کے قریش کے لوگوں نے اُن کو شِعْبِ ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور تنہا ابولہب ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ ہمارے اِس قیاس کی بنا یہ ہے کہ ابولہب حضوؐر کا چچا تھا، اور بھتیجے کی زبان سے چچا کی کُھلّم کُھلّا مَذمّت کرانا اُس وقت تک مناسب نہ ہوسکتا تھا جب تک چچا کی حد سے گزری ہوئی زیادتیاں عَلانِیَہ سب کے سامنے نہ آ گئی ہوں۔ اِس سے پہلے اگر ابتدا ہی میں یہ سورت نازل کر دی گئی ہوتی تو لوگ اس کو اخلاقی حیثیت سے معیوب سمجھتے کہ بھتیجا اپنے چچا کی اس طرح مَذمّت کرے۔

پَسِ منظر قرآنِ مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مَذمّت کی گئی ہے، حالانکہ مکہ میں بھی، اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اِس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی؟ اِس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے، اور اُس میں ابولہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملکِ عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفُّظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کو بڑی اہمیّت حاصل تھی، اور قطعِ رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی اِنھی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور

بنی المُطَّلِب (ہاشم کے بھائی مُطَّلِب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کُھلّم کُھلّا آپؐ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپؐ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے اِن خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اِس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اِس اخلاقی اُصول کو، جسے زمانۂ جاہلیّت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابولہب بن عبد المُطَّلِب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ حضورؐ کے والد ماجد اور یہ، ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خُصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اِس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبّت میں اِن تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابنِ عباسؓ سے متعدّد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآنِ مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپؐ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھُٹ پُٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آ سکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آ سکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المُطَّلِب، اے بنی فِہر، اے بنی فُلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تو میں تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا: تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''ستیاناس جائے تیرا، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟'' ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اُٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے۔ (مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، ابنِ جَریر وغیرہ)

ابنِ زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا: اگر میں تمھارے

دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا: میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا: تَبًّا لِهٰذَا الدِّيْنِ تَبًّا اَنْ اَكُوْنَ وَهٰٓؤُلَاۤءِ سَوَآءً ''ناس جائے اِس دین کا جس میں مَیں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔'' (ابنِ جریر)

مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اس کے علاوہ حَکَم بن عاص (مَروان کا باپ)، عُقبہ بن ابی مُعَیط، عدی بن حَمْراء اور ابنِ الاَصْداء الھُذَلی بھی آپؐ کے ہمسایے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپؐ پر پھینک دیتے۔ کبھی صَحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے: ''اے بنی عبدِمَناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟'' ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لاکر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپؐ یا آپؐ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چُبھ جائے۔ (بَیْہَقی، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جَریر، ابنِ عَساکر، ابنِ ہِشام)

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاجزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتْبہ اور عُتَیْبَہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اِس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتَیْبَہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں اَلنَّجْمِ اِذَا هَوٰی اور اَلَّذِیْ دَنَا فَتَدَلّٰی کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپؐ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا: خدایا! اِس پر اپنے کتّوں میں سے ایک کتّے کو مسلّط کر دے۔ اِس کے بعد عُتَیْبَہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دَورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مَقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عُتَیْبَہ کے گرد ہر طرف اپنے اُونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اُس نے عُتَیْبَہ کو پھاڑ کھایا۔ (الاِستِیعاب لِابنِ عبدالبَرّ، الِاصابہ لِابنِ حَجَر، دلائل النبوۃ لِاَبی نُعَیم الاَصفہانی، رَوضُ الاُنُف لِلسُّہَیلی۔ رِوایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عُتْبَہ تھا یا عُتَیْبَہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد عُتْبَہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عُتَیْبَہ تھا)۔

اُس کے خُبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ لو، آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام ونشان ہوگئے۔ اُس کی اِس حرکت کا ذکر ہم سورۂ کوثر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپؐ کی بات سننے سے روکتا۔ رَبِیعہؓ بن عَبّاد الدِّیْلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ کہہ رہے تھے: ''لوگو! کہو: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے۔'' اور آپؐ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ ''یہ جھوٹا ہے، دینِ آبائی سے پِھر گیا ہے۔'' میں نے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (مُسندِ احمد، بَیْہَقِی) دوسری روایت انھی حضرت ربیعہؓ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''اے بنی فُلاں! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو، تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔'' آپؐ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ''اے بنی فُلاں! یہ تم کو لات اور عُزّیٰ سے پھیر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔'' میں نے اپنے باپ سے پوچھا: یہ کون ہے؟ انھوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (مُسندِ احمد، طَبَرانی) طارقؓ بن عبداللہ المُحارِبی کی روایت بھی اسی سے مِلتی جُلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ ''لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔'' اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپؐ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپؐ کی ایڑیاں خون سے تر ہوگئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ ''یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو۔'' میں نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (ترمِذی)

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب کا معاشرتی اور معاشی مُقاطَعَہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شِعْبِ ابی طالب میں محصور ہوگئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفّارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مُقاطَعَہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المُطَّلِب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شِعْبِ ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ اِن

سے اِتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمھیں جو خسارہ بھی ہوگا اسے میں پورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا۔ پھر ابولہب اُنھی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا۔ (ابنِ سعد وابنِ ہشام)

یہ اس شخص کی حرکات تھیں جن کی بنا پر اس سورہ میں نام لے کر اس کی مذمّت کی گئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ مکہ سے باہر کے اہلِ عرب جو حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے، اُن کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپؐ کے پیچھے لگ کر آپؐ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلا وجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو برا بھلا کہے اور اُسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اِس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متأثر ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے۔ مگر جب یہ سورت نازل ہوئی اور ابولہب نے غصے میں بپھر کر اَول فَول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اِس شخص کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے بھتیجے کی دشمنی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

اِس کے علاوہ نام لے کر جب آپؐ کے چچا کی مذمت کی گئی تو لوگوں کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملے میں کسی کا لحاظ کر کے کوئی مداہنت برت سکتے ہیں۔ جب عَلَی الاعلان رسولؐ کے اپنے چچا کی خبر لے ڈالی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ یہاں کسی لاگ لپیٹ کی گنجایش نہیں ہے۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے اگر ایمان لے آئے، اور اپنا غیر ہو جاتا ہے اگر کفر کرے۔ اِس معاملے میں فُلاں ابنِ فُلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

آیاتھا ۵ سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵

ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ[1]۔ اُس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اُس کے کسی کام نہ آیا[2]۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا، اور (اُس کے ساتھ) اُس کی جورو بھی[3]، لگائی بُجھائی کرنے والی[4]، اُس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی[5]۔ ع

۱- اس شخص کا اصل نام عبد العُزّٰی تھا، اور اسے ابولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ و سفید تھا۔ لہب آگ کے شُعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رُو۔ یہاں اُس کا ذکر اُس کے نام کے بجائے اُس کی کُنیت سے کرنے کے کئی وجوہ ہیں: ایک یہ کہ وہ زیادہ تر اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی کنیت ہی سے معروف تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا نام عبد العُزّٰی (بندۂ عُزّٰی) ایک مشرکانہ نام تھا اور قرآن میں یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اُسے اِس نام سے یاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اُس کا جو انجام اِس سورہ میں بیان کیا گیا ہے، اُس کے ساتھ اُس کی یہ کُنیت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں، اور وَّتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اُس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آیندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اُس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی۔ اور فی الواقع آخرِ کار وہی کچھ ہوا جو اِس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد، ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو۔ اور ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت بھی نہایت عبرت ناک تھی۔ اُسے عَدَسَہ (Malignant Pustule) کی بیماری ہو گئی، جس کی وجہ سے

اس کے گھر والوں نے اُسے چھوڑ دیا، کیونکہ انھیں چھوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بُو پھیلنے لگی۔ آخرِ کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے، تو ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور اُنھی مزدوروں نے اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اُس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اُس کی مزید اور مکمل شکست اِس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرَّہ ہجرت کر کے مکے سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتحِ مکہ کے موقع پر اُس کے دونوں بیٹے عُتْبہ اور مُعَتِّب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انھوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

۲ - ابولہب سخت بخیل اور زر پرست آدمی تھا۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک مرتبہ اُس پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اس نے کعبہ کے خزانے میں سے سونے کے دو ہرن چُرا لیے ہیں۔ اگرچہ بعد میں وہ ہرن ایک اور شخص کے پاس سے برآمد ہوئے، لیکن بجائے خود یہ بات، کہ اُس پر یہ الزام لگایا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ مکہ کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اُس کی مالداری کے متعلق قاضی رشید بن زبیر اپنی کتاب الذَّخائر والتُّحَف میں لکھتے ہیں کہ وہ قریش کے اُن چار آدمیوں میں سے ایک تھا جو ایک قِنطار سونے کے مالک تھے (قِنطار دوسو اوقیے کا، اور ایک اوقیہ سوا تین تولے کا ہوتا ہے)۔ اُس کی زر پرستی کا اندازہ اِس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جنگِ بَدر کے موقع پر، جب کہ اُس کے مذہب کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، قریش کے تمام سردار لڑنے کے لیے گئے، مگر اُس نے عاص بن ہِشام کو اپنی طرف سے لڑنے کے لیے بھیج دیا اور کہا کہ یہ اُس چار ہزار دِرہم قرض کا بدل ہے جو میرا تم پر آتا ہے۔ اِس طرح اُس نے اپنا قرض وصول کرنے کی بھی ایک ترکیب نکال لی، کیونکہ عاص دیوالیہ ہو چکا تھا اور اُس سے رقم ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

مَا کَسَبَ کو بعض مفسرین نے کمائی کے معنیٰ میں لیا ہے، یعنی اپنے مال سے جو منافع اُس نے حاصل کیے وہ اُس کا کَسَب تھے۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اُس کا کَسَب ہے۔ (ابوداؤد، ابنِ ابی حاتم) یہ دونوں معنیٰ ابولہب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ عَدَسَہ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس کا مال بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور اس کی اولاد نے بھی اسے بے کسی کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس کا جنازہ تک عزت کے ساتھ اٹھانے کی اس اولاد کو توفیق نہ ہوئی۔ اِس طرح چند ہی سال کے اندر لوگوں نے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا جو ابولہب کے متعلق اِس سورہ میں کی گئی تھی۔

۳ - اس عورت کا نام اَرْوٰی تھا اور اُمِّ جَمِیل اِس کی کنیت تھی۔ یہ ابوسُفیان کی بہن تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اَسماءؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اور اُمِّ جمیل نے اِس کو سنا تو وہ بھری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں مُٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہَجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حَرَم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ

تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ آ رہی ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپؐ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپؐ کو نہیں دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے، تمھارے صاحب نے میری ہَجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اِس گھر کے رب کی قسم! انھوں نے تو تمھاری کوئی ہَجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی۔ (ابنِ ابی حاتم، سیرت ابنِ ہِشام۔ بزّار نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِسی سے ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہَجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔

۴ – اصل الفاظ ہیں: حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: ”لکڑیاں ڈھونے والی“۔ مفسّرین نے اس کے متعدّد معنیٰ بیان کیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابنِ زیدؓ، ضحّاک اور ربیع بن اَنَس کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو خاردار درختوں کی ٹہنیاں لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈال دیتی تھی، اس لیے اس کو لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا ہے۔ قتادہ، عِکرِمہ، حسن بصری، مجاہد اور سُفیان ثَوری کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں فساد ڈلوانے کے لیے چُغلیاں کھاتی پھرتی تھی، اس لیے اسے عربی محاورے کے مطابق لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا، کیونکہ عرب ایسے شخص کو جو اِدھر کی بات اُدھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا ہو، لکڑیاں ڈھونے والا کہتے ہیں۔ اس محاورے کے لحاظ سے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنیٰ ٹھیک ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں ”بی جمالو“ کے معنیٰ ہیں۔ سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رہا ہو، اُس کے متعلق عربی زبان میں بطورِ محاورہ کہا جاتا ہے: فُلَانٌ يَّحْطَتِبُ عَلٰى ظَهْرِهٖ۔ (فُلاں شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لاد رہا ہے)۔ پس حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنیٰ ہیں: گناہوں کا بوجھ ڈھونے والی۔ ایک اور مطلب مفسّرین نے اس کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آخرت میں اُس کا حال ہوگا، یعنی وہ لکڑیاں لا لا کر اُس آگ میں ڈالے گی جس میں ابولہب جل رہا ہوگا۔

۵ – اُس کی گردن کے لیے جِید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو عربی زبان میں ایسی گردن کے لیے بولا جاتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ سعید بن المُسَیَّب، حسن بصری اور قَتَادَہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پہنتی تھی، اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عُزّیٰ کی قسم! میں اپنا یہ ہار بیچ کر اس کی قیمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت میں خرچ کر دوں گی۔ اسی بنا پر جِید کا لفظ یہاں بطورِ طنز استعمال کیا گیا ہے کہ اِس مُزَیَّن گلے میں، جس کے ہار پر وہ فخر کرتی ہے، دوزخ میں رَسّی پڑی ہوگی۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ اندازِ کلام ہے جیسے قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر فرمایا گیا ہے: بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

جو رَسّی اس کی گردن میں ڈالی جائے گی اس کے لیے حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یعنی وہ رَسّی مَسَد کی قسم سے ہوگی۔ اِس کے مختلف معنیٰ اہلِ لغت اور مفسّرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خوب مضبوط بٹی ہوئی رَسّی کو مَسَد کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رَسّی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں: مونجھ کی رسّی یا اونٹ کی کھال یا اس کے صوف سے بنی ہوئی رسّی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد لوہے کے تاروں سے بٹی ہوئی رسّی ہے۔

تفہیم القرآن

الاِخلاص

(۱۱۲)

الاخلاص

نام اَلْاِخلاص اِس سورہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی دوسری سورتوں میں تو بالعموم کسی ایسے لفظ کو اُن کا نام قرار دیا گیا ہے جو اُن میں وارد ہوا ہو، لیکن اِس سورہ میں لفظ اِخلاص کہیں وارد نہیں ہوا ہے۔ اِس کو یہ نام اِس کے معنٰی کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اِس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا، وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔

زمانۂ نزُول اِس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف اُن روایات کی بنا پر ہے جو اِس کے سببِ نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں[1] بتائیے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (طَبَرانی)

(۲) ابو العالیہ نے حضرت اُبَیؓ بن کَعب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (مُسنَدِ احمد، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جَریر، ترمِذِی، بخاری فی التاریخ، ابن المُنذِر، حاکم، بَیہَقی) ترمِذِی نے اِسی مضمون کی ایک رِوایت ابو العالیہ سے نقل کی ہے جس میں حضرت اُبَیؓ بن کَعب کا حوالہ نہیں ہے اور اُسے صحیح تر کہا ہے۔

(۳) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک اَعرابی نے (اور بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (ابو یَعلیٰ، ابنِ جَریر، ابن المُنذِر، طَبَرانی فی الاوسط، بَیہَقی، ابو نُعَیم فی الحِلیَہ)

(۴) عِکرِمَہ نے ابنِ عباسؓ سے رِوایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں کَعب بن اشرف اور حُیَیّ بن اَخطَب وغیرہ شامل تھے اور انھوں نے کہا: ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہمیں بتائیے کہ آپؐ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپؐ کو بھیجا ہے۔“ اس پر اللہ تعالیٰ

---

[1] اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اِنسِبْہُ لَنَا، اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ اُن کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ اُس کا نسب کیا ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ آپؐ کا رب کون ہے اور کیسا ہے تو انھوں نے کہا: اِنْسِبْ لَنَا رَبَّکَ، اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے۔

نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (ابنِ ابی حاتم، ابنِ عَدِی، بَیْہَقِی فی الاسماء والصّفات)

اِن کے علاوہ مزید چند روایات ابنِ تَیْمِیَہ نے اپنی تفسیر سورۂ اخلاص میں نقل کی ہیں جو یہ ہیں:

(۵) حضرت اَنَسؓ کا بیان ہے کہ خیبر کے کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے کہا: ''اے ابو القاسمؐ! اللہ نے ملائکہ کو نورِ حجاب سے، آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے، ابلیس کو آگ کے شُعلے سے، آسمان کو دھویں سے، اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا، اب ہمیں اپنے رب کے متعلق بتائیے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جبریلؑ آئے اور انھوں نے کہا: اے محمدؐ! ان سے کہیے: ھُوَ اللہُ اَحَدٌ......

(۶) عامر بن الطُّفَیل نے حضورؐ سے کہا: ''اے محمدؐ! آپ کس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: اللہ کی طرف۔ عامر نے کہا: ''اچھا تو اُس کی کیفیت مجھے بتائیے۔ وہ سونے سے بنا ہُوا ہے یا چاندی سے، یا لوہے سے؟'' اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

(۷) ضَحّاک اور قَتادَہ اور مُقاتِل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علما حضورؐ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا: ''اے محمدؐ! اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتائیے، شاید کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت تورات میں نازل کی ہے۔ آپ بتائیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟ سونے سے بنا ہے، یا تانبے سے، یا پیتل سے، یا لوہے سے، یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھاتا ہے اور پیتا ہے؟ اور کس سے اُس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

(۸) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نَجْران کے عیسائیوں کا ایک وفد سات پادریوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے حضورؐ سے کہا: ''ہمیں بتائیے آپ کا رب کیسا ہے، کس چیز سے بنا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے۔ وہ تمام اشیا سے جدا ہے۔'' اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس معبُود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی تھی جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اور ہر موقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو جواب میں یہی سورت سنائی تھی۔ سب سے پہلے یہ سوال مکہ میں قریش کے مشرکین نے آپؐ سے کیا، اور اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے، کبھی عیسائیوں نے، اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضورؐ سے اِسی نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہی سورت آپؐ ان کو سنا دیں۔ اِن روایات میں سے ہر ایک میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اِس موقع پر یہ سورت

نازل ہوئی تھی، اِس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب روایتیں باہم متضاد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں اگر پہلے سے کوئی آیت یا سورت نازل شدہ موجود ہوتی تھی تو بعد میں جب کبھی حضورؐ کے سامنے وہی مسئلہ پیش کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آ جاتی تھی کہ اس کا جواب فلاں آیت یا سورت میں ہے، یا اِس کے جواب میں وہ آیت یا سورت لوگوں کو پڑھ کر سنا دی جائے۔ احادیث کے راوی اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب فلاں معاملہ پیش آیا، یا فلاں سوال کیا گیا تو یہ آیت یا سورت نازل ہوئی۔ اِس کو تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک آیت یا سورت کا کئی مرتبہ نازل ہونا۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورت دراصل مکّی ہے، بلکہ اِس کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے، جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بیان میں قرآن کی مفصّل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اِلی اللہ کو سن کر لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر آپؐ کا وہ رب ہے کیسا جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپؐ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ اِس کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورت ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مکہ میں جب حضرت بِلالؓ کا آقا اُمیّہ بن خلف اُن کو دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بڑا سا پتھر اُن کی چھاتی پر رکھ دیتا تھا تو وہ اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتے تھے۔ یہ لفظِ اَحَد اِسی سورہ سے ماخوذ تھا۔

موضوع اور مضمون

شانِ نزول کے بارے میں جو روایات اُوپر درج کی گئی ہیں، اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصوّرات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے تھے۔ شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی، اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ اُن کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اُس کے اَوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدّعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا، اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں روح القُدس کو بھی حصّہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حتّٰی کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا، انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اپنے کسی بندے سے کُشتی بھی لڑ لیتا تھا، اور ایک عدد بیٹے (عُزَیر) کا باپ بھی تھا۔ اِن مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی آتش پرست تھے اور صابی ستارہ پرست۔ اس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت لوگوں کو دی گئی تو اُن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبُودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود

تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے اِن سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصوّر پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہنے دیتا۔

فضیلت اور اہمیّت

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپؐ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اِس کی اہمیت محسوس کراتے تھے، تاکہ وہ کثرت سے اِس کو پڑھیں اور عوام الناس میں اِسے پھیلائیں، کیونکہ یہ اسلام کے اوّلین بنیادی عقیدے (توحید) کو چار ایسے مختصر فقروں میں بیان کر دیتی ہے جو فوراً انسان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، تِرمِذی، ابنِ ماجہ، مُسندِ احمد، طَبَرانی وغیرہ میں اِس مضمون کی متعدّد احادیث ابوسعید خُدری، ابو ہریرہ، ابو ایوب انصاری، ابوالدّرداء، مُعاذ بن جَبَل، جابر بن عبداللہ، اُبَیّ بن کَعب، اُمِ کُلثوم بنت عُقبَہ بن ابی مُعَیط، ابنِ عمر، ابنِ مسعود، قتادہ بن النُّعمان، انَس بن مالک اور ابومسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ مفسّرین نے حضورؐ کے اِس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں: ایک، توحید۔ دوسرے، رسالت۔ تیسرے، آخرت۔ یہ سورت چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم اور بعض دوسری کُتبِ حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو ایک مُہم پر سردار بنا کر بھیجا، اور اس پورے سفر کے دَوران میں اُن کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں وہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پر قراءت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر اُن کے ساتھیوں نے حضورؐ سے اِس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اُن سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس میں رحمٰن کی صفت بیان کی گئی ہے، اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضورؐ نے یہ بات سُنی تو لوگوں سے فرمایا: اخبروہ ان اللّٰہ تعالٰی یحبّہٗ۔ ”اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ انھیں محبوب رکھتا ہے۔“

اِسی سے ملتا جُلتا واقعہ بخاری میں حضرت انَسؓ سے مَروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب مسجدِ قُبا میں نماز پڑھاتے تھے اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ہر رکعت میں پہلے قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھتے، پھر کوئی اَور سورت تلاوت کرتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور ان سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھنے کے بعد اسے کافی نہ سمجھ کر کوئی اور سورت بھی اُس کے ساتھ ملا لیتے ہو؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

یا تو صرف اِسی کو پڑھو، اور یا اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھو۔ انھوں نے کہا: میں اِسے نہیں چھوڑ سکتا، تم چاہو تو میں تمھیں نماز پڑھاؤں ورنہ امامت چھوڑ دوں۔ لیکن لوگ اُن کی جگہ کسی اور کو امام بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخرِ کار معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تمھارے ساتھی جو کچھ چاہتے ہیں اُسے قبول کرنے میں تم کو کیا امر مانع ہے؟ تمھیں ہر رکعت میں یہ سورت پڑھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انھوں نے عرض کیا: مجھے اِس سے بہت محبّت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ ''اِس سورت سے تمھاری محبّت نے تمھیں جنّت میں داخل کر دیا۔''

آیاتہا ۴ سُوْرَةُ الْإِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ ع

کہو[1]، وہ اللہ[2] ہے، یکتا[3]۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں[4]۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد[5]۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے[6]۔ ع

۱ – اِس حکم کے اوّلین مُخاطَب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپؐ ہی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا رب کون اور کیسا ہے، اور آپ ہی کو حکم دیا گیا کہ اِس سوال کے جواب میں آپ یہ کہیں۔ لیکن حضورؐ کے بعد ہر مومن اِس کا مُخاطب ہے۔ اُسے بھی وہی بات کہنی چاہیے جس کے کہنے کا حکم حضورؐ کو دیا گیا تھا۔

۲ – یعنی میرے جس رب سے تم تعارُف حاصل کرنا چاہتے ہو، وہ کوئی اور نہیں بلکہ اللہ ہے۔ یہ اُن سوال کرنے والوں کی بات کا پہلا جواب ہے، اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی نیا رب لے کر نہیں آ گیا ہوں جس کی عبادت، دوسرے سب معبُودوں کو چھوڑ کر، میں تم سے کروانا چاہتا ہوں، بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ ”اللہ“ عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا۔ قدیم ترین زمانے سے وہ خالقِ کائنات کے لیے یہی لفظ استعمال کر رہے تھے اور اپنے دوسرے معبُودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اِطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبُودوں کے لیے اُن کے ہاں اِلٰہ کا لفظ رائج تھا۔ پھر اللہ کے بارے میں اُن کے جو عقائد تھے، اُن کا اظہار اُس موقع پر خوب کُھل کر ہو گیا تھا جب اَبْرَہَہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ اِلٰہوں کے بت موجود تھے، مگر مشرکین نے اُن سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ اِس بلا سے اُن کو بچائے۔ گویا وہ اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ اِس نازک وقت میں اُن کی مدد نہیں کر سکتا۔ کعبے کو بھی وہ اُن اِلٰہوں کی نسبت سے بیتُ الآلِہَہ نہیں، بلکہ اللہ کی نسبت سے بیتُ اللہ کہتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مشرکینِ عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر:

سورۂ زُخْرُف میں ہے: ”اگر تم اِن سے پوچھو کہ اِنھیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔“ (آیت ۸۷)

سورۂ عنکبُوت میں ہے: ”اگر تم اِن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے...... اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اُس کے

ذریعے سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔“ (آیات ۶۱ تا ۶۳)

سورۂ مومنون میں ہے: ”اِن سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اِس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ کی..... اِن سے پوچھو: ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ..... اِن سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اُس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔“ (آیات ۸۴ تا ۸۹)

سورۂ یونس میں ہے: ”اِن سے پوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں (جو تمھیں حاصل ہیں) کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اِس نظمِ عالَم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔“ (آیت ۳۱)

اِسی سورۂ یونس میں ایک اور جگہ ہے: ”جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گِھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔“ (آیت ۲۲-۲۳)

یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں یوں دُہرائی گئی ہے: ”جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گُم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو۔“ (آیت ۶۷)

اِن آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ تمھارا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی و عبادت کی طرف تم ہمیں بُلاتے ہو، تو انھیں جواب دیا گیا: هُوَ اللّٰهُ، وہ اللہ ہے۔ اِس جواب سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبّر و منتظم مانتے ہو، اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبُودوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں تمھیں بلاتا ہوں۔ اِس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ آپ سے آپ آ جاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات سرے سے قابلِ تصوّر ہی نہیں ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اُس کا انتظام اور اُس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اُس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا، اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا، زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادرِ مُطلَق نہ ہو، علیم اور حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو، اور سب پر غالب نہ ہو۔

۳- نَحوی قواعد کی رُو سے علما نے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی متعدّد ترکیبیں بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک اُن میں سے جو ترکیب اِس مقام کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ هُوَ مبتدا ہے، اللّٰهُ اس کی خبر ہے، اور اَحَدٌ اس کی دوسری خبر۔ اِس ترکیب کے لحاظ سے اِس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ”وہ (جس کے بارے میں تم لوگ سوال کر

رہے ہو) اللہ ہے، یکتا ہے۔" دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے، اور زبان کے لحاظ سے غلط نہیں ہے کہ" وہ اللہ ایک ہے۔"

یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اِس جملے میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظِ اَحَد جس طرح استعمال کیا گیا ہے، وہ عَرَبی زبان میں اِس لفظ کا غیر معمولی استعمال ہے۔ معمولاً یہ لفظ یا تو مُضاف یا مُضاف اِلَیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے یَوْمُ الْاَحَدْ، ہفتے کا پہلا دن، اور فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ، "اپنے کسی آدمی کو بھیجو۔" یا نَفیِ عام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے مَا جَآءَنِیْ اَحَدٌ، "میرے پاس کوئی نہیں آیا۔" یا عُمُومیّت کا پہلو لیے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے، جیسے هَلْ عِندَكَ اَحَدٌ؟ "کیا تمھارے پاس کوئی ہے؟" یا اِسی عُمُومیّت کے پہلو سے شرطیہ جملے میں بولا جاتا ہے، جیسے اِنْ جَآءَكَ اَحَدٌ، "اگر تمھارے پاس کوئی آئے۔" یا گنتی میں بولا جاتا ہے، جیسے اَحَدٌ، اِثْنَانِ، اَحَدَ عَشر، ایک، دو، گیارہ۔ ان استعمالات کے سوا نُزُولِ قرآن سے پہلے کی عربی زبان میں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظِ اَحَد وصف کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لیے بولا گیا ہو، اور نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اِس صفت سے مُتّصِف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے، کوئی اُس کا ثانی نہیں۔

پھر جو سوالات مشرکین اور اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے رب کے بارے میں کیے تھے، اُن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دیکھیے کہ هُوَ اللّٰهُ کہنے کے بعد اَحَدٌ کہہ کر اُن کا جواب کس طرح دیا گیا ہے:

اوّلاً، اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا رُبوبیّت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور چونکہ اِلٰہ (معبود) وہی ہو سکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو، اِس لیے اُلُوہیّت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں۔

ثانیاً، اِس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اِس کام میں کوئی اور اُس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظامِ عالَم کا مدبّر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے، اور آڑے وقت میں مدد کرنے والا فریاد رس ہے۔ خدائی کے اِن کاموں میں، جن کو تم خود مانتے ہو کہ یہ اللہ کے کام ہیں، کسی دوسرے کا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے۔

ثالثاً، چونکہ اُنھوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ اُس کا نسب کیا ہے؟ وہ کس جنس سے ہے؟ کس سے اُس نے دنیا کی میراث پائی ہے؟ اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟ اس لیے اُن کے اِن سارے سوالات کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ایک لفظِ اَحَد بول کر دے دیا گیا ہے۔ اِس کے معنیٰ یہ ہیں کہ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اُس سے پہلے کوئی خدا تھا، نہ اس کے بعد کوئی خدا ہوگا۔ (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو، بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اُس کا ہم جنس نہیں۔ (۳) اُس کی ذات محض واحد نہیں بلکہ اَحَد ہے، جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزا سے مُرکّب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضا ہوں، جس کی کوئی سَمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیّر و تبدّل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور مُنزّہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے اَحَد

ہے۔(اِس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عربی زبان میں ''واحد'' کا لفظ بالکل اُسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح ہم اردو میں ''ایک'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کثرتوں پر مشتمل کسی مجموعے کو بھی اس کی مجموعی حیثیّت کے لحاظ سے واحد یا ایک کہا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی، ایک قوم، ایک ملک، ایک دُنیا، حتیّٰ کہ ایک کائنات۔اور کسی مجموعے کے ہر جُز کو الگ الگ بھی ایک ہی کہا جاتا ہے۔لیکن اَحَد کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔اِسی لیے قرآنِ مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اِلٰہٌ واحد، ایک ہی معبود، یا اَللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ، اکیلا اللہ جو سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا ہے، کہا گیا ہے، محض واحد کہیں نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ لفظ اُن چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی ذات میں طرح طرح کی کثرتیں رکھتی ہیں۔ بخلاف اِس کے، اللہ کے لیے اور صرف اللہ ہی کے لیے اَحَد کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وجود میں صرف وہی ایک ہستی ایسی ہے، جس میں کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے، جس کی وَحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے)۔

۴- اصل میں لفظ صَمَد استعمال کیا گیا ہے جس کا مادّہ ص، م، د ہے۔عَرَبی زبان میں اس مادے سے جو الفاظ نکلے ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے مَعانی کی وسعت کس قدر ہے:

— اَلصَّمْدُ: قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی ضخامت رکھتا ہو، سطحِ مُرتَفَع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رُجوع کیا جاتا ہو۔

— الصَّمَدُ: ہر چیز کا بلند حصّہ، وہ شخص جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اُس کے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجت مند لوگ رُجوع کرتے ہوں، دائم، بلند مرتبہ، ٹھوس، جس میں کوئی خول یا جھول نہ ہو اور جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو، نہ اس میں داخل ہوسکتی ہو، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔

— اَلْمُصْمَدُ: ٹھوس چیز، جس کا کوئی جَوف نہ ہو۔

— اَلْمُصَمَّدُ: مقصود جس کی طرف جانے کا قصد کیا جائے، سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

— بَیْتٌ مُّصَمَّدٌ: وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

— بِنَآءٌ مُّصَمَّدٌ: بلند عمارت۔

— صَمَدَهٗ وَصَمَدَ اِلَیْهِ صَمْدًا: اُس شخص کی طرف جانے کا قصد کیا۔

— اَصْمَدَ اِلَیْهِ الْاَمْرَ: اُس کے سُپرد معاملہ کر دیا، اُس کے آگے معاملہ پیش کر دیا، اُس کے اوپر معاملے میں اعتماد کیا۔(صحاح، قاموس، لسان العرب)

اِن لُغوی معنوں کی بنا پر آیت اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں لفظ الصَّمَدُ کی جو تفسیریں صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کے اہلِ علم سے منقول ہیں، اُنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

— حضرت علیؓ، عِکرِمہ اور کَعْبِ اَحْبار: ''صَمَد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔''

— حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابووائل شَقِیق بن سَلَمَہ: ''وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔''

— ابنِ عباسؓ کا دوسرا قول: ''صَمَد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے نازل ہونے پر مدد کے لیے رجوع کریں۔'' اُن کا ایک اور قول: ''وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حِلم اور بُردباری میں، اپنے علم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو''۔

— حضرت ابوہریرہؓ: ''وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اُس کے محتاج ہوں۔''

— عِکرِمہ کے دوسرے اقوال: ''وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو''۔ ''جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو''۔ اِسی کے ہم معنیٰ اقوال شَعْبِی اور محمد بن کَعْب القُرَظی سے بھی منقول ہیں۔

— سُدِّی: ''مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ جس کا قصد کریں اور مصائب میں مدد کے لیے جس کی طرف رُجوع کریں۔''

— سعید بن جُبَیر: ''وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو۔''

— ربیع بن اَنَس: ''وہ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو۔''

— مُقاتِل بن حَیّان: ''وہ جو بے عیب ہو۔''

— ابنِ کَیسان: ''وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا متّصف نہ ہو۔''

— حسن بصری اور قَتادہ: ''جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔'' اِسی سے ملتے جُلتے اقوال مجاہد اور مَعْمَر اور مُرّۃ الہمدانی سے بھی منقول ہیں۔

— مُرّۃ الہمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ ''وہ جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور جو کام چاہے کرے، اس کے حکم اور فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔''

— ابراہیم نَخَعی: ''وہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجتوں کے لیے رجوع کریں۔''

— ابوبکر الاَنباری: ''اہلِ لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صَمَد اُس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی اور سردار نہ ہو، اور جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رُجوع کریں۔'' اِسی کے قریب الزَّجّاج کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''صَمَد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہوگئی ہو اور ہر ایک اپنی حاجات کے لیے جس کی طرف رُجوع کرے۔''

اب غور کیجیے کہ پہلے فقرے میں اَللّٰہُ اَحَدٌ کیوں کہا گیا، اور اس فقرے میں اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہنے کی کیا وجہ ہے۔ لفظ اَحَدٌ کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، کسی اور کے لیے سرے سے مستعمل ہی نہیں ہے، اس لیے اُسے اَحَدٌ، یعنی نکرہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن صَمَد کا لفظ چونکہ مخلوقات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے اَللّٰہُ صَمَدٌ کہنے کے بجائے اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہا گیا، جس کے

معنٰی یہ ہیں کہ اصلی اور حقیقی صَمَد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صَمَد نہیں ہے، کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں ہے، قابلِ تجزیہ وتقسیم ہے، مرکّب ہے، کسی وقت اُس کے اجزا بکھر سکتے ہیں، بعض مخلوقات اُس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے، اُس کی سیادت اضافی ہے نہ کہ مُطلَق، کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے، بعض مخلوقات کی بعض حاجات کو وہ پورا کرسکتا ہے مگر سب کی تمام حاجات کو پورا کرنا کسی مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ بخلاف اِس کے اللہ تعالیٰ کی صَمَدیّت ہر حیثیت سے کامل ہے۔ ساری دنیا اُس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی حاجات وضروریات کے لیے شُعوری طور پر یا غیر شُعوری طور پر اُسی کی طرف رُجوع کرتی ہے اور سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا وہی ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔ رزق دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔ مُفرد ہے، مرکّب نہیں ہے کہ قابلِ تجزیہ وتقسیم ہو۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔ اس لیے وہ محض صَمَد نہیں بلکہ الصَّمَد ہے، یعنی ایک ہی ایسی ہستی جو حقیقت میں صَمَدیّت سے بتمام وکمال مُتّصِف ہے۔

پھر چونکہ وہ الصَّمَد ہے، اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ یکتا اور یگانہ ہو، کیونکہ ایسی ہستی ایک ہی ہوسکتی ہے جو کسی کی حاجت مند نہ ہو اور سب جس کے محتاج ہوں۔ دو یا زائد ہستیاں سب سے بے نیاز اور سب کی حاجت روا نہیں ہوسکتیں۔ نیز اُس کے الصَّمَد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہی ایک معبود ہو، کیونکہ انسان عبادت اسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو۔ اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہ ہو، کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو، اُس کی بندگی وعبادت کوئی ہوش مند آدمی نہیں کرسکتا۔

۵ — مشرکین نے ہر زمانے میں خُدائی کا یہ تصور اختیار کیا ہے کہ انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس کے بہت سے افراد ہیں، اور اُن میں شادی بیاہ اور توالُد وتناسُل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اِس جاہلانہ تصوُّر سے انھوں نے اللہ رب العالمین کو بھی پاک اور بالاتر نہیں سمجھا اور اُس کے لیے بھی اولاد تجویز کی۔ چنانچہ اہلِ عرب کا یہ عقیدہ قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انبیا علیہم السلام کی اُمتیں بھی اس جہالت سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اُن کے ہاں بھی کسی بزرگ انسان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینے کا عقیدہ پیدا ہوگیا۔ اِن مختلف توہُّمات میں دو قسم کے تصورات ہمیشہ خَلط مَلط ہوتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے ہیں وہ اُس ذاتِ پاک کی نَسبی اولاد ہے۔ اور بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ جس کو وہ اللہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں، اُسے اللہ نے اپنا مُتَبنّٰی بنایا ہے۔ اگرچہ اُن میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ معاذ اللہ! کسی کو اللہ کا باپ قرار دیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ہستی کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ وہ توالُد وتناسُل سے پاک نہیں ہے، اور اُس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی انسان کی طرح اُس قسم کی کوئی ہستی ہے جس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے، اور جس کو لاولد ہونے کی صورت میں کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پھر انسانی ذہن اِس گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ اُسے بھی کسی کی اولاد سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گئے تھے، اُن میں ایک سوال یہ تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ

کس سے اس نے دنیا کی میراث پائی ہے اور کون اُس کے بعد وارث ہوگا؟

اِن جاہلانہ مفروضات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منطقی طور پر اِن کو فرض کر لینے سے کچھ اور چیزوں کو بھی فرض کرنا لازم آتا ہے:

اوّل، یہ کہ خدا ایک نہ ہو، بلکہ خداؤں کی کوئی جنس ہو، اور اس کے افراد خدائی کے اوصاف، افعال اور اختیارات میں شریک ہوں۔ یہ بات خدا کی صرف نَسبی اولاد فرض کر لینے ہی سے لازم نہیں آتی، بلکہ کسی کو مُتبنّٰی فرض کرنے سے بھی لازم آتی ہے، کیونکہ کسی کا مُتبنّٰی لامحالہ اُس کا ہم جنس ہی ہو سکتا ہے، اور جب، معاذ اللہ! وہ خدا کا ہم جنس ہے تو اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدائی کے اوصاف بھی رکھتا ہے۔

دوم، یہ کہ اولاد کا کوئی تصور اِس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ نر و مادہ میں اِتّصال ہو اور کوئی مادّہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ! وہ ایک مادّی اور جسمانی وجود ہو، اُس کی ہم جنس کوئی اس کی بیوی بھی ہو، اور اُس کے جسم سے کوئی مادّہ بھی خارج ہو۔

سوم، یہ کہ توالُد و تناسُل کا سلسلہ جہاں بھی ہے، اُس کی علت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور اُن کی جنس کے باقی رہنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اُن سے اولاد پیدا ہو جس سے اُن کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذاتِ خود، معاذ اللہ! فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذات خدا۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح، نعوذ باللہ! خدا کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ کیونکہ توالُد و تناسُل پر جن اجناس کے بقا کا انحصار ہوتا ہے، اُن کے افراد نہ اَزَلی ہوتے ہیں نہ اَبَدی۔

چہارم، یہ کہ کسی کو مُتبنّٰی بنانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک لاوَلد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا، اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فرض کرنا کہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، اُس ذاتِ پاک کی طرف لازماً وہی سب کمزوریاں منسوب کرنا ہے جو فانی اشخاص میں پائی جاتی ہیں۔

اِن تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اَحَدٌ اور الصَّمَدُ کہنے سے ہی کٹ جاتی ہے، لیکن اُس کے بعد یہ ارشاد فرمانے سے کہ ”نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد“، اِس معاملے میں کسی اشتباہ کی گنجایش بھی باقی نہیں رہتی۔ پھر چونکہ ذاتِ باری کے حق میں یہ تصورات شرک کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سورۂ اخلاص ہی میں اُن کی صاف صاف اور قطعی و حتمی تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جگہ جگہ اس مضمون کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، تاکہ لوگ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل مُلاحظہ ہوں:

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ (النساء ۴:۱۷۱)	اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اِس سے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُس کی مِلک ہے۔
اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ	خوب سُن رکھو! یہ لوگ دراصل اپنی من گھڑت سے

وَاِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ○ (صافات: ۱۵۱-۱۵۲)

یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ فی الواقع یہ قطعی جھوٹے ہیں۔

وَجَعَلُوْا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجِنَّۃِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّۃُ اِنَّھُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔ (صافات: ۱۵۸)

اِنھوں نے اللہ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ فرشتے خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کیے جانے والے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (الزُّخرُف: ۱۵)

لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جُز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کُھلا احسان فراموش ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَھُمْ وَخَرَقُوْا لَہٗ بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ؑ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ ۚ (الانعام: ۱۰۰-۱۰۱)

اور لوگوں نے جنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے۔ اور اُنھوں نے بے جانے بُوجھے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اُس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ کوئی اُس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ۔ (الانبیاء: ۲۶)

اور اِن لوگوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے وہ۔ بلکہ (جن کو یہ اس کی اولاد کہتے ہیں) وہ تو بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِھٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (یونس: ۶۸)

لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اُس کی مِلک ہے۔ تمھارے پاس اِس قول کی آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جنھیں تم نہیں جانتے؟

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

اور (اے نبیؐ!) کہو: تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا، نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پُشتیبان ہو۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا کَانَ مَعَہٗ

اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، اور کوئی دوسرا

مِنْ اِلٰہٍ۔ (المومنون:۹۱) خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

اِن آیات میں ہر پہلو سے اُن لوگوں کے عقیدے کی تردید کر دی گئی ہے جو اللہ کے لیے نَسبی اولاد یا مُتبنّٰی بنائی ہوئی اولاد تجویز کرتے ہیں، اور اُس کے غلط ہونے کے دلائل بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ اور اِسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات جو قرآنِ مجید میں ہیں، سورۂ اخلاص کی بہترین تفسیر کرتی ہیں۔

۶ – اصل میں لفظ کُفُوًا استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: نظیر، مُشابہ، مُماثل، ہم رتبہ، مُساوی۔ نکاح کے معاملے میں کُفو کا لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت سے برابر کی جوڑ ہوں۔ پس اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند، یا اُس کا ہم مرتبہ ہو، یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اُس سے کسی درجے میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔

تفہیم القرآن

مُعَوَّذَتَین

الفَلَق ——— (۱۱۳)

النّاس ——— (۱۱۴)

مُعَوِّذَتَیْن

الفلق ـــــ النّاس

نام اگرچہ قرآنِ مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مُصحف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن اِن کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے، اور اِن کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی قریبی مناسبت رکھتے ہیں کہ ان کا ایک مشترک نام ''مُعَوِّذَتَیْن'' (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بَیْہَقی نے دلائلِ نبوت میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہی ہوئی ہیں، اِسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام مُعَوِّذَتَین ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں، کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مَباحِث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانۂ نزول حضرت حسن بصری، عِکْرِمَہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر اُن سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں، اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ اور قَتادَہ کا بھی ہے۔ اِس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں، ان میں سے ایک مسلم، تِرْمِذِی، نَسائی اور مُسندِ امام احمد بن حَنْبَل میں حضرت عُقْبَہؓ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا: الم تر اٰیاتٍ اُنزلت اللیلۃ، لم یُرَ مثلھن، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ ''تمھیں کچھ پتا ہے کہ آج رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئی ہیں؟ یہ بے مثل آیات ہیں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔'' یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عُقْبَہ بن عامرؓ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد اور نَسائی نے خود اُن کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اِس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں، وہ ابن سَعد، مُحْیُ السُّنّہ بَغَوِی، امام نَسَفی، امام بَیْہَقی، حافظ ابن حَجَر، حافظ بدر الدین عَیْنی، عبد بن حُمَید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینے میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضورؐ بیمار ہو گئے تھے، اُس وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقِدی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔ اِسی بنا پر سُفیان بن عُیَیْنَہ نے بھی اِن سورتوں کو مدنی کہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سورت یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی، تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اُسی موقع پر نازل

ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورتِ حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی کی طرف دوبارہ، بلکہ کبھی کبھی بار بار حضوؐر کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ مُعَوِّذَتَین کا بھی ہے۔ اِن کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضوؐر کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینۂ طیبہ میں منافقین، یہود اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو حضوؐر کو پھر اِنھی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی، جیسا کہ حضرت عُقبہؓ بن عامر کی مندرجۂ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اِس کے بعد جب آپؐ پر جادو کیا گیا اور آپؐ کی علالتِ مزاج نے شدّت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپؐ کو ہدایت کی۔ اس لیے ہمارے نزدیک اُن مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملے کے ساتھ اِن کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اُس کے ساتھ صرف سورۂ فَلَق کی صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے، سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۃ النّاس کا اس معاملے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون

مکۂ معظّمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں، وہ یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھِڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جوں جوں آپؐ کی دعوت پھیلتی گئی، کفارِ قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک اُنھیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے، یا بہلا پھُسلا کر آپؐ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اُس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدّت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضوؐر نے اُن کو اِس طرف سے بالکل مایوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملے میں کوئی مُصالحَت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے، اور سورۂ کافرون میں صاف صاف اُن سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو اُن کی بندگی کرنے والا مَیں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی مَیں کرتا ہوں اُس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لیے میرا راستہ الگ ہے اور تمھارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عُروج پر پہنچ گئی۔ خُصوصیّت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مَردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں) نے اسلام قبول کر لیا تھا، ان کے دلوں میں تو حضوؐر کے خلاف ہر وقت بھٹّیاں سُلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپؐ کو کوسا جا رہا تھا۔ خفیہ مشورے کیے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھُپ کر آپؐ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتا نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپؐ کے خلاف جادو ٹونے کیے جا رہے تھے، تاکہ آپؐ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطینِ جن وانس ہر طرف پھیل گئے تھے، تاکہ عوام کے دلوں میں آپؐ کے خلاف اور آپؐ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں، جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپؐ سے دُور بھاگنے

لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا، دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر، ابوجہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا، اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ "ہمارا اور بنی عبدِ مناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ اُنھوں نے کھانے کِھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ اُنھوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ اُنھوں نے عَطِیّے دیے تو ہم نے بھی دیے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم جب عزّت وشَرَف میں برابر کی ٹکر ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اِس میدان میں ہم کیسے اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم! ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔" (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۳۳۷-۳۳۸)

اِن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طُلوعِ صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں اور جادوگرنیوں کے شر سے، اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبُود کی، ہر اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطینِ جِنّ میں سے ہو، یا شیاطینِ اِنس میں سے۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰؑ نے اُس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں اُن کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ، "میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے، ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔" (المؤمن: ۲۷) وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ، "اور میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے، اِس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔" (الدُّخان: ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے اِن جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں، بڑے سروسامان اور وسائل وذرائع اور قوت وشوکت رکھنے والوں سے تھا۔ دونوں مواقع پر وہ طاقت ور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے درآنحالیکہ اُن کے پاس کوئی مادّی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بَل پر وہ اُن کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انھوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور مُعاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ تمھارے مقابلے میں ہم نے ربِّ کائنات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُولُوا العزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اُس رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اُس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اُس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا، تم جو چاہو کر لو، مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں تمھارے اور اپنے اور ساری کائنات کے رب کی پناہ

لے چکا ہوں۔

مُعَوِّذتین کی قُرآنیت

اِن دونوں سورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لیے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو اوپر کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اِن کے متعلق تین ایسے مَباحِث آ گئے ہیں جو دلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُن کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے اوّلین قابلِ توجُّہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا اِن دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجایش ہے؟ یہ سوال اِس لیے پیدا ہوا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدِّد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ اِن دونوں سورتوں کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مُصْحَف سے اُنھوں نے ان کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بَزّار، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ، ابویَعلیٰؒ، عبداللہ بن احمد بن حَنْبل، حُمَیدی، ابونُعَیم، ابنِ حِبّان وغیرہ محدّثین نے مختلف سندوں سے، اور اکثر و بیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابنِ مسعودؓ سے نقل کی ہے۔ اِن روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ اِن سورتوں کو مُصْحَف سے ساقط کر دیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے: ’’قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جُز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپؐ اِن الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں۔‘‘ بعض روایات میں اِس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ اِن سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

اِن روایات کی بنا پر مخالفینِ اسلام کو قرآن کے بارے میں یہ شبہات اُبھارنے کا موقع مل گیا کہ معاذ اللہ! یہ کتاب تحریف سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اِس میں جب یہ دو سورتیں ابنِ مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق اِلحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف و اضافے اِس کے اندر ہوئے ہوں گے۔ اِس طعن سے پیچھا چھڑانے کے لیے قاضی ابوبکر الباقِلّانی اور قاضی عِیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابنِ مسعودؓ مُعَوِّذَتَین کی قرآنیت کے منکر نہ تھے بلکہ صرف ان کو مُصْحَف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک مُصْحَف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہیے تھی جس کے ثَبت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو، اور ابنِ مسعودؓ تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ تاویل دُرست نہیں ہے، کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے اِن کے قرآنی سورتیں ہونے کا انکار کیا ہے۔ کچھ دوسرے بزرگوں، مثلاً امام نَوَوِی، امام ابنِ حَزم اور امام فخر الدین رازی نے سرے سے اِس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابنِ مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابنِ مسعودؓ کی اِن روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے، اس کا صحیح ردّ کیا ہے؟ اِس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حافظ بزّار نے اپنی مُسنَد میں ابنِ مسعودؓ کی یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اِس رائے میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اُن کے اِس قول کی تائید نہیں کی ہے۔

(۲) تمام صحابہؓ کے اتفاق سے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کے جو نسخے مُرتّب کروائے تھے اور خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے جن کو دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا تھا، اُن میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا جس مُصحَف پر اجماع ہے، اُس میں یہ دونوں سورتیں درج ہیں۔ تنہا عبداللہؓ بن مسعود کی رائے، اُن کی جلالتِ قدر کے باوجود، اِس عظیم اِجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے اِن سورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور قرآن کی سورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو اِن کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث مُلاحظہ ہوں:

مسلم، احمد، ترمذِی اور نَسائی کے حوالے سے حضرت عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے سورۂ فَلَق اور سورۂ ناس کے متعلق اُن سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نَسائی کی ایک رِوایت عُقبہؓ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ابنِ حِبّان نے اِنھی حضرت عُقبہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: ”اگر ممکن ہو تو تمھاری نمازوں سے اِن دونوں سورتوں کی قراءت چھوٹنے نہ پائے۔“ سعید بن منصور نے حضرت مُعاذؓ بن جَبَل سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی مُسنَد میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرو۔ مُسندِ احمد، ابوداؤد اور نَسائی میں عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا: ”کیا میں دو ایسی سورتیں تمھیں نہ سکھاؤں جو اُن بہترین سورتوں میں سے ہیں جنھیں لوگ پڑھتے ہیں؟“ انھوں نے عرض کیا: ضرور یا رسولؐ اللہ۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہی مُعَوِّذَتَین پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے یہی دو سورتیں اس میں بھی پڑھیں، اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپؐ اُن کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”اے عُقَب! کیسا پایا تم نے؟“ اور اس کے بعد اُن کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو اِن سورتوں کو پڑھا کرو۔ مُسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذِی اور نَسائی میں عُقبہؓ بن عامر کی ایک روایت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہر نماز کے بعد مُعَوِّذات (یعنی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور مُعَوِّذَتَین) پڑھنے کی تلقین کی۔ نَسائی، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور حاکم نے عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر چلے جا رہے تھے اور میں آپؐ کے قدمِ مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا: مجھے سورۂ

ہود یا سورۂ یوسف سکھا دیجیے۔ فرمایا: ’’اللہ کے نزدیک بندے کے لیے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے۔‘‘ عبداللہ بن عابِس الجُہَنی کی روایت نَسائی، بَیْہَقی، بَغَوی اور ابنِ سعد نے نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ’’ابنِ عابِس! کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے جتنی چیزوں کے ذریعے سے اللہ کی پناہ مانگی ہے، ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں؟‘‘ میں نے عرض کیا: ضرور یا رسولؐ اللہ۔ فرمایا: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، یہ دونوں سورتیں۔‘‘ ابنِ مَرْدُوْیَہ نے حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو یہ غلط فہمی آخر کیسے لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآنِ مجید کی سورتیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں دو رِوایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ ایک یہ روایت کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپؐ اِس طرح تَعَوُّذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاریؒ نے صحیح البخاری میں، امام احمد نے اپنی مُسْنَد میں، حافظ ابوبکر الحُمَیْدی نے اپنی مُسنَد میں، ابونُعَیم نے اپنی اَلْمُسْتَخْرَج میں اور نَسائی نے اپنی سُنَن میں زِرّ بن حُبَیْش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت اُبَیؓ بن کَعب سے، جو علمِ قرآن کے لحاظ سے صحابۂ کرامؓ میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، نقل کی ہے۔ زِرّ بن حُبَیْش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت اُبَیؓ سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہؓ بن مسعود ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ’’میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا: قُلْ، تو میں نے بھی کہا قُلْ۔ اس لیے ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ کہتے تھے۔‘‘ امام احمد کی رِوایت میں حضرت اُبَیؓ کے الفاظ یہ ہیں: ’’میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہا تھا، اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انھوں نے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا۔ لہٰذا ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا۔‘‘ ان دونوں روایتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو دونوں سورتوں میں لفظ قُلْ (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے حضورؐ سے اِس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت اُبَیؓ بن کَعب کے ذہن میں بھی اِس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انھوں نے حضورؐ سے اِس کو پوچھ لیا۔ حضورؐ نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قُلْ کہا تھا، اس لیے میں بھی قُلْ کہتا ہوں۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ ’’کہو، میں پناہ مانگتا

ہوں''، تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ ''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں''، بلکہ وہ ''کہو'' کا لفظ ساقط کر کے ''میں پناہ مانگتا ہوں'' کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بالا دست حاکم کا پیغام بر اِن الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ ''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں'' اور یہ پیغام اُسے اپنے تک رکھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دیا جائے، تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جُوں کا تُوں پہنچائے گا، اُس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ پس ان دونوں سورتوں کی ابتدا لفظِ قُلْ سے ہونا اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے، جسے حضورؐ انھی الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپؐ کو ملا تھا۔ اِس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہو۔ قرآنِ مجید میں ان دو سورتوں کے علاوہ ۳۳۰ آیتیں ایسی ہیں جو لفظِ قُلْ (کہو) سے شروع ہوئی ہیں۔ ان سب میں قُلْ کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے، جسے اُنھی الفاظ میں پہنچانا حضورؐ کے ذمے فرض تھا جن الفاظ میں یہ آپؐ پر نازل کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر جگہ قُلْ اگر ایک حکم ہوتا تو حضورؐ اِس لفظ کو ساقط کر کے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا آپؐ کو حکم دیا گیا تھا، اور اُسے قرآن میں درج نہ کیا جاتا بلکہ حضورؐ صرف اِس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپؐ کو حکم دیا گیا تھا۔

اِس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو بے خطا سمجھنا اور اُن کی کسی بات کے لیے غلط کا لفظ سنتے ہی توہینِ صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بے جا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چُوک ہوگئی۔ ایسی چوک اگر اتنے عظیم مرتبے کے صحابی سے ہوسکتی ہے تو دوسروں سے بھی کوئی چُوک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لیے اُس کی چھان بین بھی کر سکتے ہیں، اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انھیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہوگا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر اُن پر زبانِ طعن دراز کرے۔ انھی مُعَوِّذَتَین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابنِ مسعودؓ کی رائے کو غلط کہا ہے، مگر کسی نے یہ کہنے کی جراُت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کر کے، معاذ اللہ! وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضورؐ پر جادو کا اثر ہونا

دوسرا مسئلہ جو اِن سورتوں کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ روایات کی رُو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، اور اس کے اثر سے آپؐ بیمار ہو گئے تھے، اور اس اثر کو دُور کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے آکر آپؐ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اِس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مُشتبَہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہوسکتا تھا، اور اِن روایات کی رُو سے ہوگیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروا لیا ہو، اور اُس کی دی ہوئی تعلیم میں

کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیرِ اثر۔ یہی نہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جادو ہی کے ذریعے سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اُس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ اُن کا اِستدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآنِ مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں تو کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور، یعنی سحر زدہ آدمی ہے (یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ بنی اسرائیل: ۴۷)، مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اِس مسئلے کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مستند تاریخی روایات کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے، اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کیے گئے ہیں؟

قُرونِ اُولیٰ کے مسلمان علما کی یہ انتہائی راست بازی تھی کہ انھوں نے اپنے خیالات اور مزعومات کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جُوں کا تُوں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اِس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ اِن حقائق سے اگر کوئی اُلٹے نتائج نکالنے پر اتر آئے تو اُن کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اُس کے کام آسکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مُستند اور کثیر تاریخی ذرائع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحبِ علم کے لیے نہ تو یہ دُرست ہے کہ وہ اِس بنا پر تاریخ کا انکار کر دے کہ اُس کو مان لینے سے اُس کے نزدیک فلاں فلاں قباحتیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ یہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے، اس کو قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اُس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے اُس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اُس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے، اور علمی تنقید سے اُس کو اگر غلط ثابت کیا جاسکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسے حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن اَرقم اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بخاری، مسلم، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام احمد، عبدالرزاق، حُمَیدی، بَیْہَقی، طَبَرانی، ابنِ سعد، ابنِ مَردُوْیَہ، ابنِ ابی شَیْبَہ، حاکم، عبد بن حُمَید وغیرہ محدثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اُس کا نفسِ مضمون تَواتُر کی حد کو پہنچا ہوا ہے، اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خبرِ واحد ہے۔ اِس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انھیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مُرتّب کر کے ایک مربوط واقعے کی صورت

میں یہاں درج کرتے ہیں۔

صلحِ حُدَیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو مُحرّم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لَبِید بن اَعْصَم سے ملا جو انصار کے قبیلۂ بنی زُرَیق سے تعلق رکھتا تھا۔[1] ان لوگوں نے اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمھیں معلوم ہے۔ ہم نے اُن پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمھارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، اِنھیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کردو۔ اُس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اُس سے ساز باز کر کے اِن لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کرلیا جس میں آپؐ کے مُوئے مبارک تھے۔ انھی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لَبِید بن اَعْصَم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، اُن سے اُس نے جادو کروایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف[2] میں رکھ کر لَبِید نے بنی زُرَیق کے کنویں ذَرْوان یا ذی اَرْوان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیّرِ مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت، اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا، وہ بس یہ تھا کہ آپؐ گُھلتے چلے جارہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی اَزواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے، اور بعض اوقات آپؐ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپؐ کی ذات تک محدود رہے، حتّٰی کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہوسکا کہ آپؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت، تو اُس میں آپؐ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اُس زمانے میں آپؐ قرآن کی کوئی آیت بھُول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپؐ نے غلط پڑھ ڈالی ہو،

---

1. بعض راویوں نے اُسے یہودی کہا ہے، اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زُرَیق میں سے تھا، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ بنی زُرَیق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خزرج میں سے انصار کا ایک قبیلہ تھا۔ اس لیے یا تو وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اہلِ مدینہ میں سے یہودی ہوگئے تھے، یا یہود کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کرلیا۔ تاہم اس کے لیے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

2. ابتدا میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر ہوتا ہے اور نر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے ملتا جُلتا ہوتا ہے اور اس کی بو انسان کے مادّۂ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپؐ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو، یا کوئی ایسا کلام آپؐ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپؐ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپؐ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپؐ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات، معاذ اللہ! پیش آ جاتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملکِ عرب اِس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چِت نہ کر سکی تھی، اسے ایک جادوگر کے جادو نے چِت کر دیا۔ لیکن آپؐ کی حیثیتِ نبوت اِس سے بالکل غیر متأثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اِسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخرِ کار ایک روز آپؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپؐ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آ گئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتا دی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا: اِنھیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا: اِن پر جادو ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لَبِید بن اَعْصَم نے۔ پوچھا: کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا: کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا: وہ کہاں ہے؟ جواب دیا: بنی زُرَیق کے کنویں ذی اَرْوان (یا ذَرْوان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا: اب اس کے لیے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اُس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمّار بن یاسرؓ اور حضرت زُبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جُبَیرؓ بن اِیاس الزُّرَقی اور قیسؓ بن مِحْصَن الزُّرَقی (یعنی بنی زُرَیق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کر لیا گیا۔ اُس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پُتلا تھا جس میں سُوئیاں چُبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر بتایا کہ آپؐ مُعَوِّذَتَین پڑھیں۔ چنانچہ آپؐ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سُوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں، ساری سُوئیاں نکل گئیں، اور آپؐ جادُو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے لَبِید کو بلا کر باز پُرس کی۔ اُس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپؐ نے اس کو چھوڑ دیا، کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپؐ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ نے اِس معاملے کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

یہ ہے سارا قصّہ اِس جادو کا۔ اِس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپؐ کے منصبِ نبوّت میں قادِح ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپؐ کو زخمی کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ جنگِ اُحد میں ہوا، اگر آپؐ گھوڑے سے گر کر چوٹ

کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپؐ کو بچھو کاٹ سکتا تھا، جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس تحفظ کے مُنافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے وعدہ کیا تھا، تو آپؐ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہوسکتا ہے، یہ بات تو قرآنِ مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انھوں نے ہزار ہا آدمیوں کے اُس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا (سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ۔ آیت ۱۱۶)، اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انھوں نے پھینکی تھیں، ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰؑ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اُن کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں اور اس سے حضرت موسیٰؑ خوف زدہ ہوگئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، ذرا اپنا عصا پھینکو (فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ○ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ ۔ آیات ۶۶ تا ۶۹)۔ رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفارِ مکہ کے اُس الزام کی تصدیق ہوگئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحرزدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپؐ کو سحرزدہ آدمی اِس معنیٰ میں نہیں کہتے تھے کہ آپؐ کسی جادوگر کے اثر سے بیمار ہوگئے ہیں، بلکہ اِس معنیٰ میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے، معاذ اللہ! آپؐ کو پاگل کر دیا ہے اور اِسی پاگل پن میں آپؐ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملے پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمدؐ پر ہوا تھا، نبوتِ محمدؐ اس سے بالکل غیر متأثر رہی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ جادو کو محض اَوہام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں، اُن کی یہ رائے صرف اِس وجہ سے ہے کہ جادو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجرِبے اور مشاہدے میں آتی ہیں، مگر سائنٹفک طریقے سے یہ بیان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کیسے رُونما ہوتی ہیں۔ اِس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اُسی طرح متأثّر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متأثّر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے، مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اُس سے متأثّر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہوگئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں، وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی

تھیں، لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انھیں سانپ ہی محسوس کیا، اور حضرت موسیٰؑ تک کے حواس جادو کی اِس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِسی طرح قرآن (البقرہ، آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اِس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل دُرست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا مؤثر ہونا بھی اللہ کے اِذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزارہا سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو، اس کے وجود کو جھٹلا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

تیسرا مسئلہ اِن سورتوں کے معالمے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجایش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت، اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں مُعَوِّذَتَین، یا بعض روایات کے مطابق مُعَوِّذات (یعنی قُلْ هُوَ اللّٰہُ اور مُعَوِّذَتَین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپؐ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انھیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپؐ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں (بطورِ خود یا حضورؐ کے حکم سے) پڑھیں اور آپؐ کے دستِ مبارک کی برکت کے خیال سے آپؐ ہی کے ہاتھ لے کر آپؐ کے جسم پر پھیرے۔ اِس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابوداؤد اور مُوَطّا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں، جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضورؐ کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اِس معاملے میں پہلے مسئلۂ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری اُمّت کے وہ لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں، بلکہ اپنے رب پر توکُّل کرتے ہیں۔ (مسلم) حضرت مُغیرہؓ بن شُعْبَہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی، وہ اللہ پر توکُّل سے بے تعلق ہو گیا۔ (ترمذی) حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے، سوائے مُعَوِّذَتَین یا مُعَوِّذات کے۔ (ابوداؤد، احمد، نَسائی، ابنِ حِبّان، حاکم) بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا، لیکن بعد میں اِس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز

نہیں ہے، اور بھروسا جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلۂ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طَبَرانی نے صغیر میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپؐ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے جاتے تھے۔

ابنِ عباسؓ کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے: اُعِيْذُ كُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ۔ ”میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظرِ بد سے۔“ (بخاری، مُسنَدِ احمد، ترمذی اور ابنِ ماجہ)

عثمانؓ بن ابی العاص الثَّقَفی کے متعلق مسلم، مُؤَطّا، طَبَرانی اور حاکم میں تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں، مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَاُحَاذِرُ، ”میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں، اُس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے۔“ مُؤَطّا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اِسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مُسنَدِ احمد اور طَحاوِی میں طَلْق بن علیؓ کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضورؐ نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابو سعیدؓ خُدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریلؑ نے آ کر پوچھا ”اے محمدؐ! کیا آپ بیمار ہو گئے؟“ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ، ”میں اللہ کے نام پر آپؐ کو جھاڑتا ہوں ہر اُس چیز سے جو آپؐ کو اذیت دے، اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپؐ کو شفا دے، میں اُس کے نام پر آپؐ کو جھاڑتا ہوں۔“ اسی سے ملتی جلتی روایت مُسنَدِ احمد میں حضرت

عُبادہؓ بن صامت سے منقول ہے کہ حضوؐر بیمار تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو آپؐ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپؐ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی میں تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریلؑ آئے تھے اور انھوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپؐ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اُوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے بھی مسلم اور مُسندِ احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مُسنَد میں حضرت حَفصہؓ اُمّ المؤمنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شِفا[1] نامی بیٹھی تھیں جو نَملہ (ذُباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضوؐر نے فرمایا: حَفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شِفاؓ بنتِ عبداللہ کی یہ روایت امام احمد، ابوداؤد اور نَسائی نے نقل کی ہے کہ حضوؐر نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حَفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے، نَملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عَوفؓ بن مالک اَشجعیؓ کی روایت ہے کہ جاہلیّت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملے میں حضوؐر کی رائے کیا ہے۔ حضوؐر نے فرمایا: جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مُضایقہ نہیں ہے جب تک اُس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مُسند احمد اور ابنِ ماجہ میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عَمرؓو بن حَزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کاٹے کو جھاڑتے تھے۔ مگر آپؐ نے اِس کام سے منع فرما دیا ہے۔ پھر انھوں نے وہ چیز آپؐ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اِس میں تو کوئی مضایقہ مَیں نہیں پاتا، تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے۔'' جابرؓ بن عبداللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حَزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضوؐر نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ اس کی تائید مسلم، مُسندِ احمد اور ابنِ ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضوؐر نے انصار کے ایک خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مُسندِ احمد اور ترمِذی اور مسلم اور ابنِ ماجہ میں حضرت اَنسؓ سے بھی اس سے ملتی جُلتی روایات نقل کی گئی ہیں، جن میں حضوؐر نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذُباب کے مرض اور نظرِ بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

---

[1] ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شِفا بنتِ عبداللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عَدِی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اِس طرح یہ حضرت حَفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

مُسندِ احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ اور حاکم نے حضرت عُمَیرؓ مولیٰ ابی اللَّحم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیّت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا: فُلاں فُلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مُؤطّا میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ اُن کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر تورات یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطِّب کو دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اِذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبّی مُعالجَہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اَسمائے حُسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے، یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبّی امداد میسّر نہ ہو، اللہ ہی کی طرف رُجوع کر کے اس کے کلام اور اسما و صفات سے اِستعانت کی جائے، تو یہ مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔[1] البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسّر ہو، جان بُوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مَطَب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنالیں۔

اس معاملے میں بہت سے لوگ حضرت ابوسعید خُدریؓ کی اُس روایت سے اِستدلال کرتے ہیں

---

1 مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رُجوع الی اللہ مریضوں کی شفایابی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اِس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مثانے میں آکر اَڑ گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو ہی میرا علاج فرمادے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور ۲۰ برس تک ہٹی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کئی مہینے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دعا کی جو ۱۹۴۸ء میں کی تھی، اور کسی علاج اور دوا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہوگئیں۔ آج تک پھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

جو بخاری، مسلم، ترمذی، مُسندِ احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں منقول ہوئی ہیں اور اس کی تائید بخاری میں ابنِ عباسؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا، جن میں حضرت ابوسعید خُدریؓ بھی تھے۔ یہ حضرات راستے میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھیرے اور انھوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ اِن مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمھارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابوسعیدؓ نے کہا: ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے، اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انھوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعیدؓ نے جا کر اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لُعابِ دہن اس پر ملتے گئے۔[1] آخرِکار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا: اِن بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا: ''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورت جھاڑنے کے کام بھی آ سکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصّہ بھی لگاؤ۔''

لیکن اِس حدیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مَطَب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابوسعید خُدریؓ نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصّہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز و عدمِ جواز کے معاملے میں اِن اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے، اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورونوش خرید سکے۔ اِن حالات میں یہ بات عرب کے معروف اُصولِ اَخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اِس سے انکار کے معنیٰ، بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اِس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے اِس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تھا تو ان کے سردار کا علاج کرنے

[1] اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابوسعیدؓ تھے۔ بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

سے انھوں نے بھی انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے پر سورۂ فاتحہ اُس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہو گیا تو طے شدہ اُجرت قبیلے والوں نے لا کر دے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُجرت کے لینے کو حلال وطیّب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو روایت ہے، اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ احقَّ ما اخذتم علیه اجرًا کتاب اللہِ، یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمھارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اُجرت لی۔ یہ آپؐ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اِس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حقِ تبلیغ بھی ادا ہو گیا کہ انھیں اس کلام کی برکت معلوم ہو گئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس واقعے کو اُن لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جا سکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مَطَب چلاتے ہیں اور اسی کو انھوں نے وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمۂ سَلَف کے ہاں نہیں ملتی۔

سورۂ فاتحہ اور اِن سورتوں کی مناسبت

آخری چیز جو مُعَوِّذَتَین کے بارے میں قابلِ توجُّہ ہے، وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآنِ مجید ترتیبِ نزول پر مُرَتَّب نہیں کیا گیا ہے، مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خود نہیں، بلکہ اُن کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مُرَتَّب فرمایا جس میں ہم اب اس کو پاتے ہیں۔ اِس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام مُعَوِّذَتَین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آغاز میں اللہ رب العالمین، رحمٰن و رحیم، اور مالکِ یوم الدین کی حمد و ثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی مَیں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے، اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے، جو ربُّ الفَلَق، ربُّ النّاس، مَلِکُ النّاس اور اِلٰہُ النّاس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خُصوصیّت کے ساتھ شیاطینِ جِنّ و انس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہِ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

ایاتہا ۵ رکوعاتہا ۱

سُورَۃُ الْفَلَقِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ ع

کہو،[1] میں پناہ مانگتا ہوں[2] صبح کے ربّ[3] کی، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے،[4] اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے،[5] اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے[6]، اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔[7] ع

۱- چونکہ قُلْ (کہو) کا لفظ اُس پیغام کا ایک حصّہ ہے جو تبلیغِ رسالت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے، اس لیے اگرچہ اِس ارشاد کے اوّلین مخاطَب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر آپ کے بعد ہر مومن بھی اِس کا مُخاطَب ہے۔

۲- پناہ مانگنے کے فعل میں لازماً تین اجزا شامل ہوتے ہیں۔ ایک، بجائے خود پناہ مانگنا۔ دوسرے، پناہ مانگنے والا۔ تیسرا، وہ جس کی پناہ مانگی جائے۔ پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کر کے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے کسی دوسرے کی حفاظت میں جانا، یا اس کی آڑ لینا، یا اُس سے لپٹ جانا، یا اُس کے سایے میں چلا جانا ہے۔ پناہ مانگنے والا بہر حال وہی شخص ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے، اس کا مقابلہ وہ خود نہیں کر سکے گا، بلکہ وہ اِس کا حاجت مند ہے کہ اُس سے بچنے کے لیے دوسرے کی پناہ لے۔ پھر جس کی پناہ مانگی جاتی ہے، وہ لازماً کوئی ایسا ہی شخص یا وجود ہوتا ہے جس کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس خوفناک چیز سے وہی اس کو بچا سکتا ہے۔ اب پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانینِ طبعی کے مطابق عالَمِ اسباب کے اندر کسی محسوس مادّی چیز یا شخص یا طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن کے حملے سے بچنے کے لیے کسی قلعے میں پناہ لینا، یا گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے خندق یا کسی دَمدَمے یا کسی دیوار کی آڑ لینا، یا کسی طاقت ور ظالم سے بچنے کے لیے کسی انسان یا قوم یا حکومت کے پاس پناہ لینا، یا دھوپ سے بچنے کے لیے کسی درخت یا عمارت کے سایے میں پناہ لینا۔ بخلاف اس کے دوسری قسم وہ ہے جس میں ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادّی، اخلاقی یا روحانی مضرّتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی

کی پناہ اس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالمِ اسباب پر حکمراں ہے اور بالاتر از حس و ادراک طریقے سے وہ اُس شخص کی ضرور حفاظت کر سکتی ہے جو اُس کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پناہ کی یہ دوسری قسم ہی نہ صرف سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں مراد ہے، بلکہ قرآن اور حدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد یہی خاص قسم کی پناہ ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا لازمہ یہ ہے کہ اِس نوعیت کا تعوُّذ یا اِستعاذہ (پناہ مانگنا) اللہ کے سوا کسی اور سے نہ کیا جائے۔ مشرکین اِس نوعیت کا تحفّظ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں، مثلاً جِنّوں یا دیویوں اور دیوتاؤں سے مانگتے تھے اور آج بھی مانگتے ہیں۔ مادّہ پرست لوگ اِس کے لیے بھی مادّی ذرائع و وسائل ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں، کیونکہ وہ کسی فوق الفطری طاقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مومن ایسی تمام آفات و بلیّات کے مقابلے میں، جن کو دفع کرنے پر وہ خود اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتا، صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اسی کی پناہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین کے متعلّق قرآن میں بیان کیا گیا ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ، جِنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔'' (الجن: ٦) اور اِس کی تشریح کرتے ہوئے ہم سورۂ جنّ حاشیہ ۷ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب کو جب رات کسی سُنسان وادی میں گزارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے: ''ہم اِس وادی کے رب کی (یعنی اُس جنّ کی جو اِس وادی پر حکمران ہے یا اِس وادی کا مالک ہے) پناہ مانگتے ہیں۔'' بخلاف اس کے، فرعون کے متعلّق فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ عظیم نشانیوں کو دیکھ کر فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ ''وہ اپنے بَل بُوتے پر اکڑ گیا۔'' (الذاریات: ۳۹) لیکن خدا پرستوں کا رَوِیّہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ مادّی ہو یا اخلاقی یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لیے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلّق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں اُن کے سامنے آیا (جب کہ وہ نہ جانتی تھیں کہ یہ فرشتہ ہے) تو انھوں نے کہا: اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ''اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔'' (مریم: ۱۸) حضرت نوحؑ نے جب اللہ تعالیٰ سے ایک بے جا دعا کی اور جواب میں اللہ کی طرف سے اُن پر ڈانٹ پڑی تو انھوں نے فوراً عرض کیا: رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ''میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اِس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔'' (ہود: ۴۷) حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، تو انھوں نے جواب میں فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ''میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اِس بات سے کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں''۔ (البقرہ: ٦٧)

یہی شان اُن تمام تعوُّذات کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کُتُبِ حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی حسبِ ذیل دعاؤں کو مُلاحظہ کیجیے:

عن عائشة ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم کان یقول فی دعآئه اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ	حضرت عائشہؓ سے رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ۔ (مسلم)

اُن کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور اُن کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کیے۔" (یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کے بُرے نتیجے سے پناہ مانگتا ہوں، اور اگر کوئی کام جو کرنا چاہیے تھا، میں نے نہیں کیا تو اُس کے نقصان سے بھی پناہ مانگتا ہوں، یا اِس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیے وہ میں کبھی کر گزروں)۔

عن ابن عمر كان من دعآءِ رسُول الله صلّى الله عليه وسلم اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَ تَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفَجْاَۃِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ۔ (مسلم)

ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے، اور تجھ سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے، اور تیرا غضب یکایک ٹوٹ پڑے، اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے۔"

عن زيد بن ارقم كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا يُسْتَجَابُ۔ (مسلم)

زیدؓ بن ارقم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نافع نہ ہو، اس دل سے جو تیرا خوف نہ کرے، اُس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو، اور اُس دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔"

عن ابى هريرة كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے، کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گزارے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے، کیونکہ وہ بڑی بدباطنی ہے۔"

عن انس ان النبى صلّى الله عليه وسلم كان يقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَ الْجُنُوْنِ وَ الْجُذَامِ وَ سَيِّءِ الْاَسْقَامِ۔ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ اور جنون اور جذام اور تمام بُری بیماریوں سے۔"

عن عائشة ان النبى صلّى الله عليه وسلم كان يدعو بهؤلاء الكلمات اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَمِنْ

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِن کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداری اور مفلسی کے

شَرِّ الْغِنٰی وَالْفَقْرِ۔(ترمذی وابوداؤد)

شر سے۔"

عن قُطبة بن مالك كان النبی صلی الله علیه وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ مُّنۡكَرَاتِ الۡاَخۡلَاقِ وَالۡاَعۡمَالِ وَالۡاَهۡوَاءِ (ترمذی)

قُطبہؓ بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "خدایا! میں بُرے اخلاق اور بُرے اعمال اور بُری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

شَکَلؓ بن حُمَید نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: مجھے کوئی دعا بتایئے۔ فرمایا، کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ شَرِّ سَمۡعِیۡ، وَمِنۡ شَرِّ بَصَرِیۡ، وَمِنۡ شَرِّ لِسَانِیۡ، وَمِنۡ شَرِّ قَلۡبِیۡ، وَمِنۡ شَرِّ مَنِیِّیۡ۔ (ترمذی وابوداؤد)

خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے شر سے، اور اپنی بصارت کے شر سے، اور اپنی زبان کے شر سے، اور اپنے دل کے شر سے، اور اپنی شہوت کے شر سے۔

عن انس بن مالك كان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الۡعَجۡزِ وَالۡكَسَلِ وَالۡجُبۡنِ وَالۡهَرَمِ وَالۡبُخۡلِ وَاَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ عَذَابِ الۡقَبۡرِ وَمِنۡ فِتۡنَةِ الۡمَحۡیَا وَالۡمَمَاتِ (وفی روایة لمسلم) وَضَلَعِ الدَّیۡنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔ (بخاری ومسلم)

اَنَسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے: "خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سُستی اور بزدلی اور بُڑھاپے اور بُخل سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی وموت کے فتنے سے (اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے) اور قرض کے بوجھ سے، اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر غالب ہوں۔"

عن خَوۡلَة بنت حُکَیۡم السُّلَمِیَّة سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول مَنۡ نَزَلَ مَنۡزِلًا ثُمَّ قَالَ اَعُوۡذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمۡ یَضُرَّهٗ شَیۡءٌ حَتّٰی یَرۡتَحِلَ مِنۡ ذٰلِكَ الۡمَنۡزِلِ۔ (مسلم)

خَوۡلَہؓ بنت حَکِیم سُلَمِیَّہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اترے اور یہ الفاظ کہے کہ "میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے، تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی، یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کر جائے۔"

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تَعَوُّذات بطورِ نمونہ ہم نے احادیث سے نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے نہ کہ کسی اور کی پناہ، اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے۔

۳- اصل میں لفظ رَبُّ الۡفَلَقِ استعمال ہوا ہے۔ فَلَق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی عظیم اکثریت نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو پھاڑ کر سپیدۂ صبح نکالنا لیا ہے، کیونکہ عربی زبان میں فَلَقُ الصبح کا لفظ طُلوعِ صبح کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ کے الفاظ استعمال

ہوئے ہیں، یعنی ''وہ جورات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالتا ہے۔'' (الانعام:۹۶) فلق کے دوسرے معنیٰ خَلق بھی لیے گئے ہیں، کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ تمام نباتات بیج اور زمین کو پھاڑ کر اپنی کونپل نکالتے ہیں۔ تمام حیوانات یا تو رحمِ مادر سے برآمد ہوتے ہیں، یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں، یا کسی اور مانعِ ظُہور چیز کو چیر کر باہر آتے ہیں۔ تمام چشمے پہاڑ یا زمین کو شق کر کے نکلتے ہیں۔ دن، رات کا پردہ چاک کر کے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بادلوں کو چیر کر زمین کا رخ کرتے ہیں۔ غرض، موجودات میں سے ہر چیز کسی نہ کسی طرح کے اِنْشِقاق کے نتیجے میں عَدَم سے وجود میں آتی ہے، حتّٰی کہ زمین اور سارے آسمان بھی پہلے ایک ڈھیر تھے جس کو پھاڑ کر انھیں جدا جدا کیا گیا، كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء:۳۰) پس اِس معنیٰ کے لحاظ سے فلق کا لفظ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ اب اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوعِ صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں، اور دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو مطلب ہوگا: میں تمام خَلق کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ اِس جگہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات چھوڑ کر اُس کا اسم صفت ''رب'' اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ پناہ مانگنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ''رب''، یعنی مالک و پروردگار اور آقا و مُربّی ہونے کی صفت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ پھر رَبُّ الْفَلَقِ سے مراد اگر طلوعِ صبح کا رَبّ ہو تو اس کی پناہ لینے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو رب تاریکی کو چھانٹ کر صبحِ روشن نکالتا ہے مَیں اُس کی پناہ لیتا ہوں، تاکہ وہ آفات کے ہُجوم کو چھانٹ کر میرے لیے عافیت پیدا کر دے، اور اگر اس سے مراد رَبِّ خَلق ہو تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں ساری خَلق کے مالک کی پناہ لیتا ہوں، تاکہ وہ اپنی مخلوق کے شر سے مجھے بچائے۔

۴ – بالفاظِ دیگر، تمام مخلوقات کے شر سے میں اُس کی پناہ مانگتا ہوں۔ اِس فقرے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل، یہ کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی، بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اُن شُرور سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ نے پیدا کیے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اُن چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ اُس کا ہر کام خیر اور کسی مَصْلَحَت ہی کے لیے ہوتا ہے، البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اُس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ اُن کی تخلیق کی مَصْلَحَت پوری ہو، اُن سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

دوم، یہ کہ اگر صرف اِسی ایک فقرے پر اکتفا کیا جاتا اور بعد کے فقروں میں خاص خاص قسم کی مخلوقات کے شرور سے الگ الگ خدا کی پناہ مانگنے کا نہ بھی ذکر کیا جاتا تو یہ فقرہ مُدّعا پورا کرنے کے لیے کافی تھا، کیونکہ اس میں ساری ہی مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگ لی گئی ہے۔ اِس عام اِستعاذے کے بعد چند مخصوص شُرور سے پناہ مانگنے کا ذکر خود بخود یہ معنیٰ دیتا ہے کہ ویسے تو مَیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر مخلوق کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن خاص طور پر وہ چند شرور جن کا ذکر سورۂ فَلَق کی باقی آیات اور سورۂ ناس میں کیا گیا ہے، ایسے ہیں جن سے خدا کی اَمان پانے کا مَیں بہت محتاج ہوں۔

سوم، یہ کہ مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین اور مؤثّر ترین اِستعاذہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو

وہ یہ ہے کہ اُن کے خالق کی پناہ مانگی جائے، کیونکہ وہ بہر حال اپنی مخلوق پر غالب ہے، اور اُن کے ایسے شُرور کو بھی جانتا ہے جنھیں ہم جانتے ہیں، اور ایسے شُرور سے بھی واقف ہے جنھیں ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا اُس کی پناہ گویا اُس حاکم اعلیٰ کی پناہ ہے جس کے مقابلے کی طاقت کسی مخلوق میں نہیں ہے، اور اس کی پناہ مانگ کر ہم ہر مخلوق کے ہر شر سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، خواہ وہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ نیز اس میں دنیا ہی کے نہیں، آخرت کے بھی ہر شر سے اِستِعاذہ شامل ہے۔

چہارم، یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف اور اَلَم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اُن اسباب کے لیے بھی جو نقصان و ضرر اور تکلیف و اَلَم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا، اور ایسے ہی دوسرے شُرور پہلے معنیٰ میں شر ہیں، کیونکہ یہ بجائے خود تکلیف اور اذیت ہیں۔ بخلاف اس کے، مثال کے طور پر کفر، شرک، اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم دوسرے معنیٰ میں شر ہیں، کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے، اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو۔ پس شر سے پناہ مانگنا اِن دونوں مفہومات کا جامع ہے۔

پنجم، یہ کہ شر سے پناہ مانگنے میں دو مفہوم اور بھی شامل ہیں: ایک یہ کہ جو شر واقع ہو چکا ہے، بندہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ وہ اسے دفع کر دے۔ دوسرے یہ کہ جو شر واقع نہیں ہوا ہے، بندہ یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا مجھے اُس شر سے محفوظ رکھے۔

۵ - مخلوقات کے شر سے عُموماً خدا کی پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خُصوصیّت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ آیت میں غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غاسق کے لُغوی معنیٰ تاریک کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہُوا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ، ’’نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے رات کے اندھیرے تک۔‘‘ (بنی اسرائیل: ۷۸) اور وَقَبَ کے معنیٰ داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں۔ رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لیے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ موذی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اور عرب میں طوائف المُلوکی کا جو حال ان آیات کے نُزول کے وقت تھا، اس میں تو رات بڑی خوفناک چیز تھی، اس کے اندھیرے میں چھاپا مار نکلتے تھے اور بستیوں پر غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے، وہ بھی رات ہی کے وقت آپؐ کو قتل کر دینے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے تاکہ قاتل کا پتا نہ چل سکے۔ اس لیے اُن تمام شرور و آفات سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں۔ یہاں اندھیری رات کے شر سے طلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگنے میں جو لطیف مناسبت ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اِشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدِّد صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اُس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ

اللہ کی پناہ مانگو، ھٰذا الغاسق اذا وقب، یعنی یہ الغاسق اذا وقب ہے۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر، ابن المُنذِر، حاکم، ابنِ مَردُوْیَہ) اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِذَا وَقَبَ کا مطلب یہاں اِذَا خَسَفَ ہے، یعنی جب کہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے۔ لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضورؐ نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی تھی اُس وقت وہ گرہن میں تھا۔ اور لغتِ عرب میں بھی اِذَا وَقَبَ کے معنیٰ اِذَا خَسَفَ کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اِس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے، دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا، اس لیے حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے (یعنی چاند کے) آنے کے وقت یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی حملہ کرنے والے کے لیے ہوتی ہے، اور جرم کا شکار ہونے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الشَّمْسَ اِذَا غَرَبَتْ انتشرت الشیاطین، فاکفتوا صبیانکم واحبسوا مواشیکم حتی تذھب فحمۃ العشاء، ”جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں، لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو، جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے۔“

۶- اصل الفاظ ہیں: نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ عُقَد جمع ہے عُقْدہ کی، جس کے معنیٰ گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تاگے یا رسّی میں ڈالی جاتی ہے۔ نَفْث کے معنیٰ پھونکنے کے ہیں۔ نَفّٰثات جمع ہے نَفّاثہ کی، جس کو اگر علامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھُونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھُونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نُفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں۔ گرہ میں پھونکنے کا لفظ اکثر، بلکہ تمام تر مفسّرین کے نزدیک جادو کے لیے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طُلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔ اِس مفہُوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آ کر حضورؐ کو مُعوّذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اور مُعَوّذَتَین میں یہی ایک فقرہ ہے جو براہِ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی اور زمخشری نے نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ کا ایک اور مفہُوم بھی بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکّاری، اور مردوں کے عزائم اور آرا اور خیالات پر اُن کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبّت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اُس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ پُرلطف ہے، لیکن اُس تفسیر کے خلاف ہے جو سَلَف سے مُسَلَّم چلی آتی ہے، اور اُن حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں مُعَوّذَتَین نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر بُرا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواحِ خبیثہ

یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے، اس لیے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، ''سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔'' (البقرہ: ۱۰۲) لیکن اگر اُس میں کوئی کلمۂ کفر یا کوئی فعلِ شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: سات غارت گر چیزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کیا ہیں یا رسولؐ اللہ؟ فرمایا: خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سُود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تُہمت لگانا۔

۷۔ حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو، اس پر کوئی دوسرا شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اُس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے، یا کم از کم یہ کہ اُس سے ضرور چھن جائے۔ البتہ حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اُس حالت میں مانگی گئی ہے جب کہ وہ حسد کرے، یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے کے لیے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا، اُس وقت تک اُس کا جلنا بجائے خود چاہے بُرا سہی، مگر محسود کے لیے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ پھر جب ایسا شر کسی حاسد سے ظاہر ہو تو اُس سے بچنے کے لیے اوّلین تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان پانے کے لیے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک، یہ کہ انسان اللہ پر بھروسا کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے، کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے، یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ خود بھی اَخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آ جائے۔ تیسرے، یہ کہ حاسد خواہ خدا سے بے خوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہر حال تقویٰ پر قائم رہے۔ چوتھے، یہ کہ اپنے دل کو اُس کی فکر سے بالکل فارغ کر لے اور اُس کو اِس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اُس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں، یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش آنا تو درکنار، جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی کرے، قطعِ نظر اس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اِس نیک رَویّے سے مٹتی ہے یا نہیں۔ چھٹے، یہ کہ محسود توحید کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے، کیونکہ جس دل میں توحید بسی ہوئی ہو، اُس میں خدا کے خوف کے ساتھ کسی اور کا خوف جگہ ہی نہیں پا سکتا۔

---

۶ آیاتہا

سُوْرَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ

۱ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ النَّاسِ ③ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ④ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥

ع ۲ ۳۹

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی[1] اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے[2]، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنّوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے[3]۔ ع

۱- یہاں بھی سورۂ فَلَق کی طرح اعوذ باللہ کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو اس کی تین صفات سے یاد کر کے اس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک، اُس کا ربُّ الناس، یعنی تمام انسانوں کا پروردگار و مُربّی اور مالک و آقا ہونا۔ دوسرے، اُس کا مَلِکُ الناس، یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرماں روا ہونا۔ تیسرے، اُس کا اِلٰہُ الناس، یعنی انسانوں کا حقیقی معبُود ہونا۔ (یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اِلٰہ کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، وہ شے یا شخص جس کو عبادت کا کوئی استحقاق نہ پہنچتا ہو مگر عملاً اس کی عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرا، وہ جسے عبادت کا استحقاق پہنچتا ہو اور جو حقیقت میں معبُود ہو، خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اللہ کے لیے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اِسی دوسرے معنی میں ہوا ہے) اِن تین صفات سے اِستعاذہ کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو انسانوں کا رب، بادشاہ اور معبُود ہونے کی حیثیت سے اُن پر کامل اقتدار رکھتا ہے، جو اپنے بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے، اور جو واقعی اُس شر سے انسانوں کو بچا سکتا ہے جس سے خود بچنے اور دوسرے انسانوں کو بچانے کے لیے میں اُس کی پناہ مانگ رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ وہی رب اور بادشاہ اور اِلٰہ ہے، اس لیے اُس کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں جس سے میں پناہ مانگوں اور جو حقیقت میں پناہ دے بھی سکتا ہو۔

۲- اصل میں اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وَسْواس کے معنی ہیں: بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وَسْوَسے کے معنی ہیں: پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بُری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو، اُسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اُس کے دل میں ایک بُری بات ڈال رہا ہے۔ وَسْوَسے کے لفظ

میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلے میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے، اس لیے ایسی کوشش کو وَسْوَسہ، اور کوشش کرنے والے کو وَسْواس کہا جاتا ہے۔ رہا لفظ خَنَّاس، تو یہ خُنوس سے ہے، جس کے معنٰی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں، اور خَنَّاس چونکہ مبالغے کا صیغہ ہے، اس لیے اس کے معنٰی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لیے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ جب اسے خَنَّاس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ وسوسہ ڈال ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کے لیے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے، پھر وہی کوشش کرنے کے لیے دوبارہ، سہ بارہ اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اُس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے، یعنی اِس شر سے کہ وہ کہیں اُس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے، اُس کے شر سے داعیِ حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی الی الحق کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اُس کی ذات کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں، ان سب تک خود پہنچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اُس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور اُن کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے۔ اُس کے مقام سے یہ بات بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اُترے ہوئے ہیں اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہ۔ اِس کے بعد اُن سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ ربُّ النّاس، مَلِکُ النّاس اور اِلٰہُ النّاس کا کام ہے۔

اِس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ عملِ شر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے تو پہلے اُس میں برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، پھر مزید وسوسہ اندازی اُس بُری خواہش کو بری نیت اور بُرے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب وسوسے کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ عزم بن جاتا ہے اور آخری قدم پھر عملِ شر ہے۔ اس لیے وسوسہ انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کُھلے کُھلے کفر، شرک، دہریت، یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دینُ اللہ

میں داخل ہی ہو جائے تو وہ اسے کسی نہ کسی بدعت کی راہ سُجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں تو کوئی مُضایقہ نہیں، تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بارِ عظیم انسان پر لَد جائے۔ اِس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجۂ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دینِ حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے، اُسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص اِن تمام چالوں کو ناکام کر دے تو پھر شیاطینِ جنّ و انس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پِل پڑتی ہے، اس کے خلاف لوگوں کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے، اُس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کراتی ہے، اسے ہر طرف بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اُس مردِ مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے، اٹھ اور اِن حملہ آوروں سے بِھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوتِ حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعیِ حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے بھی اگر داعیِ حق بچ نکلے تو شیطان اُس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، ''اور اگر شیطان کی طرف سے تمھیں کوئی اکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو۔'' (الاعراف: ۲۰۰۔ حٰم السجدہ: ۳۶) وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، ''کہو: میرے پروردگار! میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (المؤمنون: ۹۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ، ''جو لوگ پرہیزگار ہیں، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انھیں چُھو بھی جائے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر انھیں (صحیح راستہ) صاف نظر آنے لگتا ہے۔'' (الاعراف: ۲۰۱) اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اِس آخری حربے سے بچ نکلیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ، ''یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔'' (حٰم السجدہ: ۳۵)

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطینِ جنّ و انس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اُس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُس کی اپنی ناجائز اغراض و خواہشات اُس کی قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں، انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اُس کو بہکاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے کہ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ''اور ہم اُس کے اپنے نفس سے اُبھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں۔'' (قٓ: ۱۶) اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبۂ مسنونہ میں فرمایا ہے: نعوذ باللّٰہِ من شرور انفسنا، ''ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔''

۳۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اِن الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا دو قسم کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے: ایک جنّ، دوسرے انسان۔ اس بات کو اگر تسلیم کیا جائے تو لفظِ ناس کا اطلاق جنّ اور انسان دونوں پر ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایسا ہوسکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جب رِجَالٌ (مَردوں) کا لفظ جنّوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ جن، آیت ۶ میں ہم دیکھتے ہیں، اور جب نَفَر کا استعمال جنّوں کے گروہ پر ہوسکتا ہے، جیسا کہ سورۂ اَحقاف، آیت ۲۹ میں ہوا ہے، تو مجازاً ناس کے لفظ میں بھی انسان اور جنّ دونوں شامل ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ رائے اس لیے غلط ہے کہ ناس اور اِنس اور انسان کے الفاظ لغت ہی کے اعتبار سے لفظِ جنّ کی ضد ہیں۔ جنّ کے اصل معنٰی پوشیدہ مخلوق کے ہیں، اور جن کو جن اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھ سے مخفی ہے۔ اس کے برعکس ناس اور اِنس کے الفاظ انسان کے لیے بولے ہی اس بنا پر جاتے ہیں کہ وہ ظاہر اور مَرئی اور محسوس ہے۔ سورۂ قَصَص، آیت ۲۹ میں ہے: اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ یہاں اٰنَسَ کے معنٰی رَاَی ہیں، یعنی حضرت موسٰیؑ نے ''کوہِ طور کے کنارے آگ دیکھی۔'' سورۂ نساء آیت ۶ میں ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا، ''اگر تم محسوس کرو کہ یتیم بچے اب ہوش مند ہوگئے ہیں۔'' یہاں اٰنَسْتُمْ کے معنٰی اَحْسَسْتُمْ یا رَاَیْتُمْ ہیں۔ پس ناس کا اطلاق لغتِ عرب کی رُو سے جِنّوں پر نہیں ہوسکتا، اور آیت کے صحیح معنٰی یہ ہیں کہ ''اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جِنّوں میں سے ہو یا خود انسانوں میں سے۔'' یعنی دوسرے الفاظ میں وسوسہ اندازی کا کام شیاطینِ جن بھی کرتے ہیں اور شیاطینِ اِنس بھی، اور دونوں کے شر سے پناہ مانگنے کی اِس سورہ میں تلقین کی گئی ہے۔ اس معنٰی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے اور حدیث سے بھی۔ قرآن میں فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۝ (الانعام: ۱۱۲)	اور اِسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان جنّوں اور شیطان انسانوں کو دشمن بنا دیا ہے، جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔

اور حدیث میں امام احمد، نَسائی اور ابنِ حِبّان حضرت ابوذرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ فرمایا: ابوذرؓ! تم نے نماز پڑھی؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھی اور پھر آ کر بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا: یا ابا ذر، تَعَوَّذْ بِاللّٰهِ من شَرِّ شیاطینِ الانس والجن، ''اے ابوذر! شیاطینِ اِنس اور شیاطینِ جن کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔

خاتمہ

میں صمیمِ قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تفہیم القرآن لکھنے کا جو کٹھن کام میں نے محرم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲ء) میں شروع کیا تھا، وہ ۳۰ سال چار مہینے بعد آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ سراسر اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندے کو اپنی کتابِ پاک کی یہ خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اِس میں جو کچھ صحیح و برحق ہے وہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی بدولت ہے، اور جہاں کہیں میں نے قرآن کی ترجمانی و تفسیر میں غلطی کی ہے وہ میرے اپنے علم و فہم کا قصور ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں نے کوئی غلطی جان بُوجھ کر نہیں کی ہے، اس لیے میں اللہ کے کرم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے معاف فرما دے گا، اور میرے اِس کام کے ذریعے سے اگر اُس کے بندوں کو ہدایت پانے میں کوئی مدد ملی ہے تو اس کو میری مغفرت کا ذریعہ بنا دے گا۔ اصحابِ علم سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ میری غلطیوں پر مجھے متنبّہ فرمائیں۔ جس بات کا بھی غلط ہونا دلیل سے مجھ پر واضح کر دیا جائے گا، اِن شاء اللہ، اس کی اصلاح کروں گا۔ میں اِس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کتاب اللہ کے معاملے میں دانستہ غلطی کروں، یا کسی غلطی پر جما رہوں۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اِس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن اُس طرح سمجھاؤں جس طرح میں نے خود اسے سمجھا ہے، اُس کے اصل مفہوم و مدعا کو اِس طرح کھول کر بیان کر دوں کہ لوگ قرآن کی روح تک پہنچ سکیں، اُن تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دوں اور اُن سوالات کے جواب دے دوں جو قرآن کو، یا اس کے محض ترجموں کو پڑھ کر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور اُن چیزوں کی وضاحت کر دوں جنھیں قرآنِ مجید میں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں میرے پیشِ نظر زیادہ تفصیل سے کام لینا نہ تھا، اس لیے پہلی جلد کے حواشی مختصر رہے۔ بعد میں جُوں جُوں مَیں آگے بڑھتا گیا، مجھے حواشی میں زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی گئی، یہاں تک کہ بعد کی جلدوں کو دیکھنے والے اب پہلی جلد کو تشنہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن قرآنِ مجید میں مضامین کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس مضمون کی تشریح ایک جگہ تشنہ رہ گئی ہو وہ چونکہ بعد کی سورتوں میں بھی آیا ہے اس لیے ان کی پوری تشریح بعد کی سورتوں کے حواشی میں ہو جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ جو لوگ قرآنِ مجید کو تفہیم القرآن کی مدد سے صرف ایک دفعہ پڑھنے پر اکتفا نہ کریں گے، وہ پوری کتاب کو دوبارہ پڑھتے وقت خود محسوس کر لیں گے کہ بعد کی سورتوں کی تشریحات ابتدائی سورتوں کے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

لاہور

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

(۷ رجون ۱۹۷۲ء)

ابُوالاعلیٰ

ضمیمہ نمبر ۱

بسلسلۂ الدّہر، حاشیہ ۳۳

ان آیات میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔ دوسرے یہ کہ تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم وعلیم ہے۔ اِن تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادیِ اختیار اور اللہ کی مشیّت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہوجاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلے میں بالعُموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں، وہ صرف اِس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اُس کے سامنے آتے ہیں، اُن میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (freedom of choice) ہے جو اللہ نے اُس کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اُس کے آگے بہت سے راستے ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ حلال ہیں، جیسے جائز نوعیت کی محنت مزدوری، ملازمت، تجارت، یا صَنعت وحِرفت یا زراعت، اور کچھ حرام ہیں، مثلاً چوری، ڈاکا، رہزنی، جیب تراشی، عِصمَت فروشی، سودخواری، قِمار بازی، رشوت اور حرام نوعیت کی نوکریاں اور تجارتیں وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اِسی طرح اَخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ ایک طرف دیانت، امانت، شرافت، شائستگی، انصاف، رحم، ہمدردی اور عِصمت وعفّت جیسے خصائل ہیں، اور دوسری طرف بدمَعاشی، کمینگی، ظلم وستم، بے ایمانی، آوارگی اور بیہودگی وبدتمیزی جیسے رذائل۔ اُس کو پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کرلے۔ ایسا ہی معاملہ دین ومذہب کا ہے کہ اُس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کُھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکارِ خدا، شرک وبت پرستی، شرک وتوحید کے مختلف مخلوطے، اور ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان میں بھی یہ فیصلہ کرنا انسان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اسے حرام خور بنائے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور اللہ جبراً اسے مُلحِد یا مشرک یا کافر بنادے، یا وہ چاہتا تو ہو نیک انسان بننا اور اللہ اسے خواہ مخواہ بد بنادے۔

لیکن اِس آزادیِ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کرسکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیّت اور اس کے اِذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیّت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش

یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے تب ہی وہ اُس کو کر سکتا ہے، ورنہ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، اللہ کے اِذن اور اُس کی مشیّت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی بات دوسری آیت میں فرمائی گئی ہے۔ اِس معاملے کو یوں سمجھیے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات تفویض کر دیے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑ دی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر گزرے، تو نظامِ عالَم دَرہم بَرہم ہو جاتا۔ ایک قاتل تمام دنیا کے انسانوں کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا اگر اسے یہ چھوٹ مل جاتی کہ جسے چاہے قتل کر دے۔ ایک جیب کُترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا اگر اس کو یہ اختیار دے دیا جاتا کہ جس کی جیب کترنا چاہے کتر ڈالے۔ ایک چور کے ہاتھ سے کسی کا مال نہ بچتا، ایک زانی سے کوئی عورت نہ بچتی، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا، اگر ان میں سے ہر ایک کو مَن مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط، جس راستے پر بھی چلنا چاہے، اُس پر اُسے چلنے دے یا نہ چلنے دے۔ جو شخص گمراہی کو چھوڑ کر راہِ راست اختیار کرنا چاہے اس کو بھی عملاً راست روی اللہ ہی کی مشیّت اور اُسی کی توفیق سے نصیب ہوسکتی ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ضلالت کو چھوڑ کر ہدایت کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان نے خود کیا ہو، ورنہ جس طرح اللہ کسی کو زبردستی چور یا قاتل یا مُلحد یا مشرک نہیں بناتا، اسی طرح وہ اس کو زبردستی مومن بھی نہیں بناتا۔

اس کے بعد تیسری آیت اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیّت کہیں اَلل ٹَپ (arbitrary) تو نہیں ہے۔ اس کو رفع کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے، یعنی وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے، جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے، اس لیے اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا توفیق دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے، کسے کیا کام کرنے دینا چاہیے اور کیا نہ کرنے دینا چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو اُس کے لیے سازگار بناتا ہے، اُسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے، خواہ وہ اچھا کام ہو یا بُرا کام۔ ہدایت کا معاملہ بھی اِس سے مُستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے علم کی بنا پر یہ جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر یہ طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

ضمیمہ نمبر۲

بسلسلۂ الدّہر، حاشیہ ۳۴

اس آیت میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جن تک اللہ کا کلام اور اس کے نبی کی تعلیم پہنچے اور پھر وہ خوب سوچ سمجھ کر، جان بُوجھ کر، یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں اُس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ اِن میں وہ ظالم بھی شامل ہیں جو صاف صاف کہہ دیں کہ ہم اِس کلام کو خدا کا کلام اور اِس نبی کو خدا کا نبی نہیں مانتے، یا سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ اور وہ ظالم بھی شامل ہیں جو

خدا اور نبی اور قرآن کو ماننے سے انکار تو نہیں کرتے مگر فیصلہ اُن کا یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اُس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں ہی گروہ ظالم ہیں۔ پہلے گروہ کا معاملہ تو صاف ہی ہے، لیکن دوسرا گروہ بھی اس سے کچھ کم ظالم نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ منافق اور دغاباز بھی ہے۔ زبان سے کہتا ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں، رسول کو مانتے ہیں، قرآن کو مانتے ہیں، مگر اُن کے دل اور دماغ کا فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا اتباع انھیں نہیں کرنا ہے، اور عمل بھی وہ اُس کے خلاف ہی کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے کہ ہم نے اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیا میں چاہے وہ دندناتے پھریں، خوب دادِ عیش دیں، اپنی بڑائی کے ڈنکے خوب بجالیں، مگر آخرِکار ان کا انجام ایک دردناک عذاب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت میں داخل ہونا ان کو نصیب نہیں ہوسکتا۔

ضمیمہ نمبر ۳

بسلسلۂ المرسلات، حاشیہ ۱

اِن آیات میں ابتداءً بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی ہے کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انھیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں عُذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر، یعنی وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں یا تو خوف پیدا ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ اللہ کو یاد کرنے پر مجبُور ہوتا ہے، یا پھر آدمی اپنے قصوروں کا اعتراف کر کے دعا کرتا ہے کہ اللہ اسے تباہی سے بچالے اور اس پر رحم کر کے بارانِ رحمت سے اس کو نواز دے۔ اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اُس موقع پر آندھیوں کو چلتے اور بادلوں کو آتے دیکھ کر بعض اوقات کٹّے سے کٹّا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ فرق اگر کچھ پڑتا ہے تو صرف اِس سے کہ قحط ہلکا ہے یا سخت۔ معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دُور نہیں ہے وہ اُس کو یاد کرے گا، لیکن دوسرے لوگ سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اِتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے اور پورا ملک تباہی سے دوچار ہو جائے تو بڑے بڑے کافروں کو خدا یاد آنے لگتا ہے، زبان سے کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہو تو دل میں وہ اپنی گناہ گاریوں اور ناشُکریوں پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عُذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا اِلقا۔ رہا نُذر (ڈراوے) کے طور پر اُس کا اِلقا، تو یہ اُس وقت ہوتا ہے جب آندھی بڑھتے بڑھتے طوفانِ عظیم بن جائے اور بستیوں کی بستیاں تباہ کرتی چلی جائے، یا بارش اس قدر زوردار ہو کہ سیلابِ بلا بن جائے۔ ایسی حالت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خوف کے مارے خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اُس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹفک توجیہات اُس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار کر جاتی ہیں۔ پس ہواؤں کے چلنے کی اس ترتیب کو بیان کرنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ ہوائیں عُذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ یہ سارا نظام جو دنیا میں چل رہا ہے، انسان کو اِس حقیقت سے خبردار کرتا رہتا ہے کہ اِس زمین پر سب کچھ اُسی کے اختیار میں نہیں دے دیا گیا ہے، بلکہ اُوپر کوئی بالاتر طاقت موجود ہے جو اُس کی قسمت پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اُس کا اقتدار اتنا زبردست ہے کہ جب چاہے وہ عناصر کو انسان کی پرورش کے لیے استعمال کر سکتی ہے اور جب چاہے انھی عناصر سے اس کی تباہی کا کام لے سکتی ہے۔

اس کے بعد ہواؤں کے اسی نظام کو اِس بات کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ وہ قیامت، جس کے برپا ہونے کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، ضرور واقع ہونے والی ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ نظام اِس پر کیسے گواہی دے رہا ہے۔

انسان بالعموم قیامت اور آخرت کے معاملے میں دو سوالات پر اُلجھتا ہے: ایک، یہ کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ دوسرے، یہ کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر انھی سوالات میں الجھتے ہوئے اُسے یہ شک لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ آئے گی بھی یا نہیں، یا یہ محض ایک افسانہ ہے؟ اِس پر قرآن میں جگہ جگہ کائنات کے نظام سے اِستدلال کرتے ہوئے اُس کا امکان، اس کا وجوب اور اُس کا وقوع ثابت کیا گیا ہے، اور کہیں یہ استدلال اِس طرز پر کیا گیا ہے کہ خدا کی خدائی کے بے شمار آثار میں سے بعض کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ وہ آنے والی ہے۔ اِس طریقِ اِستدلال میں اُس کے امکان کے دلائل بھی آ جاتے ہیں، وجوب کے دلائل بھی، اور وقوع کے دلائل بھی۔

یہاں استدلال کا یہی طریقہ اختیار کرتے ہوئے صرف ہواؤں کی گردش اور بارشوں کی آمد کے نظام کو اس امر کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جو کسی حکیم اور قادرِ مُطلَق کی تدبیر سے قائم ہوا ہے، کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے جس سے زمین کی فضا میں خود بخود یہ طریقہ چل پڑا ہو کہ یوں سمندروں سے بھاپیں اٹھیں، یوں ہوائیں ان کو لے کر چلیں، یوں وہ ان کو سمیٹ کر بادل بنائیں، پھر یوں وہ ان کو ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے زمین کے مختلف حصوں پر پہنچائیں، اور یوں ان سے جگہ جگہ بارش ہو۔ یہ نظام ایک اندھی بہری فطرت نے کسی اندھیر نگری میں اتفاقاً نہیں بنا دیا ہے، بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا اور جچا تُلا منصوبہ ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اسی لیے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سمندر پر سورج کی گرمی پہنچنے سے بھاپیں اُٹھنے کے بجائے برف جم جائے، بلکہ ہمیشہ دھوپ کی حرارت سے بھاپیں ہی اٹھتی ہیں۔ کبھی موسمی ہوائیں اُلٹی چال نہیں چلتیں کہ بھاپوں کو اٹھانے کے بجائے سمندر میں دبا دیں، بلکہ وہ ہمیشہ اُن کو اوپر ہی اٹھاتی ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ بادلوں کا بننا بند ہو جائے، ہوائیں ان کو لے کر خشک علاقوں کی طرف چلنا چھوڑ بیٹھیں، اور خشکی پر بارشوں کے نزول کا سلسلہ رُک کر رہ جائے۔ کروڑوں سال سے ایک ہی قاعدہ ہے جس پر یہ نظام مسلسل چل رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس زمین پر آپ کا وجود میں آنا اور جینا ممکن نہ ہوتا۔

اس نظام میں آپ ایک کھلی ہوئی مقصدیت اور ایک باضابطہ قانون کی کارفرمائی پاتے ہیں۔ آپ کو علانیہ نظر آ رہا ہے کہ زمین پر انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی کا نہایت گہرا تعلق اِن ہواؤں اور اِن بارشوں سے ہے، اور یہ انتظام اس امر کی کھلی گواہی دے رہا ہے کہ پانی کی یہ فراہمی ذی حیات مخلوق کو وجود میں لانے اور زندہ رکھنے کے لیے ٹھیک ٹھیک اُس کی ضروریات کے مطابق اور ایک قانون کے مطابق کی گئی ہے۔ یہ مقصدیت اور باقاعدگی صرف اِسی ایک معاملے میں نہیں بلکہ کائنات کے پورے نظام میں پائی جاتی ہے اور انسان کی ساری سائنٹفک

ترقی اِس پر مبنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق آپ یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ کس غرض کے لیے ہے اور کس قاعدے پر کام کرتی ہے، پھر جن جن چیزوں کے بارے میں جتنا جتنا آپ کو یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ان کا مقصد کیا ہے اور اُن میں کام کرنے والے قوانین کیا ہیں، اُسی قدر آپ ان کے استعمال کے نئے نئے طریقے نکالتے چلے جاتے ہیں اور نئی نئی ایجادیں کر کے اپنے تمدّن کو ترقی دیتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں اگر فطری طور پر یہ تصور موجود نہ ہوتا کہ یہ دنیا ایک بامقصد دنیا ہے اور اس کے اندر ہر چیز ایک قانون پر کام کر رہی ہے تو آپ کے دماغ میں سرے سے کسی چیز کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ یہ کس غرض کے لیے ہے اور اس سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

اب اگر یہ دنیا اور اس کی ایک ایک چیز بامقصد ہے، اور اگر اس دنیا اور اِس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، اور اگر یہ اربوں سال سے پیہم اِسی مقصدیت اور باضابطگی کے ساتھ چل رہی ہے، تو صرف ایک ضدی انسان ہی یہ ماننے سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک علیم وحکیم اور قادرِ مُطلَق خدا نے اِسے بنایا ہے، اور اُس خدا کے متعلق یہ خیال کرنا سراسر ایک احمقانہ بات ہے کہ وہ اسے بنا اور چلا تو سکتا ہے مگر توڑ نہیں سکتا، اور توڑ کر پھر کسی اور شکل میں بنانا چاہے تو نہیں بنا سکتا۔ مادے کے متعلق یہ تصوُّر کہ وہ غیر فانی ہے، قدیم زمانے کے جاہل دہریوں کا بہت بڑا سہارا تھا، مگر علم کی ترقی نے اسے بھی باطل ثابت کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت علمی مُسلَّمات میں سے ہے کہ مادّہ قوت (energy) میں تبدیل ہو سکتا ہے اور قوت مادّے کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس لیے یہ بات سراسر علم اور عقل کے مطابق ہے کہ خدائے حیّ وقیّوم جب تک اِس مادّی دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے اُسی وقت تک یہ قائم ہے۔ جونہی وہ اِسے قوت میں تبدیل کرنا چاہے صرف ایک اشارے سے تبدیل کر سکتا ہے، اور اُس کا صرف ایک اشارہ ہی اس کے لیے بھی کافی ہے کہ یہ دوبارہ ایک دوسری مادّی شکل میں پیدا ہو جائے۔

یہ تو ہے قیامت کے امکان کا معاملہ، جسے اب کسی علمی وعقلی دلیل سے ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُس کو ضرور واقع ہونا چاہیے تاکہ انسان کو اس کے اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا ملے، تو جو شخص انسان کی اخلاقی ذمہ داری کا قائل ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ حُسنِ خدمت کا انعام اور مجرم کی سزا اِس اخلاقی ذمہ داری کا لازمی تقاضا ہے، اُس کے لیے یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے۔ دنیا میں معاشرے اور ریاست کا کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ہر جرم کی سزا اور ہر حسنِ عمل کا انعام دے سکتا ہو۔ یہ کہنا کہ مجرم کے لیے اس کے ضمیر کی ملامت ہی کافی سزا اور مُحسن کے لیے اس کے ضمیر کا اطمینان ہی کافی جزا ہے، ایک بے معنیٰ فلسفہ طرازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور اس کے بعد فوراً ہی وہ کسی حادثے سے دوچار ہو کر مر گیا، اس کے ضمیر کو کب اتنی مہلت ملی کہ وہ اسے ملامت کرتا؟ اور جو شخص حق اور انصاف کی خاطر لڑائی پر گیا اور وہاں اچانک ایک بم پڑنے سے اس کے پرَ خچے اُڑ گئے، اس کے ضمیر کو یہ اطمینان حاصل ہونے کا موقع کب ملا کہ اس نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی ہے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے عقیدے سے فرار کے لیے جتنے بہانے تراشے جاتے ہیں، وہ سب بے معنیٰ ہیں۔ انسان کی عقل چاہتی ہے، اس کی فطرت چاہتی ہے کہ انصاف ہو،

مگر دنیا کی موجودہ زندگی میں انصاف، اور وہ بھی ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا انصاف ممکن نہیں ہے۔ وہ اگر ہوسکتا ہے تو آخرت ہی میں ہوسکتا ہے اور خدائے علیم وخبیر ہی کے حکم سے ہوسکتا ہے۔ آخرت کی ضرورت کا انکار دراصل انصاف کی ضرورت کا انکار ہے۔

عقل اِسی حد تک انسان کو لے جاسکتی ہے کہ آخرت ممکن ہے اور اُس کو ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ یقیناً ہوگی، اِس کا "علم" صرف وحی کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے، اور وحی نے یہ بتا دیا ہے کہ "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔" اس علم تک ہم عقلی استدلال سے نہیں پہنچ سکتے، البتہ اس کے برحق ہونے کا یقین ہمیں اِس بنا پر حاصل ہوتا ہے کہ جس بات کی خبر وحی دے رہی ہے، وہ ممکن بھی ہے اور اس کو ضرور ہونا بھی چاہیے۔

ضمیمہ نمبر ۴

بسلسلۂ الطارق، حاشیہ ۳

سورۂ طارق، آیات ۶-۷ کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ ہم نے حاشیہ ۳ میں لکھا ہے، اس پر ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں لکھا کہ:

> ''آپ کی تشریح میں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلق ہے، تو یہ مادّہ فوطے (Testicles) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں میں سے گزرتا ہوا پیٹ کی دیوار میں کولھے کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی (Inguinal canal) میں سے گزر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام (Prostate) ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اِس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گزرنے کو میں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نَرْوس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود، جو کہ دماغ میں ہوتا ہے، اُس کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہاں اِخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے)۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصّل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ مَیں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے (جس کے لیے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹفک علم پر یقین رکھتے ہیں۔''

اس کے جواب میں ہم نے نومبر ۷۱ء کے رسالہ ترجمان القرآن میں لکھا کہ:

''آپ چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں اس لیے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصّوں کے افعال (functions) الگ الگ ہیں، لیکن کوئی حصہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا، بلکہ دوسرے اعضا کے تعاُل (co-ordination) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادّۂ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ فوطہ ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گُردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادّۂ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھیے، پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے سے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضا اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادّے الگ کر کے

مثانے میں بھیج سکتا ہے جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اسی لیے قرآنِ مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادّہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں میں سے نکلتا ہے، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ''اِن دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اُس سے یہ مادّہ خارج ہوتا ہے''۔ یہ اِس بات کی نفی نہیں ہے کہ مادّۂ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل (mechanism) ہے جسے جسم کے کچھ خاص حصّے انجام دیتے ہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذّات نہیں ہے۔ یہ اپنا کام اُس پورے نظامِ اعضا کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور ترَائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اِسی لیے میں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے، البتہ صُلب اور ترَائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔''

اس سوال و جواب کو پڑھنے کے بعد دو مختلف مقامات سے دو ڈاکٹروں نے ہمیں جو طبّی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

علم الجنین (Embryology) کی رُو سے یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جَنین (Foetus) کے اندر اُنثَیَین (Testes) یعنی وہ غدود جن سے مادّۂ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گُردوں کے قریب ہوتے ہیں، جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہ عمل ولادت سے پہلے، اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآىِٕبِ) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (Artery) پیٹھ کے قریب شہ رگ (Aortra) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت میں اُنثَیَین پیٹھ ہی کا جُز ہیں جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں، مادّۂ منویہ اگرچہ اُنثَیَین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسۂ منویہ (Seminal Vesicles) میں جمع ہو جاتا ہے، مگر اس کے اخراج کا مرکزِ تحریک بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآىِٕبِ ہی ہوتا ہے، اور دماغ سے اعصابی رَو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے تب اس مرکز کی تحریک (triger action) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لیے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علمِ طِبّ کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

فہرست موضوعات

الف

اخلاقی تعلیمات

آزمایش

(مزید دیکھو ''امتحان'')

ازواج مطہرات

اللہ

اللہ

اہل کتاب

آیت

ایمان

ب

تقویٰ

تکبر

جہاد

جھاڑ پھونک

جہنم

دنیا

س

سجدہ

سحر

سلسبیل

سنت

ش

شب قدر

شر

فساد

قرآنی دعائیں

قرآنی قصے

قسم

قیامت

ک

کائنات

کتاب

کراماً کاتبین:

کفر

کوثر

ن

نامہ اعمال